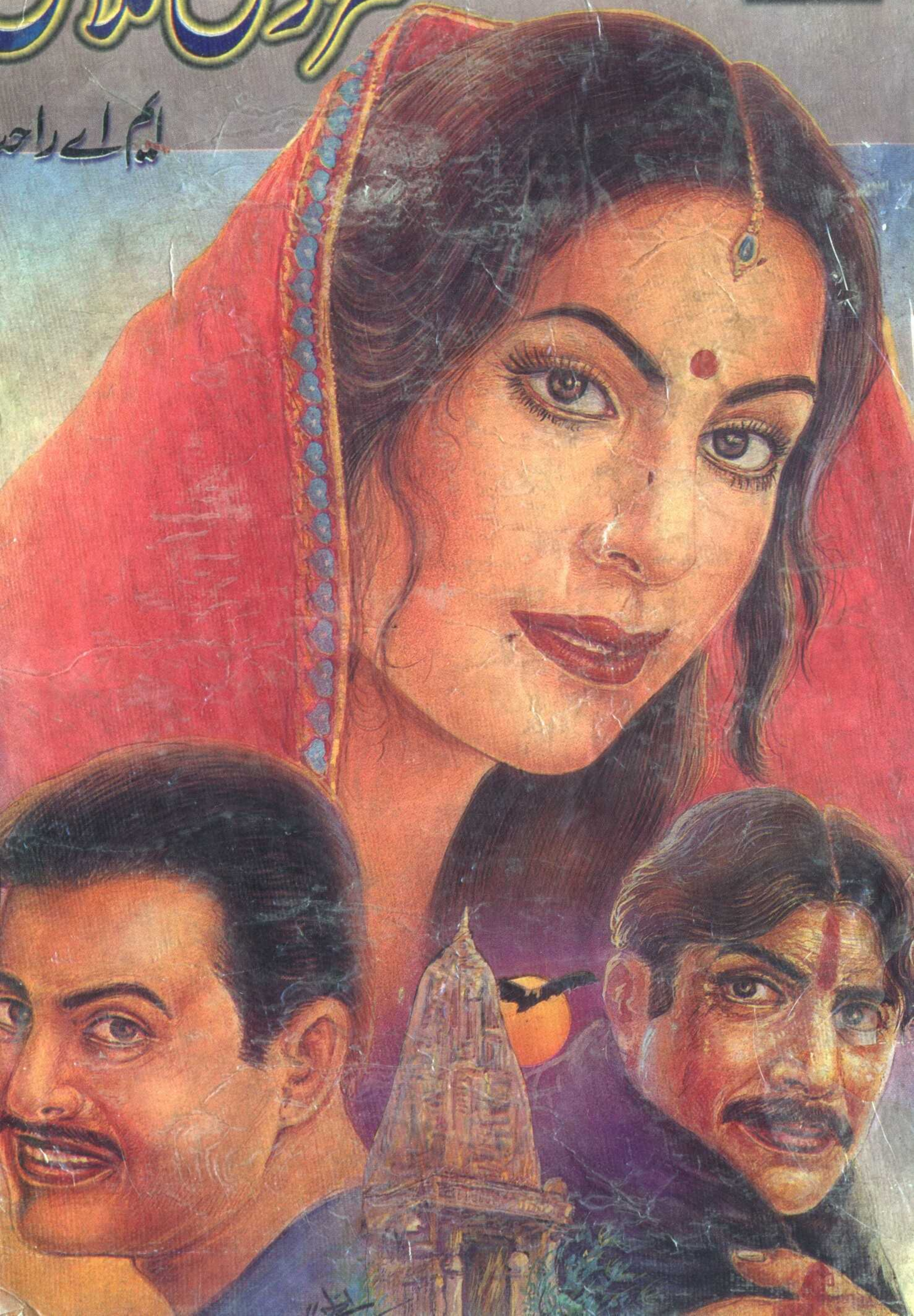


عمراد کی تلاش

ایم اے راجہ



دوسری صبح ناشتے سے فارغ ہونے کے بعد وہ پھر چلی گئی۔ آج میں کچھ کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ میں نے ایک ملازم کو اشارہ کر کے اپنے قریب بلایا اور اُس سے کہا کہ کیا پیرس جانے کے لئے کار مل سکتی ہے؟

ملازم نے مؤدب لہجے میں کہا۔ ”کار موجود ہے جناب! میں ڈرائیور ہوں۔“

”ٹھیک ہے۔ مجھے کچھ ضروری کاموں سے چلنا ہے۔ میرا ساتھ دو۔“

ڈرائیور نے فوراً ہی ایک سرخ رنگ کی کار گیراج سے باہر نکال کھڑی کی اور میں اُس میں بیٹھ کر چل پڑا۔ یہ مسئلہ تو بہت ہی آسان نکلا۔ کیا لیسی جین گروجر بھی مکمل عورت ہی ہے؟ اس سے تو یہی اندازہ ہوتا تھا۔ ممکن ہے، ڈرائیور کو میرے سلسلے میں ہدایات دی جا چکی ہوں اور یہ کمبخت مجھے اپنی آنکھوں سے اوجھل نہ ہونے دے۔ کوئی چکر ہی چلانا پڑے گا.....

براہِ راست کلیسائے نورٹریڈیم جانا مناسب نہیں تھا۔ چنانچہ میں اُسے ایفل ٹاور لے گیا۔ ایفل ٹاور پہنچ کر میں نیچے اُترا اور ایک دور دراز گوشے میں جا کر میں نے ڈرائیور کو دیکھا اور یہ اندازہ لگانے کی کوشش کرنے لگا کہ کیا وہ میری جانب متوجہ ہے؟ لیکن ڈرائیور اطمینان سے دوسری کھڑکی کی جانب رخ کئے باہر کے مناظر دیکھ رہا تھا۔ مجھے سخت حیرت ہوئی۔ کیا کچھ اور لوگ بھی میری نگرانی پر مامور ہیں؟ اگر ہیں تو دیکھا جائے گا..... چنانچہ میں نے فوراً ہی ایک سڑک عبور کی اور ایک گزرتی ہوئی ٹیکسی کو روک کر غڑاپ سے اس میں داخل ہو گیا..... ٹیکسی ڈرائیور سے میں نے آگے بڑھنے کے لئے کہا تھا۔ ٹیکسی میرے اشارے کی سمت چل پڑی۔ کوئی اندازہ نہیں ہو پا رہا تھا۔ سخت حیرت کا شکار تھا کہ میں اس آسانی سے لیسی جین گروجر کے چنگل سے نکل آیا ہوں..... پاگل عورت نے میری نگرانی کا بندوبست کیوں نہیں کیا؟ عقب میں بار بار دیکھ رہا تھا۔ گاڑیاں تو آ جا رہی تھیں لیکن کوئی

ایسی گاڑی نہیں تھی، جسے میں یہ سمجھ لوں کہ وہ صرف میری نگرانی پر مامور ہے..... پھر یہ ڈرائیور؟ میں نے سہمی ہوئی نگاہوں سے ڈرائیور کو دیکھا۔ لیکن ڈرائیور پر سکون چہرہ لئے آگے بڑھا چلا جا رہا تھا۔ کافی دُور دراز علاقے میں جا کر میں نے ایک سنسان جگہ ٹیکسی رکوائی۔ مجھے یہاں ایک کیفے نظر آ رہا تھا۔ میرے قدم اُس کی جانب بڑھ گئے۔ کیفے میں داخل ہونے کے بعد میں نے ایک گوشے میں میز منتخب کی۔ ویٹر کو کافی کا آرڈر دینے کے بعد کرسی کی پشت سے ٹک کر آنکھیں بند کر لیں اور اس سلسلے میں غور کرنے لگا۔ ذرا دیر بعد آہٹ محسوس کر کے میں نے آنکھیں کھول دیں۔۔۔ غالباً وہ کافی لے آیا تھا۔ لیکن کمبخت کا لباس..... میری نگاہیں آہستہ آہستہ اُس کے لباس کے ساتھ اوپر اٹھتی چلی گئیں۔ اور پھر بلندی پر جو چہرہ نظر آیا، اُسے دیکھ کر میں نے پھر سے آنکھیں بند کر لیں اور اپنی کھوپڑی کو ہتھیلی سے ٹھوکنے لگا..... کیا حماقت ہے؟ یہ ویٹر تو نہیں ہے..... تب ہی میرے کانوں میں ایک آواز اُبھری۔

”کیوں..... مجھے دیکھ کر آنکھیں کیوں بند کر لیں ڈیئر؟“

اس آواز پر میں نے پھر آنکھیں کھول دی تھیں۔ واقعی یہ نظر کا واہمہ نہیں تھا۔ بلکہ جو کچھ میرے سامنے تھا، وہی تھا..... ہاں..... یہ لیری کونین تھی۔ حسین لیری کونین..... ایش کی کاک ٹیل کا ایک حصہ اور..... اور لیری کنگ کی بیٹی..... دل چاہا کہ قہقہے لگانے لگوں۔ میرا منہ کھلا اور بند ہو گیا.....

لیری کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گئی تھی۔ پھر وہ سرگوشی کے انداز میں بولی۔ ”یہاں کوئی خطرہ تو نہیں ہے؟ کیا تم ایسے لوگوں میں گھرے ہوئے ہو جو تمہاری نگرانی کر رہے ہیں؟“

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بس آنکھیں پھاڑے اُسے گھورتا رہا۔ تب لیری نے کسی قدر برا ماننے والے انداز میں کہا۔ ”کیا ہو رہا ہے یہ؟ کیا تم مجھے دیکھ کر بد دل ہو گئے ہو؟ کیا واقعی..... کیا واقعی.....؟“

اب میرے لئے سنبھلنا بے حد ضروری تھا۔ کھوپڑی کا تو اب کوئی جواب ہی نہیں رہا تھا۔ ایسے ایسے جھٹکے برداشت کرنے کی عادی ہو گئی تھی۔ اگر اسے کسی پُل کی تعمیر میں استعمال کیا جاتا تو وہ پُل زندگی بھر خراب نہ ہوتا اور اُس پر سے ہیوی ٹریفک گزرتا رہتا۔ کیا لا جواب کھوپڑی تھی۔ دل چاہا کہ کھوپڑی کی شان میں دو چار قصیدے پڑھ لئے جائیں..... لیکن

بد قسمتی سے قصیدہ خوانی کبھی نہیں کر پایا تھا۔ بس! لیری کونین کو گھورتا رہا۔

”ڈیئر مون! تمہیں کیا ہو گیا ہے؟“

”اگر میں یہی سوال تم سے کروں تو؟“

”کیا مطلب؟“

”تمہیں کیا ہو گیا تھا؟“

”اوہ..... لمبی کہانی ہے۔ لیکن ہمیں یقین تھا کہ تم ہمیں پیرس ہی میں مل جاؤ گے۔ ڈیڈی پورے اعتماد سے یہ بات کہہ رہے تھے کہ مون اُن لوگوں میں سے نہیں ہے جو دھوکے باز ہوتے ہیں۔ ہم نے کبھی بھول کر بھی یہ تصور نہیں کیا تھا کہ تم ہمیں جُل دے کر نکل گئے ہو گے۔ بس! ہم اُن حالات کا انتظار کر رہے تھے، جن سے نمٹنے کے بعد تم ہم تک پہنچ جاؤ گے۔“

”جادو کا ڈنڈا دیکھا ہے تم نے؟“ میں نے سوال کیا۔

”یہ کیا چیز ہوتی ہے؟“

”بھائی الہ دین سے واقف ہو؟“

”کیا کہہ رہے ہو تم؟ میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا۔“

”اُس کے پاس ایک چراغ تھا، جسے گھسنے سے ایک جن برآمد ہوتا تھا۔ اور پھر وہ جن الہ دین کی تمام خواہشات کی تکمیل کر دیتا تھا۔ میرا خیال ہے تم الف لیلیٰ سے بہت متاثر ہو۔“

”کاش! میں تمہاری باتیں سمجھ سکتی۔“ لیری کونین نے کہا۔ اور اُسی وقت ویٹر نے کافی لا کر ہمارے سامنے رکھ دی۔ وہ سمجھ دار آدمی تھا اور کافی کی دو پیالیاں ساتھ لایا تھا۔ لیری کافی بنانے لگی۔ مجھے اُس کے اس اطمینان پر حیرت تھی۔ اتنے عرصے کے بعد اور انتہائی غیر متوقع طور پر ملی تھی۔ لیکن یوں محسوس ہوتا تھا، جیسے یہ سب کچھ اُس کے لئے معمول کے مطابق ہو۔ جیسے اب تک وہ میری تمام کارروائیوں کو اپنی نگاہوں سے دیکھتی رہی ہو۔ کافی کی پیالی اُس نے میرے سامنے رکھی تو میں نے بے خیالی میں اُسے اٹھا لیا۔ گرم گرم کافی ہونٹوں سے لگی تو ہوش و حواس درست ہو گئے اور میں جلدی سے کپ رکھ کر رُومال سے ہونٹ صاف کرنے لگا۔

لیری عجیب سی نگاہوں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ پھر اُس نے آہستہ سے کہا۔ ”ڈیڑ مون!“ واقعی..... یوں محسوس ہوتا ہے، جیسے مجھے دیکھ کر تمہارے اعصاب کشیدہ ہو گئے ہوں۔ میں کسی غلط فہمی کا شکار تو نہیں ہوں تمہارے بارے میں؟“

”ارے نہیں لیری ڈارلنگ! بس تم مجھے اپنی زندگی کا یقین دلا دو۔“ میں نے کہا اور لیری کوئین نے اپنی زندگی کا یقین دلانے کے لئے اپنا نرم و نازک ہاتھ میری اکلائی پر رکھ دیا اور میں اندھوں کی طرح اُسے ٹٹولنے لگا۔ پھر آہستہ سے بولا۔ ”ہو تو وہی۔ لیکن کہاں مر گئی تھیں؟“

”اوہ..... تم ناراض ہو؟“ لیری نے کہا۔

”جی نہیں۔ میری خوشیوں کی انتہا نہیں ہے۔ بڑے دن آپ نے مجھے آزادی بخش دی۔ میں کہتا ہوں ہوٹل سے کہاں چلے گئے تھے تم لوگ؟“

”ہوٹل سے کیوں؟ ہیڈن ولیج کی رہائش گاہ سے کیوں نہیں پوچھتے؟“

”چلو..... وہیں سے بتا دو۔“

”چار دن پولیس کی تحویل میں رہے تھے اور پولیس ہم سے ہمارے بارے میں معلومات حاصل کرتی رہی تھی۔ پھر نجانے کہاں سے اُسے ہمارے بارے میں کچھ غلط سن گن مل گئی۔ اور ہمیں لاک آپ توڑ کر بھاگنا پڑا۔ ڈیڈی کے ہاتھوں تین پولیس مین ہلاک ہو گئے اور اس کے بعد تم سمجھ سکتے ہو کہ ہمیں کیسی کیسی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا ہوگا۔ وہ تو شکر تھا کہ ہم لوگ ہلکے سے میک آپ میں تھے اور میک آپ تبدیل کرنے کے بعد اپنی اصلی شکل میں آ گئے۔ جس کی وجہ سے بچ گئے۔ ورنہ.....“

”آہ.....“ میں نے گہری سانس لی اور کافی کی پیالی دوبارہ اٹھا کر ہونٹوں کے قریب کر لی۔ لیکن پچھلا تجربہ نہایت تلخ تھا۔ اس لئے اس بار جلد بازی کا ثبوت نہ دیا۔

لیری کہنے لگی۔ ”پھر ہم تمہاری تلاش میں سرگرداں رہے۔ ہوٹل تو فوراً ہی چھوڑنا پڑ گیا تھا۔ کیونکہ اب وہاں ہماری موجودگی خطرناک ہو سکتی تھی۔ پیرس کے ایک گندے سے محلے میں قیام کیا اور پھر مسلسل تمہاری تلاش مصروف رہے۔ ڈیڈی کا کہنا تھا کہ تم ذہین آدمی ہو۔ اس وقت ملو گے جب خطرات ٹل چکے ہوں گے۔ ویسے ڈیڈی کو تمہاری کارروائی کی مکمل رپورٹ مل چکی تھی۔ یعنی یہ کہ تم نے لائل بروڈی کو وہیں ہلاک کر دیا تھا، جوشین کا آدمی

تھا۔ اور اُس کے بعد وہاں سے نکل گئے تھے۔ لیکن جیمس پوکر وغیرہ ہمیں دستیاب نہیں ہو سکے۔ صرف ایک بات کا جواب دے دو ڈیڑ مون! کیا فلم تمہارے قبضے میں ہے یا وہ تمہارے ہاتھ سے نکل گئی.....؟“

یہ سوال بڑی سنسنی خیز حیثیت کا حامل تھا۔ ایک طرف لیسی جین گروجر تھی اور دوسری جانب لیری کوئین..... دونوں ہی فلم کی جائز حق دار تھیں۔ کیونکہ دونوں ہی مجھے کاک ٹیل پلا چکی تھیں۔ فیصلہ یہ کرنا تھا کہ کون سی کاک ٹیل زیادہ پر لطف رہی؟ یا میرا مستقبل دونوں میں سے کس کے ہاتھوں میں زیادہ محفوظ ہے؟ اور یہ فیصلہ فوری طور پر کر لینا اتنا آسان کام نہیں تھا۔ لیکن صورت حال ایسی تھی کہ فوری فیصلہ بھی ضروری تھا۔

لیری کوئین میری اس سرد مہری سے کچھ بے چین سی نظر آ رہی تھی۔ اور جب بے چینی اُس سے برداشت نہ ہو سکی تو اُس نے کہا۔ ”مون! میں محسوس کر رہی ہوں کہ تم کچھ پریشان سے ہو گئے ہو۔ کیا بات ہے؟ کیا مجھے نہیں بتاؤ گے؟“

”میں ابھی تک تمہارے وجود پر ہی یقین نہیں کر سکا لیری! تم اس طرح مجھ سے ملی ہو

کہ جیسے میرا یہاں مل جانا تمہاری توقع کے مطابق ہو۔ اس کی وجہ بتاؤ پہلے مجھے۔“ تعجب ہے مون! یہ بات ہم لوگ اچھی طرح جانتے تھے کہ تم پیرس بنی میں ہو اور یقیناً ہماری تلاش میں سرگرداں ہو گے۔ ہم اگر الجھنوں کا شکار نہ ہوتے تو تمہیں پہلے ہی تلاش کر لیتے۔ میں اتفاقہ طور پر یہاں نکل آئی تھی۔ لیکن میرا مشن تمہاری تلاش ہی تھا۔ تمہیں اس جگہ دیکھ کر مجھے جس قدر خوشی ہوئی، تمہاری سرد مہری یہ خوشی کم کر رہی ہے۔“

میں نے گہری نگاہوں سے لیری کوئین کا جائزہ لیا۔ اور بالآخر لیسی کو خدا حافظ کہہ دیا۔ ہاں! لیسی جین گروجر زیادہ شاطر تھی۔ جبکہ لیری کوئین ابھی جرم کی دُنیا میں نئی نئی داخل ہوئی تھی اور اتنی زیادہ پختہ نہیں ہوئی تھی۔ بعد میں یہ فیصلہ کروں گا کہ مجھے کیا کرنا ہے؟ فی الحال تو وہ فلم میرے لئے وبال جان بنی ہوئی تھی۔ لیری کے حوالے کرتا یا لیسی کے حوالے..... بات ایک ہی تھی۔ ویسے بعض معاملات میں لیری، لیسی سے بہتر تھی۔ کیونکہ لیسی نے یہ شرط بھی عائد کر دی تھی بلکہ اپنے طور پر یقین کر لیا تھا کہ اب میں اُس کے گروہ میں شامل ہو گیا ہوں۔ جب کہ لیری کوئین کے ہاں گنجائش تھی۔ لیسی کے گروہ میں شامل ہونے کا مطلب یہ تھا کہ شین سے براہِ راست معرکہ آرائی رہے، اور میں اُس جیسے خطرناک آدمی سے بھڑنا

نہیں چاہتا تھا۔ جب کہ لیری کے حوالے یہ فلم کرنے کے بعد بھی میں وہی سب کچھ کر سکتا تھا جو میرے ذہن میں تھا۔ یعنی راؤ فرار..... ٹھیک ہے۔ مجھے ان ہی کی مدد کرنی چاہئے۔ لیکن یہ رقم کا معاملہ؟ بظاہر مسٹر لیری کنگ بھی جرم کی دنیا کے شریف آدمی نظر آتے تھے۔ ممکن ہے، اُن کی نیت میری رقم پر خراب نہ ہو۔ بہر طور! جو کچھ ہوگا، دیکھا جائے گا..... میں نے آخری فیصلہ کر لیا اور اُس کے بعد ویٹر کو بلا کر کافی کا بل بھی ادا کر دیا۔ پھر میں نے لیری سے پوچھا۔

”تمہارا قیام اس وقت کہاں ہے؟“

”میں نے کہا نا، ہم نے اپنے لئے ایک الگ جگہ بنالی ہے، جو شبے سے پاک ہے۔ مسٹر کنگ وہاں ایک بہت زیادہ بوڑھے آدمی کی حیثیت سے رہ رہے ہیں اور میں اُن کی بیٹی، اُن کے ساتھ رہتی ہوں۔ پڑوسیوں سے ہمارے کوئی تعلقات نہیں ہیں اور ہونے بھی نہیں چاہئیں تھے۔ کیونکہ ہم انتہائی سنگین حالات کا شکار ہیں۔“

”چلو..... باہر چلو۔“ میں نے کہا اور لیری کوئین کے ساتھ باہر نکل آیا۔

اُس کی گاڑی باہر موجود تھی۔ میں نے اُسے کلیسائے نورٹھڈیم چلنے کے لئے کہا اور وہ تعجب سے میری صورت دیکھنے لگی۔ اس وقت میں تمام احتیاط بالائے طاق رکھ کر خطرہ مول لینے پر تیار ہو گیا تھا۔ اونٹ کسی کروٹ تو بیٹھے۔ مجھے یہ احساس تو ہو کہ اب وہ فلم میرے پاس یا میری تحویل میں نہیں ہے۔ چنانچہ بس! ذہن کو چڑھ گئی اور میں لیری کے ساتھ کلیسائے نورٹھڈیم پہنچ گیا۔ لیری حیران ضرور تھی۔ لیکن یہ بات جان گئی تھی کہ یہاں آنا فلم ہی کے سلسلے میں ہے۔

میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ اُس حصے میں قدم رکھا جہاں میں نے فلم محفوظ کی تھی۔ لیری کوئین میرے ساتھ تھی۔ پھر میں نے بوسیدہ مجسمے میں ہاتھ ڈال کر ٹٹولا اور میری آنکھیں پر سکون انداز میں بند ہو گئیں۔ میری محفوظ کردہ اشیاء وہیں موجود تھیں۔ میں نے انہیں وہاں سے نکال لیا۔ فلم کا رول میں نے لیری کے حوالے کیا تو اُس کے ہاتھ کانپ رہے تھے اور آنکھوں میں مسرت کی جھلکیاں تھیں۔

جب ہم کلیسائے نورٹھڈیم سے واپس پلٹ رہے تھے تو لیری نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔ ”ہمارے اس پہلے سودے کی تکمیل ریڈ اسٹیک کی ساکھ بحال کر دے گی اور میری

دیرینہ آرزو پوری ہو جائے گی۔ آہ..... مون! تم نے ہمارے لئے جو کچھ کیا ہے، میں الفاظ میں اُس کا شکر یہ نہیں ادا کر سکتی۔ کاش! میں تمہارے شایان شان کوئی صلہ دے سکوں.....“ میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ کار سفر کرتی رہی۔ اور پھر پرانے پیرس کے ایک بوسیدہ علاقے میں پہنچ کر لیری کوئین نے کال بیل کا بٹن دبایا۔ اور جواب میں ایک کانپتے ہوئے بدن والے بوڑھے نے دروازہ کھول دیا۔ لیکن مجھے دیکھتے ہی اُس کی جسمانی قوتیں بحال ہو گئیں اور وہ اپنی عمر سے تقریباً پچیس سال پیچھے چلا گیا۔ وہ دوڑ کر مجھ سے لپٹ گیا تھا۔ میں تو اُسے نہیں پہچان سکا کیونکہ وہ میک اپ میں تھا۔ لیکن اُس نے مجھے پہچان لیا تھا۔ بوڑھے کے حلق سے مسٹر لیری کنگ کی آواز ہی بلند ہوئی تھی۔

”مجھے یقین تھا کہ تم ہمیں دھوکہ نہیں دو گے۔ کیوں لیری! کیا تم میرے اس تجربے کو چیلنج کر سکتی ہو؟“

”نہیں ڈیڈی! آپ کو مسٹر مون پر جس قدر اعتماد تھا، واقعی وہ قابل حیرت ہے۔ لیکن اس اعتماد کے صلے میں مسٹر مون کا جواب، اُس سے بھی زیادہ حیرت ناک ہے۔ بہر طور! میں ابھی اس دنیا کو پوری طرح سمجھنے کے قابل نہیں ہوئی۔ لیکن رفتہ رفتہ سمجھ لوں گی۔ البتہ وہ ترکیب آپ مجھے ضرور بتائیے، جس کے تحت لوگوں کو اس انداز میں پرکھا جاسکتا ہے۔“ دروازہ بند کر کے ہم لوگ ایک چھوٹے سے کمرے میں داخل ہو گئے۔ فلیٹ میں پانچ کمرے تھے لیکن سب کے سب چھوٹے۔ تاہم پیرس جیسے شہر میں یہ جگہ بڑی اہمیت کی حامل تھی۔ ایک کمرے میں بٹھا کر مسٹر کنگ مجھ سے میری خیریت دریافت کرنے لگے اور لیری نے انتہائی مسرت کے عالم میں فلم اُن کے حوالے کر دی۔ مسٹر کنگ نے اپنے چکراتے ہوئے ذہن کو سنبھالنے کے لئے ہاتھ کی ہتھیلی ماتھے پر رکھ لی تھی۔ اور دیر تک آنکھیں بند کئے رہے تھے۔ پھر انہوں نے فلم اٹھا کر دیکھی اور اپنا ہاتھ میرے بازو پر رکھ دیا۔

”یہ..... میری گردن پر تمہارا اتنا بڑا احسان ہے مون! کہ میں الفاظ میں بیان نہیں کر سکتا۔“

”یہی وہ فلم ہے جسے حاصل کرنے کے لئے نجانے کون کون سرگرداں تھا۔ لیکن آپ کے اطمینان پر مجھے حیرت تھی مسٹر کنگ! نجانے آپ اتنے سکون سے کیسے میری واپسی کا انتظار کرتے رہے؟ اور مزید حیرت مجھے خود پر ہے کہ میں کس طرح آپ کے پاس واپس

پہنچ گیا۔“

”تمہیں واپس تو آنا تھا ڈیزمون! تمہیں یقیناً واپس آنا تھا۔ یہ ہو ہی نہیں سکتا تھا کہ تم واپس نہ آؤ۔ اعتماد اور تجربہ بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔“

میں نے دل ہی دل میں سوچا کہ مائی ڈیز لیری کنگ! اسی لئے تم شین کے قیدی بنے رہے تھے کہ تمہیں اپنے تجربے پر ناز تھا۔ چند گھنٹے اور لیٹ ہو جاتے مجھ سے ملاقات کرنے میں تو تمہاری گردن میں صرف تجربے کا ڈھول لٹکا رہ جاتا، جسے بجانے کی کوئی چیز بھی تمہارے پاس نہ ہوتی۔ مگر خوش بختی، جس کا ساتھ بھی دے جائے۔ وہ لیسے کا ساتھ نہیں دے سکتی تھی.....

تاہم مسٹر کنگ کو سنائی جانے والی کہانی میں یہ الفاظ شامل نہیں تھے کہ میں وہ فلم لیسے کو دینے کے لئے تیار تھا۔ میں نے اٹل بروڈی کی موت کے بعد سے اپنے فرار پر ایکسٹن کے چنگل میں جا پھنسنے کی کہانی، اُس کے بعد اپنا اغواء، شین کے قبضے میں پہنچ جانا اور لیسے جین گروجر کی آمد، پھر اُس کا ڈرامہ اور اُس کے بعد سے اب تک کی تمام تفصیل مسٹر لیری کنگ کو سنائی اور پھر حتمی لہجے میں کہا۔

”میں کسی سلسلے میں اب ایک قدم بھی اٹھانے کے لئے تیار نہیں ہوں۔ جو کچھ میں کر چکا ہوں، وہ آپ کو بتا چکا ہوں مسٹر کنگ! اس کے بعد میں مکمل آرام چاہتا ہوں۔“

”اس بات سے کون انکار کرتا ہے؟ فی الحال یہ فلیٹ محفوظ جگہ ہے۔ کسی کا تصور بھی یہاں تک نہیں پہنچ سکتا۔ مجھے صرف دو دن کی مہلت دو۔ اور ان دنوں میں تم لیری کے ساتھ یہیں قیام کرو۔ بلکہ میں تو کہتا ہوں کہ اب لیری کے بھی باہر نکلنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ تم یہیں رہو۔ میں فلم کے سودے کی تکمیل کر کے ریڈ اسنیک کا اعلان کر دوں گا۔ تمہاری طرف کسی کی توجہ بھی نہیں جائے گی۔ اور اگر جائے گی بھی تو وہ تمہیں ریڈ اسنیک کا آدمی سمجھیں گے۔ ارے واہ! کیا خوبصورت طریقے سے اس کام کا آغاز ہوا ہے۔ کیا تم دونوں اب مجھے اجازت دو گے؟“

”اوکے ڈیڈی!“ لیری کوئین نے پر مسرت انداز میں کہا۔

ان دونوں میں سے کسی نے میرے ہاتھ میں دبے ہوئے اُس بیگ کے بیارے میں نہیں پوچھا تھا، جس میں اس وقت بہت بڑی دولت پوشیدہ تھی۔ میں نے اُسے اوپر وہیں

ایک طرف رکھ دیا۔ بہر طور! محبتیں اپنی جگہ اور کاروبار اپنی جگہ۔ اور اُس کے بعد میں لیری کی محبتوں کے سائے میں سانس لینے لگا۔ جو کچھ وہ میرے لئے کر سکتی تھی، وہ ان دنوں میں کرتی رہی تھی۔ اور میں بھی دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو کر اس گندے سے فلیٹ میں اپنے آپ کو ضم کر چکا تھا کہ کم از کم یہ خالہ شہادت کی کھولی سے لاکھ درجے بہتر تھا اور میں دولت کے انبار پر بیٹھا ہوا تھا۔ کیا ہی سکون کی چیز ہے یہ شے بھی..... خرچ کرو یا نہ کرو۔ پاس ہو تو عمر بڑھ جاتی ہے۔ اور نہ ہو تو زندگی کے ماہ و سال چھوٹے چھوٹے نقطوں میں تبدیل ہو کر منتشر ہوتے رہتے ہیں اور یوں لگتا ہے جیسے عمر صرف گزارنے کی شے ہو۔

تیسری رات مسٹر لیری کنگ واپس آئے تو اُن کا چہرہ جوش مسرت سے سرخ ہو رہا تھا۔ انہوں نے خوشخبری سنائی کہ فلم کا سودا مکمل ہو چکا ہے اور کل صبح اُس کی تکمیل ہو جائے گی۔ اس کے لئے ہمیں کوئی کاوش نہیں کرنی ہوگی۔ دوسرے دن کے لئے انہوں نے ایک چھوٹا سا پروگرام بتا دیا تھا۔ وہ رات ہی کو چلے گئے اور پروگرام کے مطابق ہم نے پیرس کے ایک معروف ہوٹل میں اُن سے ملاقات کی۔

مسٹر لیری کنگ سگار پیتے ہوئے ایک آرام کرسی پر دراز، ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ اُن کے انداز میں بڑا سکون تھا۔ کہنے لگے۔ ”رقم حاصل ہو گئی ہے۔ اور میرے دوست مون! تمہارے حصے کی ایک بہت بڑی رقم میرے پاس محفوظ ہے۔ اس سودے کی تکمیل کے بعد یوں سمجھ لو کہ ریڈ اسنیک اپنے وقت کی زبردست اہمیت حاصل کر چکا ہے اور چند ہی دنوں کے اندر اندر تم بے شمار اخبارات میں اس کا نام دیکھو گے۔ یہ سب کچھ تمہاری مدد سے ہوا ہے۔ میں اس بات کا دل سے اعتراف کرتا ہوں۔ ہاں! اب مجھے یہ بتاؤ کہ تم آئندہ کیا پروگرام رکھتے ہو؟ اگر ہمارے ساتھ شامل رہ کر ریڈ اسنیک کی عزت بڑھاتے رہو تو ہم تمہارا دلی شکریہ ادا کریں گے اور اگر اس سے چھٹکارا حاصل کر کے کہیں جانے کے خواہش مند ہو تب بھی تمہاری مدد کی جائے گی۔ یہ ہماری ذمہ داری ہے۔“

میرے کچھ بولنے سے پہلے لیری کوئین بول اُٹھی۔ ”نہیں ڈیڈی! مون کہیں نہیں جائیں گے۔ اور اگر یہ جانے کی کوشش بھی کریں گے تو کیا ہم انہیں جانے دیں گے؟ ریڈ اسنیک نے نئی زندگی پائی ہے۔ اگر مون، ریڈ اسنیک کو بے بسی کی موت مارنا چاہتے ہیں تو پھر بھلا انہیں کون روک سکتا ہے..... کیوں مون؟ کیا تمہیں ہماری خوشیاں عزیز نہیں ہیں؟“

میں نے دل ہی دل میں سوچا کہ بی بی! سب سے عزیز تو مجھے اپنی خوشیاں ہیں۔ لیکن کیا کروں؟ میرا کچھ بھی میرا اپنا نہیں ہے۔ ظاہر ہے تم سے لڑنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ تاہم میں نے مسٹر کنگ سے اتنا ضرور کہا۔ ”وہی تو آپ لوگ جو بھی پسند کریں گے، مجھے اس سے اختلاف نہیں ہوگا۔ لیکن کیا اب میرے لئے پیرس میں رہنا ممکن ہے؟ بلاشبہ مجھے آپ سب کی دوستی اور سہارے حاصل ہیں۔ لیکن دشمنوں کی جتنی بڑی تعداد میرے پیچھے ہے، اگر میں فرانس میں رہا تو شاید اُن کے ہاتھوں بچ نہ سکوں۔“

”مجھے بھی اس کا پورا پورا خیال ہے۔ ایسی جین گروجر کے علم میں یہ بات آچکی ہے کہ ریڈ اسنیک نے بالآخر فلم کا سودا کر لیا ہے اور اب یقیناً وہ یہ سوچنے پر مجبور ہوگی کہ تمہارا کوئی تعلق ریڈ اسنیک سے ضرور تھا اور تم نے اُسے بھی جُل دیا کیونکہ تم اُسے بتا چکے ہو کہ تم آرٹن ڈورل نہیں ہو۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ تم ایکسٹن گروہ کے چکر میں بھی آچکے ہو اور دوسرے بہت سے کارنامے تمہارے نام سے وابستہ ہیں۔ وہ لوگ یہ جانتے ہیں کہ تم نے نہایت کامیابی سے ہیڈن ولج کے گھر سے وہ فلم حاصل کی۔ لائل بروڈی کو قتل کیا، وغیرہ وغیرہ..... چنانچہ اس صورت حال سے ایسی جین گروجر تمہاری طرف سے بد دل ہو چکی ہے۔ اور اب ظاہر ہے یہ صورت حال شین کو بھی معلوم ہو جائے گی۔ چنانچہ دونوں ہی کے عتاب کا نشانہ تم بنو گے۔ کیونکہ یہ سب کچھ تمہاری وجہ سے ہوا ہے اور تم ریڈ اسنیک کے نمائندے ہو۔ واہ..... کیا بات ہے۔ ریڈ اسنیک زندہ بھی ہوا تو اس شان کے ساتھ کہ دوسرے تمام، منہ دیکھتے رہ گئے۔ میرے دوست! کہنے کو تو میں تم سے بہت سی بڑی بڑی باتیں کہہ سکتا ہوں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ تم نے میری ناک اونچی کر دی ہے۔ اور میں تمہارے اس احسان کا کوئی صلہ تمہیں نہیں دے سکتا۔ بہر حال! تم نے فرانس سے باہر جانے کی بات کی ہے۔ بے شک تمہیں فرانس سے باہر نکال دینا اب میرا سب سے پہلا کام ہے۔ کیونکہ میں تمہاری زندگی چاہتا ہوں اور تمہیں ان جھگڑوں میں ملوث نہیں کرنا چاہتا۔ مجھے صرف تین دن کا وقت دو۔ میں تمہارے لئے کوئی بہتر صورت حال ترتیب دیئے دیتا ہوں۔ اپنے اس مشن سے فارغ ہو چکا ہوں اور جیسا کہ میں نے تم سے تمہارے حصے کے بارے میں کہا.....“

”نہیں مسٹر لیری کنگ! میں نے آپ پر مکمل اعتماد کر لیا ہے۔ چنانچہ اس کا ذکر آپ بار

بار نہیں کریں گے۔“

”اس کے باوجود میں یہ چاہوں گا کہ تمہاری پسند کے مطابق کسی جگہ تمہارا اکاؤنٹ کھول کر تمہارا حصہ وہاں منتقل کر دوں اور تمہیں اُسے ضرورت کے وقت حاصل کرنے میں کوئی دقت نہ ہو۔“

”میرے پاس بھی کچھ رقم موجود ہے۔ براہ کرم یہ نہ پوچھئے کہ میں نے اُسے کہاں سے حاصل کیا؟ میں اس رقم کو بھی اُسی حصے کے ساتھ منتقل کرنے کا خواہش مند ہوں۔ آپ کو اس سلسلے میں بھی میری مدد کرنا ہوگی۔“

”کیوں نہیں..... یہ کوئی کہنے کی بات ہے؟“ لیری کنگ جرم کی دنیا کا انسان تھا۔ لیکن نجانے کیوں اُس کے انداز سے ہمیشہ مجھے شرافت ٹپکتی محسوس ہوتی تھی۔ پتہ نہیں یہ شخص مجرم کیوں بن گیا تھا؟

بہر طور! ان فضول باتوں میں سرکھپانے کا موقع نہیں تھا۔ میں نے لیری کنگ کو تین دن کا وقت دے دیا اور یہ تین دن لیری کوئین کی صحبت میں بہت ہی خوشگوار گزرے۔ لیری کنگ کی یہ عادت تھی کہ کسی کام میں مصروف ہوتا تو اُس وقت تک واپس نہیں آتا تھا جب تک اُس کی تکمیل نہ کر لے۔ تیسرا دن ختم ہوتے ہی شام کے تقریباً ساڑھے آٹھ بجے وہ واپس پہنچ گیا۔ انداز میں تھکا تھکا پن نمایاں تھا۔ کہنے لگا کہ ہم لوگوں نے رات کا کھانا تو نہیں کھایا؟ ہم لوگ کھانے کی تیاریاں ہی کر رہے تھے۔ لیری کنگ خاموشی سے ہمارے ساتھ ڈنر میں شریک ہو گیا۔ ڈنر سے فارغ ہونے کے بعد اُس نے تمباکو نوشی کرتے ہوئے کہا۔

”تمہاری ہدایت کے مطابق مسٹر مون! میں نے وہ ساری رقم ڈنمارک منتقل کر دی ہے۔ اور جو رقم تم نے مجھے دی تھی، وہ بھی۔ یہ اُس کے کاغذات ہیں۔“ اُس نے جیب سے بینک کے کاغذات نکال کر میرے سامنے ڈال دیئے۔ جو میں نے دیکھے بغیر جیب میں ٹھونس لئے۔ لیری کنگ نے اس بات پر اطمینان کا اظہار کیا تھا کہ میں اُس پر مکمل اعتماد کرتا ہوں۔ اس کے بعد اُس نے ایک ہوائی ٹکٹ، میرا پاسپورٹ اور دوسرے شناختی کارڈ نکال کر میرے سامنے رکھے۔ میں نے ٹکٹ پر آلبرگ لکھا دیکھا تھا۔ گویا لیری کنگ نے میرے لئے ڈنمارک کا سفر منتخب کیا تھا۔ وہ گہری نگاہوں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔

جب میری نگاہ اُس سے ملی تو میں نے شانے ہلاتے ہوئے اُس سے کہا۔ ”نہیں مسٹر لیری کنگ! آپ کا خدشہ بے بنیاد ہے۔ مجھے صرف فرانس سے نکلنا تھا۔ وہ جگہ ڈنمارک ہوتی یا کوئی اور، اس سے مجھے کوئی غرض نہیں ہے۔“

”آلبرگ میں تمہیں ہر طرح کی آسانیاں حاصل ہوں گی۔ یہ فلائٹ جس سے تم سفر کرو گے، صبح ساڑھے دس بجے آلبرگ پہنچے گی اور وہاں پر تمہیں ہوٹل رومیو کا نمائندہ مل جائے گا۔ یہ فائیو سٹار ہوٹل بہترین ہوٹلوں میں شمار ہوتا ہے۔ رومیو پہنچنے کے بعد تم اطمینان سے اُس میں قیام کرو گے۔ ہم لوگ بھی چند روز کے اندر اندر پہنچ جائیں گے۔ ویسے اس دوران تم آلبرگ میں جس طرح چاہو، وقت گزار سکتے ہو۔ اپنے تحفظ کا خیال رکھنا۔“

”لیری کوئین میرے ساتھ کیوں نہیں جا رہی؟“ میں نے سوال کیا۔

”تمہارا یہ سوال توقع کے مطابق ہے۔ دراصل میں بے غرض انسان نہیں ہوں۔ اور پھر تم نے ریڈ اسنیک کی سرپرستی قبول کر لی ہے۔ چنانچہ تمہاری صلاحیتوں سے فائدہ نہ اٹھانا بھی حماقت ہے۔ میں نے ایک ایسا کام تلاش کیا ہے، جس کی ابتداء ہمیں ڈنمارک سے کرنا ہوگی۔ اسی لئے میں نے تمہیں ڈنمارک منتقل کیا ہے۔ بقیہ معلومات کے لئے مجھے اور کوئین کو یہاں رُکنا پڑے گا۔ ہم ان معلومات کی تکمیل کے بعد ڈنمارک پہنچیں گے اور پھر وہاں سے اپنے کام کا آغاز کریں گے۔ ریڈ اسنیک دوسرا اہم کارنامہ تمہارا انتظار کر رہا ہے ڈیز مون! اور مجھے یقین ہے کہ اس چند روزہ قیام کے بعد تم تروتازہ ہو جاؤ گے۔ کیا خیال ہے؟“

”ٹھیک ہے مسٹر کنگ! جیسا آپ پسند کریں۔“ میں نے پر اعتماد لہجے میں کہا۔ حقیقت یہ تھی کہ لیری کوئین کی غیر موجودگی میرے لئے کوئی خاص حیثیت نہیں رکھتی تھی۔ بلکہ ایک طرح سے یہ میرے حق میں بہتر ہی ہوا تھا۔ کیونکہ میرے ذہن میں کچھ اور ہی تھا۔ تاہم میں نے یہی ظاہر کیا کہ جیسے لیری کوئین کے نہ جانے سے مجھے کوفت ہوئی ہو۔ لیری کنگ سے تقریباً ساڑھے بارہ بجے تک گفتگو ہوتی رہی۔ اور اُس کے بعد میں سونے کے لئے چلا گیا۔

اگلے دن آلبرگ ایئر پورٹ پر میں نے رومیو کے اُس نمائندے کو نظر انداز کر دیا جس نے مجھ سے آکر پوچھا تھا کہ جناب! کیا آپ کا نام مون ہے؟ میں نے معذرت کے انداز

میں گردن ہلائی اور نمائندہ سوری کہہ کر وہاں سے آگے بڑھ گیا۔ میں جانتا تھا کہ اگر میں رومیو میں قیام کروں گا تو ریڈ اسنیک کی نگاہوں میں رہوں گا۔ اور کسی بھی لمحے وہ دونوں باپ بیٹی دوبارہ مجھ پر مسلط ہو جائیں گے۔ ڈنمارک آتو گیا تھا لیکن اب ایک سیاح کی حیثیت سے یہاں وقت گزارنا چاہتا تھا۔ اور اُن لمحات کا انتظار کرنا چاہتا تھا جو مجھے یا تو ہمیشہ کے لئے آزادی بخش دیں یا پھر..... اور اس کے آگے صرف ایک بڑا سا سوالیہ نشان تھا اور کچھ نہیں۔ چنانچہ میں نے وہاں رُکنے کی بجائے اپنے مخصوص انداز میں سفر شروع کر دیا اور کسی پاگل بیل کی مانند ناک کی سیدھ میں دوڑ پڑا اور ناک کی اس سیدھ نے مجھے اوڈنزے پہنچا دیا۔

چند دن میں نے اوڈنزے میں رہ کر کوپن ہیگن کے بارے میں معلومات حاصل کی تھیں۔ اور پھر دوسری منزل کوپن ہیگن ہی تھی۔ کوپن ہیگن پہنچنے کے لئے بس کا سہارا لینا پڑا۔ اور بالآخر میں اس حسین شہر میں داخل ہو گیا۔ یہ زندگی اب میرے لئے اجنبی نہیں رہی تھی۔ عملی زندگی میں تو کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ ان حسین و جمیل شہروں اور ملکوں کی سیر کروں گا۔ اور کچھ اس زندگی سے مجھے ملا ہوا نہ ملا ہو، لیکن میں نے دنیا کا بہت بڑا حصہ دیکھ لیا تھا۔ کوپن ہیگن کسی زمانے میں ایک چھوٹی سی بندرگاہ تھی، جس نے ایک وسیع تجارتی مرکز کی حیثیت اختیار کر لی اور تاجروں کی بندرگاہ کہلائی۔ سینٹرل سٹیشن کے ساتھ ہی کوپن ہیگن کا صدیوں پرانا تفریحی پارک تیوالی ہے۔ تیوالی پارک کے صدر دروازے پر ڈنمارک کا پرچم لہرا رہا تھا۔ اور اُس کے نیچے مختلف کھڑکیوں کے آگے ٹکٹ خریدنے والوں کے جھوم لگے ہوئے تھے۔ میں نے بھی اس دلچسپی میں حصہ لیا۔ اور کرنا ہی کیا تھا؟ چنانچہ میں بھی ٹکٹ خرید کر باغ میں داخل ہو گیا۔ رات ڈیڑھ بجے میں تیوالی سے باہر نکل آیا اور ٹاؤن ہال کے پہلو میں جانے والی سڑک اسٹروگیٹ پر چل پڑا۔ یہ سڑک کوپن ہیگن میں خرید و فروخت کا سب سے بڑا مرکز ہے اور صرف پیدل چلنے والوں کے لئے مخصوص ہے۔ اتنی رات ہونے کے باوجود یہاں خوب رونق تھی۔ نائٹ کلبوں میں ہونے والی خوف ناک وارداتوں کی تصاویر آویزاں تھیں، جنہیں دیکھ کر نگاہیں شرم سے جھکی جا رہی تھیں۔ میں آگے بڑھتا رہا۔ اندازہ یہ ہو رہا تھا کہ یورپ کے دوسرے ملکوں کی نسبت یہاں خاص طور سے اخلاقی قدروں کا کوئی گزر نہیں ہے۔ تھیٹروں اور نائٹ کلبوں کے سامنے تماشاخیوں کے جھوم تھے

اور وہ ان بے ہودگیوں میں بہت زیادہ دل چسپیوں کا مظاہرہ کر رہے تھے۔

ایک بک سٹال کے قریب میں نے ایک ڈبلی پتلی جسامت اور لمبے قد کے مالک شخص کو دیکھا، جس کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں اور مخصوص خدو خال اُسے جاپانی نسل کا کوئی باشندہ ظاہر کرتے تھے۔ باریک سی چونچ نما داڑھی اور باریک باریک مونچھوں کے ساتھ اُس کا چہرہ حماقتوں کا گہوارہ نظر آتا تھا۔ اس طرح شرمارہا تھا جیسے کسی نئی نویلی دلہن کو سر بازار لا کر کھڑا کر دیا گیا ہو۔ اُس کے سامنے بک سٹال کے پیچھے کھڑی پینتالیس سالہ سیلز گرل اُسے دلچسپ نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ اس منظر نے میری توجہ اپنی جانب مبذول کر لی اور میں تفریحی انداز میں آگے بڑھ کر اُن کے قریب پہنچ گیا۔ جاپانی خدو خال کے شخص کو شاید میری قربت کا احساس ہوا۔ اُس نے پلٹ کر مجھے دیکھا اور جھینپے ہوئے سے انداز میں واپسی کے لئے مڑ گیا۔ نجانے کیوں مجھے اُس شخص سے دلچسپی محسوس ہوئی تھی۔ میں نے آگے بڑھ کر اُس کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ”اس میں شرم مانے کی تو کوئی بات نہیں۔“ یہ جملہ میں نے انگریزی زبان میں ادا کیا تھا۔

وہ جھینپے ہوئے انداز میں ہنسنے لگا۔ پھر بولا۔ ”یہ سب کچھ..... یہ سب کچھ کتنا عجیب ہے؟ کتنا عجیب.....“

”مگر جاپان میں تو اس سے بھی زیادہ عجیب باتیں ہوتی ہیں۔“

”ہوتی ہوں گی۔ میں نے کبھی جاپان نہیں دیکھا۔“

”کیا مطلب؟“

”میں کوریا کا باشندہ ہوں۔ میرا نام کیروسا ہے۔ بیل کیروسا..... مگر میری ماں جرمن

تھی۔ دونوں نے مجھے اپنے اشتراک سے جنم دیا اور میری شناخت ہی میں کھو کر گم ہو گئے۔“ وہ کچھ ایسے لہجے میں بولا کہ مجھے اُس کے یہ الفاظ دلچسپ لگے۔

”مستر بیل کیروسا!“ میں نے اُسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

”میں یہ سب کچھ تنہا نہیں دیکھ سکتا۔ بس! ایک عجیب سی شرم کا احساس ہوتا ہے۔“

”اس لئے کہ تمہاری رگوں میں تھوڑا ایشیائی خون موجود ہے۔“

”تھوڑا بہت کیوں؟ اچھا خاصہ کہو۔ تم نے اپنا نام نہیں بتایا دوست؟“

”تعلق میرا بھی ایشیاء ہی سے ہے۔ لیکن پہلے تم مجھے ایک بات بتا دو۔“

”یہاں سرعام..... رات کافی گزر چکی ہے۔ تاہم آؤ! کہیں بیٹھ کر باتیں کرتے ہیں۔ میں بھی دوست بنانے کے معاملے میں بہت ہی احمق ہوں۔ اگر کوئی خود ہی آگے بڑھ کر مجھ سے دوستی کا ہاتھ ملا لے تب تو ٹھیک ہے۔ ورنہ میری اتنی جرات نہیں ہوتی کہ میں خود.....“

”اوہ..... ویسے میرا نام مون ہے مسٹر کیروسا!“ ہم دونوں ایک چھوٹے سے ریستوران میں جا بیٹھے۔ کیروسا نے کافی طلبہ کر لی تھی۔ ویسے بھی رات گزاری کے لئے تنہائی مناسب تھی۔

اُس نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”سنا ہے یہاں کے نائٹ کلب..... کیا تم نے باہر لگی ہوئی تصویریں دیکھیں؟“

”تمہیں ان تصویروں سے دلچسپی محسوس ہوئی؟“ میں نے سوال کیا۔

”نہیں..... بس! میں نے یہ سب کچھ بہت کم دیکھا ہے۔ دیکھتا ہوں تو عجیب سا احساس ہوتا ہے۔ لیکن میں ان جھگڑوں میں بہت زیادہ نہیں پڑنا چاہتا۔ میری کمپنی نے ایک خاص کام سے مجھے کوپن ہیگن بھیجا ہے۔ اس کی تکمیل میں کچھ وقت لگے گا۔ لیکن میں کوپن ہیگن کی تفریحات میں تنہا تو حصہ لے ہی نہیں سکتا۔ ویسے کیا یہ ممکن نہیں ہو سکتا مسٹر مون! کہ ہم دونوں دوستی کر لیں؟ دیکھو! تفریحات میں گندگی کا میں بھی قائل نہیں ہوں۔ اور تم بھی ایشیائی ہو۔ ہم دونوں کی اچھی گزرے گی۔ ویسے بھی کافی دن تک کوپن ہیگن میں رہوں گا۔ تم اگر میرا ساتھ دو تو مجھے خوشی ہوگی۔ میرے ہوٹل میں میرے پاس ڈبل روم ہے۔ اگر تم پسند کرو تو.....“

میں نے فوراً ہی اس موقع سے فائدہ اٹھانے کا فیصلہ کر لیا اور اُس کی دوستی قبول کر لی۔ بیل کیروسا دلچسپ آدمی تھا۔ اُس کی باتوں میں کبھی کبھی گہرا فلسفہ جھلکنے لگتا جس سے یہ احساس ہوتا کہ وہ بہت قابل آدمی ہے۔ اور کبھی اُس کے انداز میں ایسی بچکانہ معصومیت پیدا ہو جاتی کہ اُس کی شخصیت مضحکہ خیز لگنے لگتی۔ ویسے اتفاقہ دریافت تھی۔ چنانچہ ہمیشہ کی مانند اس بار بھی میں نے یہی سوچا کہ وہ غلط آدمی نہیں ہے۔

صبح ہونے میں شاید کچھ ہی لمحات باقی تھے جب میں اُس کے ساتھ اُس کے ہوٹل میں داخل ہوا۔ ڈبل روم بہت شاندار تھا۔ بیل کیروسا نے غسل خانے کی طرف بڑھتے ہوئے

طرف متوجہ ہوں گے جب تمہارا خون اُلتا ہوا بدن زمین پر تڑپ رہا ہوگا.....“
 ”واہ..... تم تو ایک اچھے خاصے مفکر معلوم ہوتے ہو۔ ایک ایسا خاکہ تم نے میرے سامنے پیش کیا ہے جو حقیقت سے بہت قریب ہے۔ لیکن اگر میرے دوست! میں ان گولیوں سے بچنا چاہوں تو مجھے کیا کرنا ہوگا؟“
 ”صرف سڑک پار کرنا ہوگی۔ لیکن خاموشی کے ساتھ.....“ اُس شخص نے بھی مسکراتے ہوئے اس طرح دوستانہ انداز میں کہا تھا جیسے مجھے کسی حسین لڑکی کے بارے میں بتا رہا ہو۔
 میں نے خوش ہو کر کہا۔ ”یہ کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ زندگی بچانے کا اتنا آسان نسخہ.....؟“

لیکن سڑک عبور کرنے کے بعد مجھے پتہ چلا کہ یہ نسخہ اتنا آسان نہیں تھا۔ کیونکہ سیاہ رنگ کی وہ مرسدیز دروازہ کھولے ہوئے میرے انتظار میں تھی جس کی ڈرائیونگ سیٹ پر ایک شخص بیٹھا ہوا تھا۔ کبخت تین آدمی پچھلی نشست پر میرے ساتھ لگ گئے اور چونکہ اُن کا حجم اچھا خاصا تھا اس لئے میرا جسم سینڈوچ بن گیا۔ چوتھا آدمی ڈرائیور کے برابر دروازہ کھول کر بیٹھ گیا تھا۔

ڈرائیور نے مرسدیز آگے بڑھا دی اور میں گہری گہری سانسیں لیتا رہا۔ پھر میں نے اپنے بائیں طرف بیٹھے ہوئے شخص سے کہا۔ ”سینڈوچ کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟“

”مجبوری ہے۔“ اُس نے منہ سکیڑ کر کہا۔

”نہیں نہیں..... سینڈوچ کوئی مجبوری نہیں ہے بلکہ اچھی خاصی چیز ہے۔ جسے بوقت ضرورت.....“

”بکواس بند کرو۔ اگر تم ہماری توجہ اپنی جانب مبذول کرانا چاہتے ہو تو اس سے تمہیں کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔“

”ویسے تم سب کی شکلیں انتہائی منحوس ہیں۔ کون سے ملک سے تعلق ہے تمہارا؟ میں نے کہا اور میرے دائیں سمت بیٹھے ہوئے شخص نے ذرا سی کہنی اُپر اٹھا کر میری پسلی میں چھو دی۔ ہاتھ تھا کہ فولاد کا ٹکڑا..... مجھے خاصی تکلیف ہوئی تھی۔ اُس نے کہا۔ ”آرام سے بیٹھو..... ہمیں بکواس پسند نہیں ہے۔“

کہا۔ ”میں بس دو منٹ میں باہر نکل آتا ہوں۔ اس کے بعد تم چاہو تو غسل کر لینا۔ ویسے کیا تم نے یہاں کوئی کمرہ نہیں حاصل کیا تھا؟“

”ابھی تک نہیں۔ تیوالی پارک کی دلچسپیوں نے مجھے خود میں گم کر لیا تھا۔ میں نے یہی سوچا تھا کہ دن کی روشنی میں اپنے لئے قیام گاہ تلاش کروں گا۔“

وہ ہنستا ہوا غسل خانے میں داخل ہو گیا۔ اور پھر تھوڑا سا دروازہ کھول کر باہر جھانکتا ہوا بولا۔ ”لیکن وقت نے دن کی روشنی سے پہلے ہی تمہیں، تمہاری قیام گاہ تک پہنچا دیا۔“ اُس نے اندر منہ کر کے دروازہ بند کر لیا۔

یہ الفاظ وہ بعد میں بھی ادا کر سکتا تھا۔ لیکن یہی اُس کی معصومیت تھی۔ میں نے کمرے کا جائزہ لیا اور جوتے اُتار دیئے اور اپنے لباس کو آسان کرنے لگا۔ پھر جب بیل کیروسا واپس آیا تو میں غسل خانے میں داخل ہو گیا۔ ہم صبح تک کھاتے پیتے رہے تھے۔ اس لئے ناشتے کی گنجائش نہیں تھی۔ اُس نے غسل کے بعد مجھ سے ناشتے کے بارے میں پوچھا تو میں نے اس سے انکار کر دیا۔

”میں خود بھی کچھ کھانے کے موڈ میں نہیں ہوں۔ چنانچہ اس سے عمدہ اور کوئی ترکیب نہیں ہو سکتی کہ ہم کمرہ بند کر کے سو جائیں۔“ اُس نے دروازہ بند کیا اور بستر پر جا لیٹا۔

نہ جانے کب نیند آگئی۔ اور نہ جانے کب جاگا۔ جاگا تو بیل کیروسا کمرے میں نہیں تھا۔ میری نگاہیں غسل خانے کی جانب اٹھ گئیں۔ لیکن وہاں بھی خاموشی تھی۔ پھر میں نے دروازے کی جانب دیکھا۔ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ نہ جانے کیوں میرے ذہن میں ایک عجیب سا خیال آیا اور میں نے پھرتی سے اپنے سامان کو دیکھا۔ میرے کاغذات وغیرہ جوں کے توں تھے اور کوئی ایسی چیز گم نہیں تھی جو میرے لئے باعث تشویش ہوتی۔

میں ہوٹل سے باہر نکل آیا اور پیدل سڑک پر چلنے لگا۔ لیکن ابھی زیادہ دُور نہیں گیا تھا کہ دفعۃً چند افراد میرے قریب پہنچ گئے۔ اُن میں سے ایک نے میری کمر پر کوئی چیز چھوتے ہوئے کہا۔ ”سڑک بے شک بھری پڑی ہے۔ لیکن اگر سائلنسر لگے ریوالور کی نال سے تین گولیاں نکل کر تمہارے دل میں پیوست ہو جائیں تو ظاہر ہے تم لوگوں کو یہ بتانے کے لئے زندہ نہیں رہو گے کہ تم پر گولی کس نے چلائی ہے..... ہم لوگ آسانی سے منتشر ہو جائیں گے اور چونکہ فار کی کوئی آواز نہیں ہوگی۔ اس لئے لوگ صرف اس وقت تمہاری

”کمال ہے۔ نہ تمہیں سینڈوچ پسند ہے نہ بکواس....“ میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا اور پھر آرام سے بیٹھ گیا۔ لیکن یہ آرام میرے لئے کتنا تکلیف دہ تھا.... میں ہی جانتا تھا۔ میں نے سڑکوں کے بارے میں اندازہ لگانے کی کوشش ہی نہیں کی تھی کیونکہ کوپن ہیگن کی سڑکوں سے میں بالکل واقف نہیں تھا۔ نہ جانے کتنی بار دائیں اور بائیں گھومنے کے بعد کار ایک عمارت میں داخل ہو گئی جو باہر سے کافی حسین نظر آ رہی تھی۔ عمارت میں داخل ہونے کے بعد کار رُک کر اور جب مجھے باہر نکالا گیا تو میں گہری گہری سانسیں لینے لگا۔

”ٹھہرو.... پہلے میں اپنی جسامت بحال کر لوں اس کے بعد تم لوگوں کے ساتھ آگے بڑھنا مناسب ہو گا۔“ میں نے کہا۔ لیکن پیچھے سے مجھے کالر پکڑ کر دھکا دے دیا گیا اور میں اوندھے منہ گرتے گرتے بچا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ان پانچ مصیبتوں کو کون سے رجسٹر میں درج کروں؟ تعلق کس سے ہے؟ کیوں مجھے یہاں لائے ہیں؟ ابھی کچھ نہیں معلوم تھا۔ سر پر مکھی بھنبھنا رہی تھی۔ وہی بد بخت مکھی.... جو مجھے میری تقدیر کی آنے والی تاریکی کا پتہ بتا دیتی تھی۔ ہاں! یہ حقیقت ہی تو تھی۔ جب بھی کسی جال میں پھنستا تھا، یہ آواز ضرور سنائی دیتی تھی۔ مکھی کی سی بھنبھناہٹ.... لیکن آج پہلی بار میں نے یہ بھنبھناہٹ محسوس کی تھی۔ ممکن ہے کوئی مکھی ناک کے راستے دماغ ہی میں گھسن گئی ہو اور جب بھی میں مصیبت کا شکار ہوتا ہوں، وہ خود بھی عتاب میں گرفتار ہو جاتی ہے اور اس وقت وہ کرب سے بھنبھناتی ہو یا میرے دماغ میں لگے ہوئے کسی ریڈار کا کمال تھا یہ جو مجھے آنے والے خطرات کا پتہ دیتا تھا۔ بہر طور! میں اسی بھنبھناہٹ کے سائے میں اُن کے ساتھ عمارت کے اندر داخل ہوا اور پھر جس کمرے میں مجھے پہنچایا گیا اُس کا منظر دیکھ کر میری آنکھیں غصے سے سرخ ہو گئیں۔ سامنے ہی ایک کرسی پر بد بخت بیل کیروسا بندھا ہوا تھا۔ اور اُس کے چہرے پر مُردنی سی چھائی ہوئی تھی۔ دل چاہا کہ پاؤں سے جوتا اُتار کر اُس پر پل پڑوں۔ لعنت ہے اس کتے پر.... اگر زخموں کی طرح بک سٹال پر لگی ہوئی تصویروں کو دیکھ کر نہ لپک رہا ہوتا تو بھلا میں اُس کی طرف متوجہ ہوتا؟ کیا ضرورت پڑی تھی مجھے کہ میں اس گدھے سے دوستی گانٹھتا اور اس کے ساتھ ہی قیام کرتا.... مجھے یقین ہو گیا کہ میری یہ گرفتاری بھی بیل کیروسا ہی کی گرفتاری کے بعد کا نتیجہ ہے۔ گویا اصل جرم بیل کیروسا کا تھا اور پھنس میں گیا تھا.... مجھے لانے والوں نے میرے ساتھ بھی وہی سلوک کیا جو بیل کیروسا کے ساتھ کیا تھا۔ وہ کمبخت

اتنے کھر درے اور سخت مزاج تھے کہ کچھ کہنے کی جرات نہیں ہو رہی تھی۔ اُس اہنی شخص کی اہنی کہنی مجھے یاد تھی جس نے اُسے میری پسلیوں میں گھسیڑ کر سوراخ کرنے کی کوشش کی تھی۔ یقیناً اُن کے ہاتھ پاؤں بھی اتنے ہی مضبوط ہوں گے۔ اور اگر میری کسی بات پر ناراض ہو کر انہوں نے اپنی قوت کا مظاہرہ کر دیا تو نتیجہ کیا ہو گا....؟ چنانچہ میں نے خاموشی سے اپنے آپ کو بیل کیروسا کی کرسی کے ساتھ لگی ہوئی کرسی سے بندھوا لیا۔ بیل کیروسا کے چہرے پر عجیب سے آثار نظر آ رہے تھے۔ باندھنے والے مجھے بھی باندھ کر کمرے سے باہر چلے گئے۔

”تو یہ بات تھی۔“ میں نے غرائے ہوئے لہجے میں کہا۔ لیکن بیل کیروسا نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ خاموشی سے سامنے دیکھتا رہا تھا۔ ”اگر مجھ پر یہ عتاب تمہاری وجہ سے نازل ہوا ہے بیل کیروسا! تو میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گا۔ میں تو یہ سوچ کر یہاں داخل ہوا تھا کہ اب زندگی کی مصیبتوں سے نجات پا چکا ہوں۔ لیکن.... لیکن بیل کیروسا کتے! تیری وجہ سے مجھے بھی پھنسا پڑا۔ میں پوچھتا ہوں معاملہ کیا ہے؟ کس مصیبت میں گرفتار ہے تو؟ کیا لے کر بھاگا تھا ان لوگوں کا؟ خدا تجھے غارت کرے۔ خدا کرے کیڑے پڑیں تیرے.... ارے تو مر جائے اللہ کرنے....“ میں دانت کلکا کلکا کر اُسے اُردو میں کوسنے لگا۔ لیکن ظاہر ہے اُردو، بیل کیروسا کی کھوپڑی کے اوپر سے گزر رہی ہوگی۔ چنانچہ اُس نے میری کسی بات کا برا نہیں مانا تھا۔ بلکہ یوں لگتا تھا جیسے اُس نے میرے الفاظ سُنے ہی نہ ہوں۔ بلکہ یوں بھی لگتا تھا جیسے اُسے میری یہاں آمد کا علم ہی نہ ہو۔ اُس کی اس بے نیازی نے مجھے اور مشتعل کر دیا تھا۔ میں نے دانت پیستے ہوئے کہا۔ ”بد بخت آدمی! کم از کم مجھے صورت حال سے تو آگاہ کر دے۔ تیری ہی وجہ سے میں بھی مصیبت کا شکار ہوا ہوں۔ مجھے یہ تو بتا دے کہ تو کوئی مجرم ہے اور پولیس کے قبضے میں ہے یا کوئی اور مسئلہ ہے....؟“

کیروسا نے میری طرف دیکھا ہی تھا کہ دفعۃً دروازہ کھلا اور چند افراد اندر داخل ہو گئے۔ اُن میں ایک طویل القامت گینڈا تھا، جس کا وزن تین سو پونڈ بلکہ اس سے بھی کچھ زیادہ ہی ہو گا۔ سر کے بال غائب تھے اور سر پر جگہ جگہ گومڑ سے اُبھرے ہوئے تھے۔ دوسرا ایک درمیانی جسامت کا آدمی تھا۔ تیسرے کی شخصیت میں سب سے نمایاں چیز اُس کی ناک تھی جو طوطے کی چونچ کی طرح خم کھا کر اُس کے پورے چہرے پر پھیل گئی تھی۔ اور چوتھا

ایک پستہ قامت تھا۔ اُن کی عمریں تیس اور چالیس کے درمیان ہوں گی۔ انہیں دیکھ کر بیل کیروسا کے چہرے پر خوف کے آثار نظر آنے لگے۔ وہ میری طرف متوجہ نہیں ہوئے تھے بلکہ انہوں نے کیروسا کو کرسی سے کھول لیا۔ اور اس کے بعد انہوں نے اُس کا لباس تار تار کر کے اُس کے بدن سے اتار دیا۔۔۔۔۔ غالباً لباس اتارنے کے لئے ہی اُسے کھولا گیا تھا کیونکہ اس کے فوراً بعد انہوں نے اُسے کرسی کے ساتھ باندھ دیا۔ اور پھر دفعۃً میری آنکھیں بند ہو گئیں حالانکہ ہزاروں ولٹ کے بلب کا رُخ میری جانب نہیں تھا۔ لیکن مجھے یوں ہی محسوس ہوا تھا جیسے تاریکیوں میں سورج اُبھر آیا ہو۔ چاندی جیسے چمکتے ہوئے پیالے میں یہ انتہائی طاقت ور بلب صحرا کی دوپہر میں سورج کی مانند معلوم ہو رہا تھا اور کمرے کی فضا میں تپش سی پیدا ہو گئی تھی۔ روشنی کی کرنیں ریت کے ذروں کی طرح آنکھوں میں چھ رہی تھیں اور آنکھیں بند کرنے یا کھلی رکھنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ اس کا رُخ بیل کیروسا کی جانب تھا اور بیل کیروسا بری طرح گردن پٹخ رہا تھا۔ تب اُن میں سے ایک نے آہستہ سے اُس سے سوال کیا۔

”کیا اب بھی تم اپنی زبان بند رکھو گے بیل کیروسا؟“

جواب میں بیل کیروسا نے ایک نہایت ہی بدبودار گالی انہیں دی تھی۔ اور اس کے ساتھ ہی اُس نے پوری قوت سے اپنے پاؤں سے جوتا اُتار کر جھٹک دیا۔ پہلا جوتا تو بے مقصد رہا۔ لیکن دوسرا بلب میں جا لگا اور چھنا کے کے ساتھ بلب ٹوٹ گیا۔ وہ لوگ تیز روشنی سے گہری تاریکی میں آ گئے تھے اس لئے وہ بھی اندھے ہو گئے۔ لیکن تھوڑی ہی دیر کے بعد انہوں نے روشنی کر دی جو کمرے میں دوسرے بلبوں کی تھی۔ اور اس کے بعد بیل کیروسا کے پاؤں بھی باندھ دیئے گئے لیکن اس حرکت کے جواب میں انہوں نے بیل کیروسا کے ساتھ کوئی تشدد کی کارروائی نہیں کی تھی۔ چند لمحات خاموشی رہی۔ اور وہ لوگ بیل کیروسا کو گھورتے رہے۔ لیکن تھوڑی ہی دیر کے بعد اتنی ہی قوت کا دوسرا بلب لا کر اُس پیالے میں لگا دیا گیا اور اُس کی روشنی بیل کیروسا کے سامنے کر دی گئی۔

میں نے گڑ گڑاتے ہوئے انداز میں کہا۔ ”دوستو! اگر تم مجھے اس شخص کا ساتھی سمجھتے ہو تو یہ تمہاری حماقت ہے۔ تم اُس سے پوچھ لو اور اگر اس کی بات پر یقین نہ کرو تو مجھ پر یقین کر لو کہ میں تو ایک غیر متعلق آدمی ہوں۔ بد قسمتی کہ پچھلی رات میری اس سے ملاقات تیوالی

میں ہوئی تھی اور وہاں سے اس نے مجھے اپنے ساتھ رہنے کی دعوت دی۔ چونکہ میں نے کسی ہوٹل کا انتخاب نہیں کیا تھا اس لئے میں اس کے ساتھ۔۔۔۔۔“

میں نے اتنا ہی کہا تھا کہ اُن میں سے ایک نے آگے بڑھ کر میرے منہ پر ایک زناٹے دار تھپڑ رسید کر دیا اور پھر مجھے خاموش رہنے کی تلقین کی گئی۔ میں نے بلبلائے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”ظاہر ہے تم جیسے کتے میرے ساتھ یہی سلوک کر سکتے ہیں۔“

لیکن انہوں نے میری بڑبڑاہٹ کا نوٹس نہیں لیا تھا۔ وہ پھر بیل کیروسا کی جانب متوجہ ہو گئے اور انہوں نے اس سے کہا۔ ”تمہاری آنکھیں ہمیشہ کے لئے اپنی بینائی کھو بیٹھیں گی بیل کیروسا! اور تم جانتے ہو کہ اس طرح تم ساری زندگی دوبارہ اپنی بینائی نہیں پاسکو گے۔ یہ بلب اس وقت تک تمہاری آنکھوں کے سامنے روشن رہے گا جب تک تم اپنی زبان نہیں کھول دو گے۔“

بیل کیروسا نے زبان کھولی اور کچھ نئی قسم کی گالیاں میرے علم میں آئیں جو غالباً جرمن اور جاپان کی کسی خاص اشترا کی کیفیت کا اظہار کرتی تھیں۔ لیکن وہ لوگ گالیوں کا بالکل برا نہیں مانتے تھے اور انہیں سن کر اس طرح پر سکون رہتے تھے جیسے یہ گالیاں اُن کے کانوں کے لئے کسی عمدہ ٹانک کی حیثیت رکھتی ہوں۔ پھر وہ بیل کیروسا سے وہی گفتگو کرنے لگے اور میں نے چیخ کر کہا۔ ”کبخت کے بچو! اگر گالیاں سننے کے ہی شوقین ہو تو ذرا میری طرف بھی توجہ دو۔ میں تمہیں انتہائی شاندار گالیاں سنا سکتا ہوں، دنیا کی کئی زبانوں میں۔ اگر ایسا نہیں کر سکتے تو کم از کم میری کرسی کا رُخ بھی تبدیل کر دو۔۔۔۔۔“

نہ جانے کیوں یہ بات اُن کی سمجھ میں آ گئی تھی کہ ایک کی بجائے دو اندھے اُن کے لئے زیادہ سودمند نہیں ہوں گے۔ چنانچہ میری کرسی کا رُخ بدل دیا گیا۔ تیز روشنی میں کمرے کی ایک ایک چیز صاف نظر آرہی تھی اور ان کم بختوں کے بھیانک سائے دیواروں پر لرز رہے تھے۔ وہ بیل کیروسا سے وہی ایک سوال دہراتے رہے۔ لیکن بیل کیروسا نے اس سلسلے میں کوئی جواب نہیں دیا۔ تب وہ اُسے دارنگ دے کر وہاں سے چلے گئے۔ میں بیل کیروسا کی افیت کا بخوبی اندازہ لگا سکتا تھا۔ وہ تیز بلب کی روشنی میں تھا۔ اور اب اُس کے پاؤں بھی بندھے ہوئے تھے۔ غالباً وہ کرسی جس پر بیل کیروسا بیٹھا ہوا تھا اپنی جگہ فکس تھی۔ کیونکہ میں نے بیل کیروسا کے حلق سے دھاڑیں سن سنی تھیں۔ وہ غالباً کرسی کا

رُخ بدلنے کی کوشش میں مصروف تھا۔ تیز روشنی رُخ بدلنے کے باوجود میری آنکھوں کو سخت تکلیف دے رہی تھی۔ جبکہ بیل کیروسا تو اُس کی زد میں تھا۔ میں نے اُن لوگوں کے کمرے سے نکلنے کی آوازیں سن لی تھیں اور اس کے بعد بیل کیروسا کی جدوجہد کی آوازیں ہی محسوس کرتا رہا تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد میں نے کہا۔ ”بیل کیروسا! ان لوگوں نے مجھے کس سلسلے میں پکڑ لیا ہے؟“ لیکن بیل کیروسا مجھے میری، کسی بات کا جواب نہیں دینا چاہتا تھا۔ ظاہر ہے اس نے اُن لوگوں کے سامنے بھی ضد کی تھی اور شدید اذیتیں برداشت کرتا رہا تھا۔ میری بات کا جواب دینے کے لئے اُسے کون مجبور کر سکتا تھا؟ اُسے صرف جھنجھلاہٹ ہوگی، اس بات پر کہ میں بلاوجہ ہی اس چکر میں شامل ہو گیا۔ جب اُس نے مجھے کافی سوالوں کے باوجود ایک بار بھی جواب نہیں دیا تو میں نے خود ہی خاموشی اختیار کر لی۔ بیل کیروسا کے حلق سے ہلکی ہلکی کراہیں نکل رہی تھیں اور پھر یہ کراہیں دھاڑوں میں تبدیل ہو گئیں..... پھر وہ بری طرح چیخنے لگا۔ وہ کہہ رہا تھا۔

”آہ..... ہٹاؤ روشنی..... یہ روشنی میرے سامنے سے ہٹا دو۔ میں سب کچھ بتانے کے لئے تیار ہوں..... میں تمہیں سب کچھ بتانے کے لئے تیار ہوں.....“

میں نے چونک کر گردن گھمائی لیکن بیل کیروسا کی صورت نہیں دیکھ سکا۔ البتہ چند ہی لمحات کے بعد میں نے دروازہ کھلنے کی آواز سنی اور پھر وہی آوازیں مجھے سنائی دینے لگیں جو تھوڑی دیر قبل اس کمرے میں گونج رہی تھیں۔ بیل کیروسا حلق پھاڑ پھاڑ کر چیخ رہا تھا۔

”روشنی بند کر دو..... روشنی بند کر دو..... خدا کے لئے روشنی بند کر دو۔“ اور پھر دفعۃً کمرہ تاریک ہو گیا۔ لیکن مدھم سی روشنی جلادی گئی تھی تاکہ آنکھیں بالکل ہی نابکارہ نہ ہو جائیں۔ وہ لوگ غالباً بیل کیروسا کو کھول رہے تھے۔ پھر اُن میں سے وہی نرم آواز ابھری۔

”بیل کیروسا! تمہیں پہلے ہی یہ بات مان لینی چاہئے تھی۔ بہر طور! آؤ ہمارے ساتھ۔ تم جانتے ہو کہ یہ دشمنی، دوستی میں بھی تبدیل ہو سکتی ہے۔“

”پیارے بھائی! کیا تم لوگ اب بھی میری بات نہیں سنو گے؟ میرے ساتھ کوئی رحم نہیں کیا جائے گا؟“ میں نے کہا۔

جواب میں واپس پلٹے ہوئے اُن لوگوں میں سے کسی ایک نے ایک دھول میری گدی پر رسید کر دی اور اُس کے بعد وہ باہر نکل گئے۔ میں تقدیر کو کوسنے کے علاوہ اور کیا کر سکتا تھا؟ یہ تقدیر ہی تو میری دشمن تھی۔ اب تو اُسے کچھ کہنا ہی بے کار لگتا تھا۔ خاموشی سے وقت گزرنے کا انتظار کرتا رہا۔ اور پھر نہ جانے کتنا وقت اسی طرح گزر گیا..... میں بیٹھے بیٹھے غنودگی کا شکار ہو گیا تھا اور اس غنودگی کے عالم میں مجھے یہ بھی پتہ نہیں چل سکا کہ کب کون اندر آیا؟ بس! بازو میں ہلکی سی چھین محسوس ہوئی تھی۔ اور اس کے بعد حواس رخصت ہو گئے تھے.....

☆.....☆.....☆

جب ہوش آیا تو میں نے کچھ عجیب سی صورت والی لڑکی کو بیٹھے دیکھا جو شکل ہی سے ہونق لگ رہی تھی۔ ٹھوڑی دونوں ہاتھوں پر نکائے بیٹھی، میری صورت دیکھ رہی تھی۔ میں نے زور سے آنکھیں بھیچیں اور سر جھٹکنے لگا۔ وہ دفعۃً ہنس پڑی۔ ”غالباً تم ہوش میں آنے کی کوشش کر رہے ہو۔“

میں سنبھل کر بیٹھ گیا۔ مجھے اپنے عقب میں آوازیں ابھرتی محسوس ہو رہی تھیں۔ میں نے حیرت سے چونک کر ادھر ادھر دیکھا تو میری ذہنی کیفیت خراب ہونے لگی..... یہ تو کوئی باقاعدہ ہوٹل تھا۔ بلکہ اس کا ڈائننگ ہال۔ کیونکہ بے شمار لوگ میزوں پر بیٹھے کھانے پینے کی چیزوں سے شغل کر رہے تھے۔ میں خود بھی ایک کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ اور وہ لڑکی..... وہ احمق اور بے وقوف لڑکی مجھے مسلسل گھورے جا رہی تھی۔ گزرے ہوئے واقعات میرے ذہن میں تازہ ہو گئے۔ جن لوگوں نے مجھے اتنی چالاکی سے بے ہوش کر کے یہاں لا بٹھایا ہے، وہ معمولی حیثیت کے مالک نہیں ہوں گے۔ بلاوجہ احمقانہ قسم کی جدوجہد کرنا مناسب نہیں ہے۔ بہتر یہ ہے کہ خود کو سنبھال کر اپنی راہ لوں..... سامان کمبخت بیل کیروسا کے ہوٹل کے کمرے میں تھا۔ تمام کاغذات وغیرہ بھی اسی میں تھے اور میں اُسے چھوڑ کر نہیں بھاگ سکتا تھا۔ چنانچہ میں نے دل میں فیصلہ کیا کہ کم از کم بیل کیروسا کے ہوٹل جا کر اپنا سامان حاصل کر لینا چاہئے۔ لڑکی کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔

”اچانک ہی تمہارا نشہ ٹوٹ گیا۔ کیا بات ہے؟“

”نشہ؟“ میں نے سوال کیا اور لڑکی پھر بے وقوفوں کی طرح ہنس پڑی۔ تب میں بھی مسکرا پڑا تھا۔

”یوں کرو تم تھوڑی دیر بیٹھی اسی طرح ہنستی رہو۔ میں باتھ روم سے واپس آتا ہوں۔“ اس کے جواب کا انتظار کئے بغیر میں اٹھ گیا۔ بظاہر میرا رخ باتھ روم کی طرف تھا۔ جسے

میں نے اس دوران دیکھ لیا تھا لیکن اس کے ساتھ ہی میں نے نکاسی کا وہ دروازہ بھی دیکھا تھا جس سے لوگ آ، جا رہے تھے۔ چنانچہ باتھ روم میں داخل ہونے کی بجائے میں تیز رفتاری سے اُس دروازے سے اندر داخل ہو گیا اور ایک پتلی سی گلی میں نکل آیا۔ غالباً یہ اُس ریسٹوران میں داخل ہونے کا عقبی دروازہ تھا۔ گلی کو میں نے دوڑ کر عبور کیا تھا اور پھر ایک سڑک پر پہنچ گیا تھا۔ سڑک پر تقریباً نصف فرلانگ پیدل چلنا پڑا۔ اور پھر ایک ٹیکسی دوڑتی ہوئی نظر آئی تو میں نے ہاتھ کا اشارہ کر کے اُسے روک لیا اور اُس میں بیٹھ کر ڈرائیور کو اُس ہوٹل کا پتہ بتا دیا جہاں بیل کیروسا کا قیام تھا۔

بیل کیروسا کے بارے میں مجھے نہیں معلوم تھا کہ اس پر کیا ہوتی؟ اُس نے روشنی کی اذیت سے مجبور ہو کر اُن لوگوں کو وہ راز بتانے کا وعدہ کر لیا تھا جسے وہ معلوم کرنا چاہتے تھے۔ ظاہر ہے اُس کے بعد اُس کے ساتھ اچھا سلوک ہی کیا گیا ہوگا، بشرطیکہ بیل کیروسا کے ذریعے انہیں اُن کا مقصد حاصل ہو گیا ہو۔ ہوٹل کے کاؤنٹر سے میں نے بیل کیروسا کے کمرے کی چابی طلب کی اور پرسکون انداز میں کمرے کی جانب چل پڑا۔ میرے ذہن میں یہی پروگرام تھا کہ بیل کیروسا کے کمرے سے اپنے کاغذات اور اپنا سامان لے کر خاموشی سے یہاں سے نکل جاؤں گا۔ کوپن ہیگن میں رُکنا ضروری تو نہیں ہے۔ کوئی بھی جگہ میری قیام گاہ بن سکتی ہے۔ فی الحال ڈنمارک سے نکلنے کا کوئی پروگرام نہیں تھا۔ میں نے کمرے کے دروازے میں چابی لگائی ہی تھی کہ دفعۃً مجھے عقب سے قدموں کی آوازیں سنائی دیں۔ پلٹ کر دیکھا تو جان نکل گئی..... پولیس کی وردی دیکھی ہی اب میری بہت بڑی کمزوری بن گئی تھی۔ نہ جانے کون کون سے ملکوں میں اور کون کون سے شہروں میں پولیس کو، میری تلاش تھی۔ کہیں بھی اگر رابطہ مل گیا تو جان بچانی تقریباً ناممکن ہو جائے گی۔ بہر طور! میں نے کمرے کا تالا کھول لیا تھا۔ ضروری تو نہیں ہے کہ پولیس والے میری ہی طرف آ رہے ہوں۔ لیکن آنکھیں بند کر لینے سے بلی نہیں بھاگ جاتی۔ کمرے کے دروازے سے اندر قدم رکھا ہی تھا کہ پولیس والے بھی دروازے ہوئے اندر داخل ہو گئے اور میں سہمی ہوئی فاخستہ کی مانند اُن کی صورت دیکھنے لگا۔ سامنے ہی ایک گدھ جیسی آنکھوں والا چالاک پولیس آفیسر نظر آ رہا تھا جو شاید آنکھوں ہی آنکھوں میں مجھے پھانسی دے رہا تھا۔ میں نے گھورتی نگاہوں سے اُسے دیکھا تو اُس نے اپنا شناختی کارڈ نکال کر میرے سامنے کر دیا۔

میں نے سرد لہجے میں کہا۔ ”اس کی کیا ضرورت ہے آفیسر؟ آپ کی وردی ہی آپ سے سہارا دیا تھا۔ میں نے انسپکٹر کو یہ بھی بتایا کہ وہ ایک کاروباری سلسلے میں یہاں آیا تھا اور شخصیت کا اظہار کرتی ہے۔“

آفیسر نے جلدی سے شناختی کارڈ واپس جیب میں رکھ لیا تھا۔ پھر اُس نے مسکرا کر درمیان دوستی ہونے کے باوجود وہ بے تکلفی نہیں تھی جو دوستوں میں ہوتی ہے۔ بلکہ میں بیل ہوئے کہا۔ ”یقیناً..... یقیناً تم ٹھیک کہتے ہو۔ سوری مائی ڈیئر! دراصل میں تم سے بیل کیرو سا کو اپنا بزرگ ہی سمجھتا تھا۔

انسپکٹر نے مجھے بتایا کہ بیل کیرو سا کی لاش پوسٹ مارٹم کے لئے ہسپتال میں ہے اور کے بارے میں معلومات حاصل کرنا چاہتا ہوں۔“

”براہ کرم تشریف رکھئے آفیسر! خیریت؟ بیل کیرو سا میرا دوست ہے۔ ہم دونوں ایک مناسب کارروائی کے بعد اگر میں چاہوں تو لاش میرے حوالے کی جاسکتی ہے۔ میں نے ساتھ قیام کرتے ہیں۔ اس کے بارے میں آپ کیا معلوم کرنا چاہتے ہیں؟ وہ انتہائی روتے ہوئے کہا کہ میں اپنے دوست سے جدا ہو چکا ہوں۔ اس کی تدفین میں ہی کروں شریف، نیک نفس اور شرمیلا آدمی ہے۔ عمر رسیدہ ہونے کے باوجود اُس کی فطرت میں کوا گا۔ اس کے بعد مجھے انسپکٹر کے ساتھ ہسپتال تک جانا پڑا تھا۔ یہاں میں نے بیل کیرو سا کی لاش اپنی آنکھوں سے دیکھی..... بری طرح مسخ ہو چکی تھی۔ میں نے جس قسم کی اداکاری کی ایسی خامی نہیں ہے جسے معاشرے کا جرم کہا جاسکے۔“

”تم تقریر بہت اچھی کر لیتے ہو اور اس میں الفاظ بھی ٹھیک ٹھاک ہی استعمال کر۔ ابتداء کی تھی، وہ میرے لئے بہت معاون ثابت ہوئی تھی اور تمام ہمدردیاں مجھے حاصل ہو ہو۔ لیکن اگر تمہارے دوست بیل کیرو سا کو کوئی قتل کر دے تو اس کی وجوہات تمہارے خیال میں کیا ہو سکتی ہیں؟“

میں چونک پڑا تھا۔ مجھے بیل کیرو سا کے قتل کی اطلاع ملنے کی اُمید نہیں تھی۔ میں تب لاش ہسپتال سے حاصل کر لوں..... ہسپتال میں پوسٹ مارٹم میں ابھی کچھ دیر لگنے والی تھی۔ بھری نگاہوں سے پولیس آفیسر کو دیکھنے لگا۔ اُس نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ”ہاں۔ پولیس اسٹیشن سے میں ٹیکسی کر کے سیدھا ہوٹل پہنچا اور یہاں آ کر میں نے سب سے پہلے یہ پل میلوڈی کے نیچے پانی میں اُس کی لاش ملی ہے۔ اُسے پل سے نیچے پھینک دیا گیا ہے۔ اُس کی موت پانی میں گرنے سے واقع ہوئی ہے۔ پھر پانی کی لہروں نے اُسے کنارے پھینک دیا۔ اُس کی جیب سے کچھ کاغذات برآمد ہوئے جن سے پتہ چلا کہ وہ اس ہوٹل، چھپاتا ہوٹل سے باہر نکل آیا۔ سڑکوں پر آوازہ گردی کرتا ہوا سوچتا رہا کہ اب یہاں سے بھی مقیم ہے اور اس کا نام بیل کیرو سا ہے۔ ہوٹل سے پتہ چلا کہ تم بیل کیرو سا کے ساتھ رہو۔ ہمیں بیل کیرو سا کی موت کی تفصیلات درکار ہیں۔“ انسپکٹر کی نگاہوں سے شبہ جھلک

تھا۔

دفعۃً ہی میں نے اُس کے سامنے رونا پیٹنا شروع کر دیا۔ یہی ترکیب ذہن میں تھی۔ میں نے بیل کیرو سا کی موت کے سلسلے میں جس قدر شور و غوغا کیا، اُسے سن کر اُن بھی بوکھلا گیا اور بدحواسی کے انداز میں مجھے تسلیاں دینے لگا۔ اُس نے مجھ سے پوچھا

”میں نے اُس کے سامنے رونا پیٹنا شروع کر دیا۔ یہی ترکیب ذہن میں تھی۔ میں نے بیل کیرو سا کی موت کے سلسلے میں جس قدر شور و غوغا کیا، اُسے سن کر اُن بھی بوکھلا گیا اور بدحواسی کے انداز میں مجھے تسلیاں دینے لگا۔ اُس نے مجھ سے پوچھا

بیل کیرو سا سے میرا کیا رشتہ ہے؟ میں نے فوراً ہی ایک کہانی گھڑ کر سنا دی۔ جس میں نے اُسے بتایا کہ بیل کیرو سا ہی میرا وہ واحد دوست اور سرپرست تھا جس نے مجھے

کیا ضرورت تھی؟ میں خاموشی سے انتظار کرتا رہا۔ اور جب اس انتظار سے مجھے تھکن ہونے لگی تو میں نیچے اُترا۔ اب کچھ کرنا چاہئے۔ میں اپنی کار سے آگے بڑھ کر ٹہلتا ہوا اُس کار کے قریب جا پہنچا۔ ڈرائیور اطمینان سے آرام کرسی میں دراز تھا۔ میں نے پھرتی سے اُس کا نزدیکی دروازہ کھولا اور اندر داخل ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے اُس کی جیب میں ہاتھ ڈال کر اُس کا پستول نکال لیا تھا۔ ڈرائیور چونک کر سنبھل گیا۔ میں نے پستول کی نال اُس کی پیشانی سے لگاتے ہوئے کہا۔

”اگر کچھ کرنے کی کوشش کی دوست! تو اس کار کے خوب صورت کور تمہارے خون سے رنگین ہو جائیں گے..... کیا سمجھے؟“

”مم مگر..... مگر تم تو..... تو تم.....“

”آگے بڑھو! یہاں سے آگے بڑھ جاؤ..... ہماری بقیہ گفتگو اس جگہ سے ہٹ کر ہوگی۔ لیکن جو کچھ میں نے کہا ہے، اس پر ذرا توجہ رکھنا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ میرا مشن ادھورا رہ جائے۔“

ڈرائیور نے کار سٹارٹ کر کے آگے بڑھا دی۔ اُس کے ہاتھ اسٹیرنگ پر لرز رہے تھے۔ تاہم اسٹیرنگ اُس کے کنٹرول میں تھا۔ میں سڑک کے دونوں طرف نگاہیں دوڑا رہا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد ہم ایک ویران سڑک پر آ گئے۔ یہاں ٹریفک نہ ہونے کے برابر تھا۔ میں نے ڈرائیور سے کار ایک طرف روک دینے کے لئے کہا اور اُس نے کار روک دی۔

”مجھے پہچانتے ہو ڈرائیور..... مجھے اغواء کرنے والوں میں تم بھی شامل تھے۔“ میں نے کہا۔ ڈرائیور نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر سہمی ہوئی نگاہوں سے مجھے دیکھا۔ ”تمہارے اور بھی ساتھی تھے۔ میں انہیں بھی پہچانتا ہوں۔ اگر تم نے سچ بولا تو ممکن ہے تمہاری جان بچ جائے۔ کیا نام ہے تمہارا؟“

”ینگ.....“ ڈرائیور نے پھنسی پھنسی آواز میں کہا اور پھر بولا۔ ”مم..... مگر میں..... میں تو صرف ایک ڈرائیور ہوں جناب! آپ خود سمجھ سکتے ہیں کہ ملازموں کو.....“

”جو کچھ میں پوچھ رہا ہوں، صرف اس کا جواب دو۔ اس کے علاوہ اور میں کچھ نہیں سننا چاہتا۔“

”جج جناب..... نف..... فرمائیے.....“ وہ ہکلائے ہوئے لہجے میں بولا۔

کافی مشکل کام ثابت ہو رہا تھا۔ وہ سگنل اور ٹریفک قوانین کی پرواہ کئے بغیر چلے جا رہے تھے۔ کار کئی بار میری نگاہوں سے اوجھل ہوئی مگر ڈرائیور ہوشیار تھا اور اُس نے اس کا پیچ نہیں چھوڑا۔ البتہ یہ اندازہ میں لگا چکا تھا کہ کار والوں کو ہمارے تعاقب کا علم نہیں ہو رہا ہے۔ بالآخر وہ ایک عمارت کے سامنے رُک گئی اور پیچھے بیٹھے ہوئے دونوں افراد نکل کر عمارت میں داخل ہو گئے۔ ڈرائیور چند لمحات انتظار کرتا رہا، اور پھر کار لے کر وہاں سے آگے بڑھا۔ مجھے اب یہ فیصلہ کرنا تھا کہ میں اس عمارت کا جائزہ لوں یا صرف ڈرائیور سے صورت حال کے بارے میں معلومات حاصل کروں؟ ڈرائیور کی رفتار کافی تیز تھی۔ لیکن نیگرو ٹیکسی ڈرائیور سڑکوں کا بادشاہ تھا۔ چنانچہ دوسرے ہی موڑ پر اُس نے اُس گاڑی کو جا لیا اور ایک بار پھر وہ ہماری نگاہوں کے سامنے آ گئی..... مجھے اپنے آپ پر حیرت ہو رہی تھی۔ نکلا تھا اس پروگرام سے کہ یہاں سے کہیں فرار ہونے کی کوشش کروں گا اور لگ گیا اور لوگوں کے پیچھے..... بظاہر اس کا کوئی مقصد نہیں تھا۔ بس! سنک ہی سوار ہو گئی تھی۔ اور کیوں نہ سوار ہوتی؟ میرا ذہن جس حد تک پراگندہ ہو چکا تھا، اس کے بعد کسی طرح کا تعین میرے لئے ممکن نہیں تھا۔ جب تقدیر اپنی مرضی سے مجھے گھوڑے کی طرح دوڑا رہی تھی کبھی کبھی اس گھوڑے کا خود بھی دوڑنے کو جی چاہ سکتا ہے۔ اس وقت یہی کیفیت تھی گاڑی ایک جگہ کھڑی ہو گئی۔ میں ٹیکسی میں بیٹھا انتظار کرتا رہا۔ ڈرائیور نے سوالیہ نگاہوں سے مجھے دیکھا تو میں نے چند کرنسی نوٹ اُس کے ہاتھ میں تھما دیئے۔ یہ اتنی مالیت کے تھے کہ اس کے بعد ڈرائیور کو مجھ سے کچھ پوچھنے کی ضرورت پیش نہ آئی۔ اس نے اطمینان سے اپنے سر پر پہنا ہوا کیپ چہرے پر ڈھک لیا اور اس کے نیچے سے بولا۔

”جب بھی میری ضرورت ہو جناب! صرف اُنکی سے آہستہ سے کھٹکھٹا دیجئے۔ پوچھئے کہ میں ایک لمحہ نہیں ضائع کروں گا۔“ میں نے گردن ہلا دی۔

ڈرائیور خاموشی سے تقریباً ایک گھنٹے تک وہاں رُک رہا تھا۔ پھر جب اُس نے سٹارٹ کی تو میں نے ٹیکسی ڈرائیور کے کندھے کو ہلکا سا اشارہ کیا۔ فوراً ہی سیلف لگا اور ٹیکسی سٹارٹ ہو گئی۔ نیگرو ڈرائیور بہت مستعد تھا۔ واپسی میں یہ کار اُسی جگہ پہنچی تھی جہاں اُس نے اُن دونوں افراد کو چھوڑا تھا۔ ڈرائیور نے کار ایک جگہ پارک کی اور اس میں دراز ہو گیا۔ عجیب حماقت کی بات تھی جب یہیں آنا تھا تو بلاوجہ اتنا فاصلہ طے کر کے کہیں اور جانے

عجیب سا تھا۔ لیکن دلکش خدوخال کی مالک تھی۔ نہ جانے کیوں یہ چہرہ کچھ جانا پہچانا سا محسوس ہوا۔ ایک لمحے کے بہت ہی کم حصے میں وہ ہمارے سر پر پہنچ گئی۔

”پیچھے ہٹ جاؤ! تمہارا ان معاملات سے کوئی تعلق نہیں ہے۔“ اُس نے غرائی ہوئی آواز میں کہا اور میں بے اختیار پیچھے ہٹ گیا۔ کیونکہ اُس کے ہاتھ میں دبے ہوئے ننھے سے پستول کو میں نے دیکھ لیا تھا۔ لڑکی نے آگے بڑھ کر پستول کی نال ڈرائیور کی پیشانی پر رکھ دی اور اُس کا گریبان پکڑ کر اُسے پوری قوت سے باہر کھینچ لیا۔ ڈرائیور اوندھے منہ نیچے آ پڑا تھا..... اُس نازک اندام سی لڑکی کے بدن میں یہ قوت دیکھ کر میں نے معنی خیز انداز میں گردن ہلائی تھی۔ اُس کے چہرے سے عجیب سی سفاکی ٹپک رہی تھی۔ پتہ نہیں کون ہے؟ لیکن اُس کے خدوخال مجھے جانے پہچانے کیوں محسوس ہو رہے ہیں؟ ڈرائیور کو لڑکی نے دو تین ٹھوکریں مار کر سیدھا کر دیا اور پھر پستول کی نال اُس کی پیشانی پر رکھ کر اُس کی جیبوں کی تلاشی لینے لگی۔ اُس نے اپنا ایک گھٹنا ڈرائیور کے سینے پر رکھ دیا تھا۔ ڈرائیور نے کوئی جدوجہد نہیں کی تھی۔ لڑکی نے سرسری انداز میں اُس کے بغلی ہولسٹر کو چیک کیا۔ لیکن ڈرائیور کا پستول تو اب میرے پاس تھا۔ لڑکی کو کچھ نہیں ملا۔ میں اگر چاہتا تو لڑکی کو روکنے کے لئے پستول کا سہارا لے سکتا تھا۔ لیکن مجھے تو یہ بھی نہیں پتہ تھا کہ وہ ہے کون؟

لڑکی نے ڈرائیور کو ایک بار پھر گریبان سے پکڑ کر کھڑا کر دیا اور اُسے دھکا دے کر اپنی کار کی جانب بڑھنے لگی۔ پھر اُس نے ڈرائیور کو کار کی سیٹ پر بٹھایا اور خود اسٹیرنگ پر بیٹھ گئی۔ پستول کا رخ بڑی چالاکی سے اُس نے ڈرائیور کی طرف کر رکھا تھا۔ کار سٹارٹ ہوئی اور آگے بڑھ گئی۔ لیکن مجھے شدید حیرت تھی۔ لڑکی نے اس دوران مجھے اس طرح نظر انداز کیا تھا جیسے میرا کوئی وجود ہی نہ ہو۔ حالانکہ پستول میرے پاس موجود تھا۔ لیکن ایسا احساس ہوتا تھا جیسے لڑکی جانتی ہے کہ میں اُس کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کروں گا۔ نیلی کار نگاہوں سے اوجھل ہونے والی تھی کہ مجھے ہوش آ گیا اور دوسرے لمحے میں اُس کار کی جانب جھپٹا جو اُن لوگوں کی تھی اور جسے یہیں چھوڑ دیا گیا تھا۔ کار کے انکیشن میں لگی ہوئی چابی صاف نظر آ گئی۔ میں نے پھرتی سے کار سٹارٹ کر کے آگے بڑھا دی اور دیوانوں کی طرح ڈرائیور کرتا ہوا بالآخر اُس کار کو پا لینے میں کامیاب ہو گیا۔ وہ برق رفتاری سے آگے بڑھ رہی تھی۔ اطراف میں اور کوئی ٹریفک نہیں تھا۔ میں تیزی سے تعاقب کرتا ہوا ایک ایسی

”نیل کیروسا سے تم لوگ کیا معلوم کرنا چاہتے تھے؟“

”بب نیل..... نیل کیروسا! مم..... میں تو کسی نیل کیروسا کو نہیں جانتا۔“

”میں اُس شخص کی بات کر رہا ہوں جو میرے ساتھ ہوٹل میں رہتا تھا۔ اور جب مجھے

اغواء کر کے وہاں پہنچایا گیا تو وہ وہاں موجود تھا۔“

”اوہ..... میں تو اُس کا نام بھی نہیں جانتا۔ لیکن..... لیکن.....“

”دیکھو ڈرائیور! اگر تم واقعی ڈرائیور ہو تو اس وقت تمہارے حق میں یہی بہتر ہے کہ اپنی زندگی بچاؤ۔ باقی اگر تم موت کا مزہ چکھنا چاہتے ہو تو ٹھیک ہے۔ مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔“

”آپ یقین کیجئے جناب! میں بالکل بے قصور ہوں۔ میری حیثیت ڈرائیور سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔ مالکان کیا کرتے ہیں؟ اور اُن کا مقصد کیا ہے؟ بھلا یہ بات کسی ڈرائیور کو بتائی جاسکتی ہے؟ آپ خود ہی فیصلہ کر لیجئے.....“

میں گہری نظروں سے ڈرائیور کا جائزہ لیتا رہا۔ پتہ نہیں کمبخت سچ بول رہا تھا یا جھوٹ..... اس کا کوئی اندازہ نہیں ہو پا رہا تھا۔ ویسے یہ سب کچھ اضطراری طور پر ہی ہوا تھا۔ یا تو مجھ پر نیل کیروسا کی موت نے اثر کیا تھا یا پھر کوئی سنک ذہن پر سوار ہو گئی تھی۔ بھلا مجھے کیا پڑی تھی کہ اس سلسلے میں چھان بین کرتا۔

دفعۃً ہی ایک عجیب سا احساس ہوا۔ اپنی اس فطرت کا اندازہ مجھے خود ہی ہونے لگا اور میں نے اپنے طور پر کچھ سوچا کہ آج تک یہی ہوا ہے کہ میں مصیبتوں سے بھاگتا رہا ہوں اور مصیبتیں میرا تعاقب کرتی رہی ہیں۔ اب میں ان الجھنوں سے بھاگنا نہیں چاہتا تھا۔ بلکہ خود ہی الجھنوں کے ہجوم میں گھس کر اپنے لئے آگے کی راہیں کھولنے کو جی چاہ رہا تھا اور یہ طریقہ کار برا نہیں تھا۔ دیکھتا ہوں یہ حالات کب تک میرا تعاقب کرتے ہیں۔ اب میں خود ان کا تعاقب کروں گا..... چنانچہ شاید یہی تصور لاشعوری طور پر مجھے ڈرائیور کے پیچھے لگا لایا تھا۔

سہا ہوا ڈرائیور میری صورت دیکھ رہا تھا۔ دفعۃً ہی میں نے عقب سے کسی کار کے بریکوں کی چرچراہٹ محسوس کی اور اُچھل پڑا۔ نیلے رنگ کی ایک چھوٹی سی کار تھی۔ جس کا دروازہ کھول کر ایک لڑکی باہر نکل آئی۔ سیاہ سکرٹ اور سرخ بلاؤز میں ملبوس تھی۔ چہرہ کچھ

جگہ آ گیا جو مضافاتی ہو سکتی تھی۔ سامنے ہی ایک میدان نظر آ رہا تھا جہاں شہر بھر کا کور، کرکٹ لا کر پھینکا جاتا تھا۔ خالی بوتلوں اور ڈبوں سے لے کر ٹوٹی پھوٹی کاروں کے ڈھانچے، کاٹھ کباڑ، شیشوں کے ٹکڑے اور نہ جانے کیا کیا وہاں پڑا ہوا تھا..... سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ لڑکی اس طرف کیوں آئی ہے..... بالآخر اُس نے ایک جگہ کادروک دی۔ میں شدید حیران تھا۔ لڑکی کو بہر حال یہ اندازہ ہو ہی گیا ہو گا کہ میں اُس کا تعاقب کر رہا ہوں۔ لیکن وہ میری طرف متوجہ ہی نہیں ہو رہی تھی۔ پھر میں اپنی کار اُس کی کار سے دس گز کے فاصلے پر روک کر نیچے اتر آیا۔ میں پستول ہاتھ میں لئے اُس کی چھت پر جس سے میں یہاں تک پہنچا تھا، کہنی رکھ کر کھڑا ہو گیا۔ لڑکی نے ڈرائیور کو یہاں کار سے نیچے اُتار لیا تھا۔ کمبخت نے دماغ خراب کر کے رکھ دیا تھا۔ نہ جانے کیوں اُسے میری طرف سے کوئی خطرہ محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ وہ خاموشی سے ڈرائیور کو دیکھتی رہی اور ڈرائیور خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتا رہا۔

”بہتر یہ ہے کہ تم اپنی زبان کھول دو..... تمہیں زبان کھولنی پڑے گی۔ اور اگر.....“

”آپ یقین کریں مس! مم..... میں اس سلسلے میں کچھ نہیں جانتا۔ ابھی وہ صاحب بھی مجھ سے اس بارے میں پوچھ رہے تھے۔ مم مگر میں تو بے گناہ ہوں۔ میں نے تو اُسے نہیں مارا..... میں تو بس! ڈرائیور کی حیثیت رکھتا ہوں۔ وہ کیا کرتے ہیں؟ اس سے مجھے کبھی کوئی سروکار نہیں رہا۔“ ڈرائیور نے گڑگڑاتے ہوئے کہا۔

لڑکی گہری نگاہوں سے اُسے دیکھنے لگی۔ پھر اُس نے کہا۔ ”ان تینوں کے بارے میں مجھے بتاؤ! اُن کے نام کیا ہیں؟“

ڈرائیور نے تین نام دہرا دیئے تھے۔ میری سمجھ میں نہ تو نام آئے اور نہ اُن کے پتے۔ لیکن میں لڑکی کے سلگتے ہوئے چہرے کو دیکھ رہا تھا۔ اُس کا انداز ایسا تھا جیسے وہ اپنے آپ پر قابو پانے کی کوششوں میں مصروف ہو۔

”انہوں نے اُسے کیوں قتل کیا؟“ اُس نے آہستہ سے کہا۔

”وہ..... وہ مسٹر بیل کیروسا کے مشن کے مخالف تھے اور بیل کیروسا کی سرگرمیوں کو روکنا چاہتے تھے۔“

”اب وہ کہاں ہیں؟“

”میں نہیں جانتا۔ میں نے اُنہیں ایک عمارت میں چھوڑا تھا۔ اور وہیں سے انہیں لینا تھا۔ لیکن وہ صاحب..... میرا مطلب ہے وہ.....“ ڈرائیور نے میری طرف اشارہ کیا اور لڑکی کی نگاہیں صرف ایک لمحے کے لئے میری طرف اُٹھیں اور اسی لمحے ڈرائیور نے ایک طرف چھلانگ لگا دی تھی۔ ڈرائیور کی یہ حرکت بالکل غیر متوقع تھی۔ لڑکی ایک لمحے میں سنبھل گئی اور اُس نے بھی ڈرائیور کے عقب میں چھلانگ لگا دی تھی۔ ڈرائیور کافی آگے نکل چکا تھا۔ لیکن لڑکی نے پستول کی گولی ڈرائیور کے دماغ میں اُتار دی..... اُس نے صرف ایک ہی فارر پر اکتفا نہیں کیا تھا، بلکہ پے درپے فارر کر کے اُس نے اپنا پورا پستول خالی کر دیا اور خونی نگاہوں سے دم توڑتے ہوئے ڈرائیور کو دیکھتی رہی۔ ڈرائیور نے دو چار بار ہاتھ پاؤں مار کر دم توڑ دیا تھا۔ میں اس پورے ڈرامے کا خاموش تماشا بن رہا تھا۔ لیکن مجھے شبہ ہو گیا تھا کہ اب لڑکی میری طرف توجہ ضرور دے گی۔ چنانچہ مجھے اپنے بچاؤ کا بندوبست کرنا تھا۔

وہ چند لمحات وہیں کھڑی رہی۔ پھر وہاں سے پلٹی۔ لیکن میں نے محسوس کیا کہ وہ لنگڑا رہی ہے۔ تب ہی میری نگاہ اُس کی پنڈلی پر پڑی جو زخمی تھی اور اُس سے مسلسل خون بہہ رہا تھا۔ نہ جانے کیوں میرے دل میں اُس کے لئے ہمدردی کا جذبہ اُبھرا۔ یا تو یہ ہمدردی کا جذبہ تھا یا پھر میری شیطنت جو اب باقاعدہ میرے ذہن میں سرایت کر گئی تھی۔ اور ہر وقت میری نگاہوں میں ایش کی متعارف کردہ کاک ٹیل گھومنے لگتی تھی۔ شاید اب میں کاک ٹیل کا عادی ہوتا جا رہا تھا..... میں نے جیب سے رومال نکالا اور تیزی سے اُس کے قریب پہنچ گیا۔ لڑکی مجھے دیکھ کر ٹھٹکی۔

میں نے اُس کی پنڈلی کے زخم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”خون بہہ رہا ہے۔ اگر مجھے اجازت دو تو میں اس پر یہ رومال کس دوں.....“

لڑکی رُک کر تھکی تھکی نگاہوں سے مجھے دیکھنے لگی۔ اور پھر اُس نے گردن جھکا دی۔ میں نے اُس کے قریب بیٹھ کر اُس کے زخم پر رومال کس دیا تھا۔ زخم خاصا گہرا تھا۔ اور شاید کچھ نیس بھی کٹ گئی تھیں کیونکہ چند ہی منٹ کے بعد رومال خون آلود ہو گیا تھا۔ میں نے لڑکی سے کہا۔

”اپنی کار کی چابی مجھے دے دو۔ یہ اُن لوگوں کی کار ہے۔ اسے یہیں چھوڑ دیتے ہیں۔“

یہاں سے فوراً کسی ڈاکٹر کے پاس چلتے ہیں۔ تمہارے پاؤں کی بینڈج کرانا بے حد ضروری ہے۔“

اُس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بس! ایک لمحے کے لئے اُس کی آنکھوں میں ممنونیت کے جذبات اُبھرے تھے۔ میں نے سہارے کے لئے ہاتھ بڑھایا تو اُس نے اپنا سارا بوجھ میرے کندھے پر ڈال دیا اور اس بوجھ سے نہ جانے کیوں مجھے ایک خوشی کا سا احساس ہوا تھا۔ لڑکی شروع ہی سے مجھے اپنے دشمن کی حیثیت سے نظر انداز کرتی رہی تھی۔ گویا اُسے یقین تھا کہ میں جو کوئی بھی ہوں کم از کم اُسے نقصان پہنچانے کے درپے نہیں ہوں۔ میں کار کے قریب پہنچ گیا اور پھر میں نے اُسے احتیاط سے ڈرائیور سیٹ کے برابر بٹھا دیا اور خود ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ واپسی کے راستے میں ہم دونوں نے کوئی گفتگو نہیں کی تھی۔

شہر کے ایک مخصوص حصے میں پہنچ کر لڑکی نے کہا۔ ”وہ اُس طرف ہاسپٹل ہے۔ براہ کرم! گاڑی اُس طرف لے چلو۔“

میں نے خاموشی سے گاڑی ہسپتال کی جانب موڑ دی۔ ہسپتال کے خصوصی شعبے میں لڑکی کے زخم کی بینڈج کرائی گئی۔ ڈاکٹر سے ہم نے کہا تھا کہ اتفاقہ طور پر ایک تیز دھار چیز سے پاؤں ٹکرا گیا، جس سے یہ گہرا زخم آیا ہے۔ ڈاکٹر نے کہا کہ خون زیادہ بہہ جانے کی وجہ سے نقاہت ہو گئی ہے۔ بہتر ہے کہ ہسپتال کے کسی کمرے میں ایک گھنٹہ آرام کر لیا جائے۔ میں نے لڑکی سے پوچھے بغیر ڈاکٹر سے کمرے کی تفصیلات حاصل کر لی تھیں اور پھر لڑکی کو لے جا کر کمرے میں لٹا دیا گیا۔ میں اس کے تیماردار کی حیثیت سے اُس کے ساتھ تھا۔ ہمارے درمیان اب تک مسلسل خاموشی تھی۔ اور اس بات کو ہم دونوں ہی محسوس کرتے رہے تھے۔ لیکن کسی نے بھی بولنے میں پہل نہیں کی تھی۔

جب نرس، لڑکی کو بستر پر منتقل کر کے باہر چلی گئی تو اُس نے میری طرف دیکھا اور مسکرا پڑی۔ پھر وہ آہستہ سے بولی۔ ”میرا نام کیمکی کیروسا ہے۔“

”اور مجھے لوگ مون کہتے ہیں۔“ میں نے جواب دیا۔

”میں جانتی ہوں۔“ وہ آہستہ سے بولی۔

”کیا مطلب؟“ میں نے چونک کر پوچھا۔ اور پھر دفعۃً خود ہی چونک پڑا۔ ”کیا نام

بتایا تم نے، کیمکی کیروسا؟“

”ہاں! بیل کیروسا میرا بھائی تھا۔“ کیمکی نے آہستہ سے کہا۔ اور اب مجھے احساس ہوا کہ مجھے اُس کے خدوخال جانے پہچانے کیوں محسوس ہو رہے ہیں؟ کیمکی کے چہرے میں بیل کیروسا کی جھلکیاں موجود تھیں۔ میں عجیب سی نگاہوں سے اُسے دیکھنے لگا۔

اُس کی آنکھوں کی کوروں سے آنسو پھوٹ پڑے۔ اُس نے ایک سسکی لی اور آہستہ سے بولی۔ ”ہاں! وہ میرا بھائی تھا۔ وہ..... وہ.....“ اُس کی آواز سسکیوں میں ڈوب گئی۔

میں خاموشی سے اُسے دیکھتا رہا تھا۔ اب صورت حال میرے علم میں آئی تھی۔ چند لمحات مسلسل خاموشی رہی۔ فوراً ہی اُس سے یہ سوال کرنا مناسب نہیں تھا کہ بیل کیروسا کا مشن کیا ہے؟ بہر طور! مجھے اُس سے ہمدردی ہو گئی تھی۔ تب میں نے کہا۔ ”کیا تم بیل کیروسا کے ساتھ نہیں تھیں؟“

”نہیں..... میں خاموشی سے اُس کا تعاقب کر رہی تھی۔ وہ بہت ہی ضدی انسان تھا۔ عجیب و غریب شخصیت کا مالک..... یہ نہیں سوچتا تھا کہ وہ جو کام کرنے جا رہا ہے، اس میں اُسے کیا مشکلات پیش آسکتی ہیں؟ اپنے آپ کو خطرات میں جھونک دینا اُس کی فطرت تھی۔ زیادہ سخت گیر بھی نہیں تھا۔ لڑائی بھڑائی سے بھاگتا تھا۔ لیکن..... لیکن.....“ وہ پھر سسک کر خاموش ہو گئی۔

”مجھے انتہائی افسوس ہے مس کیمکی!“

”تم..... تمہارے بارے میں مجھے اندازہ تھا۔ تم اُسے تیوالی میں ملے تھے نا؟ اور پھر وہ تمہیں اپنے ساتھ لے آیا تھا۔ میں اُس کے ایک ایک قدم سے آگاہ ہوتی تھی۔ لیکن میری بد نصیبی! بس تھوڑی دیر کے لئے میں اُس سے جدا ہو گئی اور اس دوران وہ سب کچھ ہو گیا جس نے میرے بھائی کو مجھ سے چھین لیا..... کیا کرتی میں اس کے لئے..... کیسے اُسے روکتی ان فضول باتوں سے؟“

”کیا تم مجھے یہ بتانا پسند کرو گی کبھی کہ اصل مسئلہ کیا تھا؟“

”سب کچھ بیکار ہے۔ میں اپنے بھائی کا انتقام لینا چاہتی ہوں۔ میں..... میں اُس کے انتقام کے لئے تڑپ رہی ہوں۔ مجھے اُن لوگوں کا پتہ درکار ہے۔ وہ مجھے مل جائیں تو اُس کے بعد..... اُس کے بعد.....“ وہ خاموش ہو گئی۔ میں اُس کے چہرے پر لرزتے ہوئے سائے دیکھتا رہا۔ شدید غصے کا شکار ہو گئی تھی وہ۔ ویسے یہ اندازہ میں نے لگا لیا تھا کہ کافی

میں نے اپنے اُن پر جوش الفاظ کے تاثرات کبھی کے چہرے پر دیکھے۔ اُن کی آنکھوں میں ممنونیت کے جذبات اُبھر آئے تھے اور میں دل ہی دل میں اپنی تقدیر پر دانت پیس رہا تھا جو بہر طور! دنیا کی ہر چیز مجھے مہیا کر سکتی تھی، لیکن سکون نہیں دے سکتی تھی۔ کبھی ان الفاظ کے بعد میری گرویدہ ہو گئی۔ ایک ڈیڑھ گھنٹے بعد ڈاکٹر نے اُسے اجازت دے دی کہ اگر وہ چاہے تو یہاں سے جاسکتی ہے۔ لیکن اسے کم از کم تین دن چلنے پھرنے سے گریز کرنا ہوگا۔ ڈاکٹر کی ہدایات اور دواؤں کے نسخے کے ساتھ ہم لوگ ہسپتال سے باہر نکل آئے۔ میں نے کبھی سے اُس کی رہائش گاہ کے بارے میں پوچھا تو وہ کہنے لگی۔

”میں جانتی ہوں مون! کہ تمہارے پاس بھی کوئی رہائش گاہ نہیں ہے اور تم بیل کے ساتھ قیام پذیر تھے۔ لیکن میں نے اپنے لئے ایک پرائیویٹ رہائش گاہ حاصل کر لی ہے۔ ہم لوگ وہیں چلتے ہیں۔“ یہ پرائیویٹ رہائش گاہ ایک چھوٹا سا فلیٹ تھی، جس میں ایک بوڑھی عورت رہتی تھی۔ کبھی نے اس فلیٹ کی تفصیل مجھے بتاتے ہوئے کہا۔ ”اس فلیٹ کی جو مالکہ ہے، وہ ایک ڈیری فارم میں ملازمت کرتی ہے اور وہاں حساب کتاب کا خیال رکھتی ہے۔ شام کو آتی ہے تو اپنے کمرے میں جا پڑتی ہے۔ میں نے اس سے مناسب معاوضے پر دو کمرے حاصل کر لئے ہیں۔ بہت اچھی عورت ہے۔ نہ کسی کے معاملات میں مداخلت کرتی ہے اور نہ اپنے آپ کو کوئی مسئلہ بنا کر پیش کرتی ہے۔ یہ جگہ ہمارے لئے بہت بہتر ہے کیونکہ اس طرف کسی کی توجہ نہیں جاسکتی۔“

”ہوں..... ٹھیک ہے کبھی! اگر تم اس سے مطمئن ہو تو مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے؟“

”یہ کمرہ تم لے لو۔ میں دوسرے کمرے میں رہنے لگوں گی۔“

”اور اگر بوڑھی عورت نے میرے بارے میں تم سے سوال کیا تو؟“

”تو میں کہہ دوں گی کہ تم میرے دوست ہو اور میرے ساتھ ہی قیام کرو گے۔“

مشرقی دنیا کے لئے یہ بات کسی طرح قابل قبول نہیں ہو سکتی کہ کوئی نوجوان لڑکی اپنے کسی دوست کے ساتھ کسی فلیٹ میں آکر رہنے لگے۔ لیکن یہاں اس کا تو تصور ہی نہیں تھا۔ میرا اس بارے میں سوچنا ہی بیکار ثابت ہوا۔ کبھی کو میں نے آرام کرنے کے لئے کہا اور خود دوسرے کمرے میں آ گیا۔

چار دن اسی طرح گزر گئے۔ ہمارے درمیان کافی بے تکلفی قائم ہو چکی تھی اور کبھی نے

خطرناک لڑکی ہے۔ یقینی طور پر بیل کیروسا کے قاتلوں کو نقصان پہنچائے گی۔ لیکن اب میرا اُس کے ساتھ کیا کام تھا؟ کبھی نے تھوڑی دیر تک خاموش رہنے کے بعد میری جانب نگاہیں اٹھائیں اور بولی۔

”مگر تم کون ہو مون! اور تم.....“

”بس کبھی! ایک آوارہ گرد ہوں۔ ایک سیاح ہوں۔ دنیا گردی کرتا پھر رہا ہوں۔ اور

تقدیر مجھے طرح طرح کے تماشے دکھا رہی ہے۔“

”میرا ساتھ دو گے؟“ اُس نے سوال کیا۔

”کیا چاہتی ہو مجھ سے؟“

”بس! اس انتقام میں میری مدد کرو..... مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔ اگر تم

نے..... اگر تم نے میرا ساتھ دیا تو میں تا زندگی تمہاری احسان مند رہوں گی۔ سمجھے؟ میں تنہا

ہوں۔ اُس کے علاوہ کوئی سہارا نہیں تھا۔ اور اب اس کے بعد میرا اور کوئی سہارا نہیں ہے۔

مجھے بس اس وقت تک سہارا دو جب تک کہ میں اپنے بھائی کے قاتلوں سے انتقام نہ لے

لوں۔ میں جانتی ہوں یہ آسان کام نہیں ہے۔ اور کوئی بھی شخص جو ایک امن پسند آدمی ہو،

ایسے معاملات میں ٹانگ پھنسانا پسند نہیں کرے گا۔ لیکن نہ جانے کیوں میرا دل چاہتا ہے

کہ میں تم سے مدد کی درخواست کروں۔ بولو! میری مدد کرو گے؟“

میں دل ہی دل میں ہنس پڑا۔ میں نے سوچا کہ اگر میں دل سے کچھ نہ کرنا بھی چاہوں

تو حالات میرے کان پکڑ کر میرا رخ اسی جانب کر دیں گے جدھر اُن کی مرضی ہوگی۔

چنانچہ محترمہ! میں تمہیں مایوس کیوں کروں؟ اب فیصلہ کرنے میں مجھے زیادہ دقتیں نہیں ہوتی

تھیں۔ تاہم میں نے اپنا فیصلہ سنانے کے ساتھ ساتھ وہ اداکاری بھی کی جو اُسے متاثر کر

سکتی تھی۔ میں نے آہستہ سے کہا۔

”مس کبھی! ہر چند کہ بیل کیروسا سے میرا زیادہ واسطہ نہیں رہا۔ بہت ہی مختصر ملاقات

ہوئی تھی میری اُس سے۔ لیکن میں اپنی ذات سے ایک ایسی لڑکی کو مایوس نہیں کر سکتا جو

اپنے بھائی کے قاتلوں سے انتقام لینا چاہتی ہے۔ میں خلوص دل سے تمہارا ساتھی ہوں۔

اور اطمینان رکھو! میرے لائق جو بھی خدمت تمہارے ذہن میں آئے گی، میں اُسے انجام

دے کر خوشی محسوس کروں گا۔“

مجھے اچھی طرح اپنا گرویدہ بنالیا تھا۔ اب میں اُس کے لئے سب کچھ کرنے کو تیار تھا۔ یوں تو ماضی کی بہت سی داستانیں میرے ذہن میں گردش کرتی رہتی تھیں۔ بہت سے لوگوں کے احسان تھے مجھ پر۔ لیکن اب میں اخلاقی حدود کو بہت زیادہ اہمیت دینے کا قائل نہیں تھا۔ دنیا اسی رنگ میں جیتی تھی اور میں بھی اسی رنگ میں جینا چاہتا تھا۔

پانچویں دن کیمی نے مجھ سے کہا۔ ”مون! میں اب بالکل ٹھیک ہو گئی ہوں۔ تم چاہو تو میرا زخم کھول کر دیکھ لو۔ پوری طرح کھرند جم گیا ہے اور اب نقاہت بھی باقی نہیں رہی۔ اور رہتی بھی کیسے؟ تم جیسا تیماردار۔ تمہیں تو ڈاکٹر ہونا چاہئے تھا مون!“

”مقصد ڈارلنگ! مقصد.....“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا اور کیمی کا چہرہ سُت گیا۔

”میں ایک ہی مقصد کے لئے جی رہی ہوں ڈیر مون! اور اب میں اس کی تکمیل چاہتی ہوں۔ یعنی اپنے بھائی کے قاتلوں سے انتقام۔“

”اصولاً یہ سوال مجھے تم سے نہیں کرنا چاہئے کیمی! لیکن مجبوری ہے۔ اپنے آپ کو باز نہیں رکھ سکتا۔ آخر بیل کیروسا کا مشن کیا تھا؟ وہ کرنا کیا چاہتا تھا؟“

میرے اس سوال پر کیمی کسی گہری سوچ میں ڈوب گئی۔ غالباً وہ بیل کیروسا کے مشن کے بارے میں تفصیلات بتانے کے لئے مناسب الفاظ تلاش کر رہی تھی۔ میں انتظار کرتا رہا۔ کیمی کسی گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد اُس نے کہا۔ ”بیل کیروسا نے کبھی مجھے اپنے مشن کی تفصیلات نہیں بتائیں۔ لیکن پچھلے کافی عرصے سے وہ کچھ پراسرار لوگوں میں پھنسا ہوا تھا۔ رات کی تاریکیوں میں وہ لوگ اس سے ملاقات کرنے آتے تھے اور بیل گھنٹوں اُن کے ساتھ بیٹھا باتیں کرتا رہتا تھا۔ پھر میں نے اُسے کچھ پریشان محسوس کیا اور میں خود بھی پریشان ہو گئی۔ بیل عام حالات میں ایک ہنس مکھ انسان تھا۔ لیکن ان دنوں اس پر جھنجھلاہٹیں سوار رہتی تھیں۔ اور ایک دن اُس نے انتہائی سرد لہجے میں مجھ سے کہا کہ مجھے ان جھگڑوں میں نہیں پڑنا چاہئے۔ اس سے اسے پریشانی ہوتی ہے۔ بیل نے کبھی مجھ سے اس لہجے میں گفتگو نہیں کی تھی مون! یہ بھی اُس کی پریشانیاں تھیں، جنہوں نے اُس سے اُس کی خوش مزاجی چھین لی تھی۔ وہ ایک مخلص اور شرمیلا انسان تھا۔ لیکن اب اُس کی کیفیت میں کافی تبدیلیاں آ گئی تھیں۔ پھر وہ ڈنمارک چل پڑا۔ اور میں نے اُس کا تعاقب شروع کر دیا۔ میں نے بارہا چند افراد کو اُس کے گرد چکراتے دیکھا تھا۔ لیکن اُسے چونکہ خود

بھی میری آمد کی خبر نہیں تھی اس لئے دوسرے لوگ بھی میرے بارے میں نہیں جان سکے۔ یہ تفصیلات مجھے بیل کیروسا نے نہیں بتائیں بلکہ میں نے اس سلسلے میں جو معلومات حاصل کیں اُن سے مجھے بیل کے مشن کے بارے میں تھوڑا بہت معلوم ہو گیا اور میں جو کچھ تمہیں بتا رہی ہوں، انہی اپنی معلومات کی بنا پر بتا رہی ہوں۔

”تفصیلات؟“ میں نے سوالیہ نگاہوں سے کیمی کو دیکھا اور اُس کی آنکھیں گہری سوچ میں گم ہو گئیں۔ غالباً وہ اُن واقعات کی کڑیاں جوڑ رہی تھی جن سے بیل کیروسا منسلک تھا۔

☆.....☆.....☆

کیمی نے بیل کیروسا کی جو کہانی سنائی، وہ بے حد اُبھی ہوئی تھی۔ بقول اُس کے اب کیمی کا اس دنیا میں کوئی نہیں تھا اور وہ اُس کے قاتلوں سے انتقام بھی لینا چاہتی تھی۔ کیمی نے جس مظلومانہ انداز میں مجھ سے اپنے بھائی کے قاتلوں کے خلاف مدد کی درخواست کی تھی، جس طرح اُس کی آنکھوں میں اُمید کے چراغ روشن ہوئے اور جس طرح اُس کے ہونٹوں کی مسکان مجھے اپنی جانب راغب کرتی تھی، ان تمام چیزوں کے تحت تو یہی ہونا چاہئے تھا کہ میں اُس کی مدد پر آمادہ ہو جاتا اور مجھ جیسا احمق مددگار کیمی کو بھلا اور کہاں مل سکتا تھا جو اپنی حماقتوں کے ساتھ ساتھ کامیابی کی خبریں بھی سناتا۔ بلاشبہ آج تک یہی تو ہوا تھا۔ میری اپنی کاوشوں کو کسی بھی معاملے میں کوئی دخل نہیں تھا۔ لیکن بے شمار لوگ مجھ سے فیض یاب ہو چکے تھے۔ یہاں تک کہ آخری مرحلہ بھی حل ہو گیا تھا۔ یعنی مسٹر لیری کنگ وہ فارمولا حاصل کر چکے تھے جو اُن کی زندگی کا سب سے بڑا مقصد تھا۔ اور ریڈ اسنیک کی گردن اونچی ہو گئی تھی۔ لیکن میں اپنی گردن سنبھالنے کی فکر میں تھا۔ اس لئے بھلا کسی اور کا کیا ساتھ دیتا؟ یہی کیفیت کیمی کی تھی۔ اب از سر نو کوشش کر کے بیل کیروسا کے قاتلوں کو تلاش کیا جائے اور اُس کے بعد اُن سے ہنگامہ آرائی کی جائے تاکہ کیمی کو سکون مل سکے۔ لیکن بھائی! ایک غریب، ایک مظلوم ان تمام مسائل کے حل کے لئے دنیا میں نہیں آیا تھا۔

میں حاتم طائی ”جدید“ نہیں بننا چاہتا تھا۔ لیکن حالات مجھے حاتم طائی ہی کی مانند کسی نہ کسی ایسی جگہ لے جاتے جہاں ایک سوال میرا منتظر ہوتا تھا۔ کیمی اپنی کہانی سننے کے بعد دیر تک روتی رہی اور اخلاقیات میں اُسے تسلیاں دیتا رہا۔ اُس کے بعد لازمی طور پر اُسے نیند آ جاتی اور میں بھی سو جاتا۔ لیکن ان حالات میں سو کر صبح جاگنے کا مطلب یہ تھا کہ میں نے کیمی کی ذمہ داریاں قبول کر لی ہیں اور اس کے بعد یہ ممکن نہیں تھا کہ میں اُس سے راہ فرار حاصل کر لیتا۔ چنانچہ جب وہ گہری گہری سانسیں لینے لگی تو میں اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ فیصلے کا یہی

وقت تھا۔ اگر جذباتی لمحے مزید جذباتی ہو جاتے تو اُن کی بہت بڑی قیمت ادا کرنی پڑتی اور اس وقت..... آہ! مجھے سکون درکار تھا۔ ایک طویل ہنگامہ میری زندگی میں شامل رہا تھا۔ کاش! سکون کے کچھ لمحات میسر آ جائیں..... ذہن میں بہت سے خیالات آنے لگے۔ تانے بانے بننے لگے۔ اور میں کوئی صحیح فیصلہ کرنے سے قاصر رہا۔ لیکن ایک فیصلہ میں نے ضرور کیا تھا۔ وہ یہ کہ فوراً یہاں سے اُٹھوں، بوریا بستر سنبھالوں اور باہر نکل جاؤں۔ کیونکہ دوسری صبح کیمی یقیناً اپنے اُن مسائل کا حل مجھ سے مانگے گی اور مجھے اُس سے کوئی نہ کوئی وعدہ کرنا پڑے گا۔ بہتر یہ ہے کہ مزید جھوٹ بولنے سے بچا جائے۔ چنانچہ میں نے اپنا مختصر سا سامان اُٹھایا، کیمی پر ایک الوداعی نگاہ ڈالی اور وہاں سے باہر نکل آیا۔

سڑکیں سنسان پڑی تھیں۔ اکا دکا ٹریفک نظر آ رہا تھا۔ میں ان ویران سڑکوں پر چلتا رہا۔ اور پھر ایک ہوٹل کے سامنے رُک گیا جس کی رونقیں دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ اس علاقے میں رات ہی نہیں ہوئی اور باقی رات گزارنے کے لئے اس سے بہتر اور کوئی جگہ نہیں تھی۔

دل میں بار بار یہ احساس بھی جاگ رہا تھا کہ صبح جب کیمی مجھے اپنے نزدیک نہیں پائے گی تو اُس کی آنکھوں میں اُمیدوں کے چراغ بجھ جائیں گے اور وہ ایک بار پھر اپنے آپ کو اس دنیا میں تنہا محسوس کرے گی۔ لیکن میں اس سلسلے میں اور کیا کر سکتا تھا؟ کسی کی تنہائیاں دُور کرنا صرف میرا ہی کام تو نہیں رہ گیا تھا۔ اور بھی بہت سے صاحب دل اور صاحب حیثیت لوگ تھے اس دنیا میں۔ وہ کسی اور کا ہاتھ بھی پکڑ سکتی تھی۔ میں ایک بے وقوف ہی اس دنیا کو کیوں مل گیا ہوں؟

میں اپنے آپ کو تسلیاں دیتا رہا۔ اور اُس کے بعد یہ سوچنے لگا کہ اب مجھے کیا کرنا چاہئے؟ لا تعداد لوگ اس دنیا میں میری جان کے دشمن تھے۔ ہر شخص اپنے اپنے چکر میں تھا۔ مسٹر لیری کنگ مجھے ریڈ اسنیک کا سربراہ بنانا چاہتے تھے۔ اُن کے خیال میں اُن کے ہاتھ ایک نا تراشیدہ ہیرا لگا تھا اور وہ اس ہیرے کی تراش خراش کر رہے تھے۔ لیکن یہ نہیں جانتے تھے کہ اس تراش خراش کے چکر میں ہیرے کا کیا حشر ہوا ہے۔ بھلا مجھے کیا ضرورت پڑی تھی کہ مجرموں کے کسی گروہ کا سربراہ بنتا۔ چنانچہ میں نے فوری طور پر فیصلہ کیا کہ یہ علاقہ چھوڑ دیا جائے۔

کوپن ہیگن کے راستے دنیا کے مختلف گوشوں کو نکالا جاسکتا تھا۔ لیکن میں نے فیصلہ کیا کہ کوپن ہیگن کے قریب ترین علاقے سویڈن نکل جاؤں جس کی لاتعداد روایتیں میرے علم میں تھیں۔ میرے لئے دنیا کا کوئی بھی حصہ کسی خصوصی حیثیت کا حامل نہیں تھا۔ بس! اپنے اس وجود کو جہاں جہاں بھی گھسٹتا پھروں۔ زندگی کی دلچسپیوں کا کوئی محور بھی نہیں تھا کہ اپنے آپ کو ادھر متوجہ کر کے تھوڑا سا ذہنی سکون حاصل کروں۔

میرے پاس جو رقم محفوظ تھی، اُسے با آسانی ٹریولرز چیک میں تبدیل کرایا جاسکتا تھا۔ سفر کے لئے یہ ٹریولرز چیک ہی موزوں ہوتے ہیں۔ چنانچہ میں نے اس سلسلے میں کارروائی شروع کر دی۔ اب یہ تمام کام میرے لئے مشکل نہیں رہے تھے۔ گیارہ بجے تک میں اپنی اس کارروائی سے فارغ ہو گیا اور ضروری معلومات حاصل کر کے بندرگاہ پہنچ گیا۔ بحیرہ بالٹک کی نم ہوائیں کانسی کی جل پری کو بوسے دیتی ہوئی گزر رہی تھیں۔ اسٹیمر بندرگاہ سے کافی دور نکل کر مالمو کی جانب رواں دواں تھا۔ اسٹیمر پر بہت سے افراد تھے جن میں مقامی اور سویڈش باشندے زیادہ تھے۔ لیکن میں نے کسی سے تعارف حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی۔

مالمو میں داخل ہونے کے بعد اپنے لئے کوئی صحیح فیصلہ کرنے کی آسانیاں مل گئی تھیں۔ میں نے ایک سیاح کی حیثیت سے وقت گزارنے کے لئے خود کو تیار کر لیا اور مالمو کے مرکزی چوک سے ٹرام میں سوار ہو کر آگے بڑھ گیا۔ پھر اسٹاک ہوم جانے والی شاہراہ پر اتر کر میں سست رفتاری سے آگے کا سفر کرنے لگا۔ اس علاقے کے بارے میں میری معلومات بہت زیادہ نہیں تھیں۔ لیکن میں چاہتا تھا کہ اب کسی طرح کی معلومات سے فائدہ نہ اٹھایا جائے۔ کیا مل جاتا ہے ان چیزوں سے.....

ابھی زیادہ دور نہیں گیا تھا کہ ایک کار میرے قریب آ کر رُکی۔ کار میں لمبے بالوں والے چند ہی سوار تھے۔ اُن میں سے ایک نے اپنے پیلے دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے مجھ سے لفٹ کے لئے پوچھا تو میں نے نیاز مندی کے انداز میں شانے جھکا دیئے اور پیوں نے مجھے کار سے اندر گھسیٹ لیا۔

کار میں موجود پیوں کی تعداد پہلے ہی زیادہ تھی۔ میں اُن میں شریک ہوا تو کار اندر سے مزید چھوٹی ہو گئی۔ جس میں پھیلی چرس کی بونے رہی سہی طبیعت بھی ہری کر دی۔ لیکن

وہ بدستور اپنی بدستیوں میں مصروف رہے۔ اور پھر ایک جگہ انہوں نے گاڑی روک دی۔ عجیب سی جگہ تھی۔ مجھے صحیح طور پر اندازہ نہیں ہو سکا تھا کہ میں کہاں ہوں..... چرس کے نشے میں ڈوبے ہوئے اُن لوگوں سے کسی سمجھداری کی توقع ہی نہیں تھی۔ میں بھی کار سے اتر آیا۔ وہ سارے بھی میرے ساتھ اترے تھے۔ لیکن بعد میں پتہ چلا کہ انہوں نے صرف مجھے اُتارنے کے لئے کار روکی ہے۔ مگر اُتارنے کا مقصد کیا تھا؟ یہ آج تک سمجھ میں نہیں آ سکا۔ جیسے ہی میں نیچے اُترا، وہ سب کار میں گھس گئے اور کار سٹارٹ ہو کر آگے بڑھ گئی۔

میں حیرت سے منہ پھاڑے جاتی کار کو دیکھ رہا تھا۔ ذہن میں طرح طرح کے دوسوے آ رہے تھے۔ کچھ دیر میں سڑک پر کھڑا رہا۔ اور اُس کے بعد آگے بڑھنا شروع کر دیا۔ دویا ڈھائی میل چلنے کے بعد مجھے ایک خوبصورت قصبہ نظر آیا۔ یہاں رُک کر کم از کم اپنے آپ کو گزشتہ تھکن سے نجات دلانی جاسکتی تھی۔ سیاحوں کے لئے چونکہ ضروری نہیں ہوتا کہ عمدہ قسم کے ہوٹلوں میں ٹھہریں بلکہ جہاں بھی موقع مل جائے، وقت گزار لیں۔ چنانچہ میں نے بھی وقت گزاری کے لئے ایک جگہ منتخب کر لی اور یہاں وقت خوب گزرا۔ نجانے کب تک سوتا رہا۔ دنیا کے ہر خوف، ہر خدشے سے بے نیاز گہری اور مست نیند آئی۔ اور جب جاگا تو بدن بری طرح ڈکھ رہا تھا۔ لیکن یہ عارضی بات تھی۔ اُٹھ کر دو چار انگڑائیاں لیں تو یوں محسوس ہوا جیسے پیدا ہوئے زیادہ دن نہیں گزرے۔

یہاں رُکنا بے کار تھا۔ چنانچہ میں نے فیصلہ کیا کہ اسٹاک ہوم پہنچ کر کسی اعلیٰ ہوٹل میں قیام کیا جائے۔ میں نے اسٹاک ہوم کے سفر کے بارے میں معلومات حاصل کیں تو پتہ چلا کہ یہاں سفر کا بہترین طریقہ یہی ہے کہ سڑک کے کنارے کھڑے ہو جاؤ..... کوئی نہ کوئی گاڑی لفٹ دے ہی دے گی۔ اہل یورپ کی اس فراخ دلی کا میں دل سے معترف ہوں۔ چنانچہ خاموشی سے سڑک پر نکل آیا اور کسی رہنما کا انتظار کرنے لگا۔ کافی دیر گزر گئی۔ اور اب میں مایوس ہونے لگا تھا کہ ایک وین کو اپنی طرف آتے ہوئے دیکھا۔ ڈرائیور کی نشست پر ایک بوڑھا کسان اور اُس کے برابر ایک لڑکی بیٹھی ہوئی تھی جس کی عمر اٹھارہ انیس سال سے زیادہ نہیں ہوگی۔ چہرے پر ایک عجیب سی بے بسی طاری تھی۔ وین میرے قریب آ کر رُکی اور بوڑھے کسان نے گردن نکال کر کہا۔ ”میں لاگن تک جا رہا ہوں۔ چلو گے؟“

نہ جانے کا کیا سوال تھا؟ میں پچھلا دروازہ کھولنے کے لئے بڑھا۔ لیکن لڑکی نے پر ہی سامنے کا دروازہ کھول دیا۔ گویا مجھے بھی بوڑھے اور لڑکی کے ساتھ اسی نشست پر بیٹھا تھا۔ میرے بیٹھتے ہی بوڑھے نے ایک جھٹکے سے وین آگے بڑھا دی۔ رات ہونے لگی تھی۔ سنسان سڑک ارد گرد پھیلے جنگل کی وجہ سے کچھ اور سنسان ہو گئی تھی۔

لاگن کا فاصلہ چھ یا سات میل سے زیادہ نہیں تھا۔ لیکن لاگن سے تین میل پہلے بوڑھے نے وین روک دی اور میری طرف دیکھتا ہوا بولا۔ ”اس سے آگے نہیں جاسکوں گا۔ کیونکہ میرا فارم یہاں سے تھوڑے فاصلے پر ہے۔ میں تمہیں یہیں چھوڑے دیتا ہوں۔“

میں نے بے بسی سے بوڑھے کی طرف دیکھا۔ کہنا چاہتا تھا کہ میں تو لاگن کا صحیح راہ بھی نہیں جانتا۔ لیکن اس بد بخت کسان نے مروا دیا تھا۔ اُترنے کے سوا چارہ ہی کیا تھا میں اُترا تو لڑکی بھی نیچے اُتر آئی جو بوڑھے کے برابر بیٹھی ہوئی تھی۔ میں اُس کے قریب بیٹھا رہا تھا۔ لیکن میں نے غور سے اُس کا چہرہ تک نہیں دیکھا تھا۔ اب پہلی بار اُسے دیکھ وہ کسی موٹے کپڑے کے گھٹیا سے سکرٹ میں ملبوس تھی۔ پیروں میں بھدے سینڈل اور ہار گرد میں اُٹے ہوئے تھے۔ کوئی آوارہ گرد قسم ہی کی چیز لگ رہی تھی۔ میں کچھ اور سمجھا تھا لیکن جب بوڑھے نے وین موڑی تو میرے منہ سے حیرت بھری آواز نکل گئی۔

”مس..... مس.....“ لیکن وین جا چکی تھی۔ ”وہ..... وہ آپ کو کیوں چھوڑ گئے؟“ میں نے لڑکی کی طرف دیکھ کر حیرت سے کہا۔

”جس طرح اُس نے تمہیں یہاں چھوڑ دیا، اسی طرح مجھے بھی.....“

”تو..... تو کیا؟“

”ہاں! میں بھی اُس سے لفٹ لے کر یہاں تک آئی ہوں۔“

”اوہ..... تو آپ کو بھی پیدل ہی قصبے تک جانا ہوگا؟“ میں نے کہا۔

”ہاں..... ظاہر ہے۔“ لڑکی نے جواب دیا۔

میں نے اپنا سفری بیگ اٹھایا اور ارد گرد کا جائزہ لینے لگا۔

”بڑا ہی بد اخلاق شخص تھا یہ۔ میں نے لاکھ خوشامد کی کہ مجھے لاگن تک چھوڑ دے۔ لیکن راستے بھر کمبخت یہی کہتا آیا کہ لفٹ دینا اچھی بات ہے اور نقصان اٹھانا بری بات۔ لڑکی نے آہستگی سے مجھے مخاطب کیا۔ ”اگر تم نہ مل جاتے تو اس تنہا اور ویران سڑک پر مل

خوف سے مر جاتی۔ مجھے یہ اندازہ نہیں تھا کہ وین اس قدر چھکڑا ہے اور اتنی سست رفتاری سے سفر کرتی ہوئی یہاں تک پہنچے گی۔ ورنہ میں کبھی اس سے سفر نہ کرتی۔ آہ..... اب تو رات ہو چکی ہے۔ کیا تم میرا ساتھ دو گے؟“

میں نے خونخوار نگاہوں سے ہونٹ سی لڑکی کو دیکھا۔ کمال کی بات ہے۔ ساری دنیا کی لڑکیوں کی اجارہ داری مجھ پر ہی ہو گئی ہے۔ اب ان کا ساتھ بھی دیا جائے۔ میں گہری سانس لے کر پر خیال انداز میں گردن ہلانے لگا۔ ”تمہیں لاگن کا راستہ معلوم ہے؟“ میں نے سوال کیا۔

”یہ سڑک سیدھی لاگن تک جاتی ہے۔“ اُس نے جواب دیا۔

”فاصلہ کتنا ہوگا؟“

”ڈھائی تین میل۔ یہ مائیلو کر اس کہلاتا تھا۔ دہنی سمت اُترنے کے بعد فارم ہی فارم تھے۔ بہت ہی خوبصورت علاقہ ہے۔“

”مجھے تو جنگلوں کے علاوہ کچھ نظر نہیں آ رہا۔ کیا ان جنگلوں میں درندے ہوتے ہیں؟“ میں نے سوال کیا۔

”ہاں..... کبھی کبھی یہاں بھیڑیے اور لکڑ بھگڑ نظر آ جاتے ہیں۔“ لڑکی نے جواب دیا اور میرے اوسان خطا ہو گئے۔

سڑک تا حد نگاہ سنسان اور تاریک تھی۔ دونوں کناروں پر دیو قامت درخت سڑک پر جھکے ہوئے اس سناٹے کو مزید وحشت ناک بنا رہے تھے۔ قصبے تک پیدل جانے کا تصور ہی ہولناک تھا۔ میں نے اس عجیب و غریب مصیبت کی طرف دیکھا جو خود بھی پریشان نگاہوں سے چاروں طرف دیکھ رہی تھی۔ اب یہ تو میری مرضی ہے کہ میں اس وقت بستی تک جانا پسند کروں، یا اس خوفناک سڑک پر سفر کرنے خطرہ مول نہ لوں۔ لیکن اس مصیبت خانم کا کیا، کیا جائے؟ میں سڑک پر آگے بڑھا تو وہ بھی میرے قدموں سے قدم ملا کر چلنے لگی۔

”مس.....!“ میں نے ایک جگہ رُک کر کہا۔

”میلیس براؤنسن.....“ اُس نے جواب دیا۔ حالانکہ میں نے اُس کا نام نہیں پوچھا تھا۔ بلکہ کچھ اور کہنا چاہتا تھا۔

”شکریہ مس میلیس براؤنسن! میں ایک سیاح ہوں اور لاگن کے بارے میں مجھے کوئی

خاص معلومات نہیں ہیں۔ لیکن میں آگے کا سفر نہیں کرنا چاہتا۔“

”اس وقت اس سڑک پر سفر کرنا مناسب بھی نہیں ہے۔“ اُس نے پرسکون لہجے میں جواب دیا اور میرا دماغ بھنا گیا۔ میں تو چاہتا تھا کہ کسی طرح اُس سے جان چھڑائی جائے لیکن وہ بہت زیادہ تعاون کا مظاہرہ کر رہی تھی۔ میں اُسے گھورنے لگا۔

”وعدہ کرتی ہوں، تمہیں پریشان نہیں کروں گی۔ آؤ پلیز.....“ اُس نے کہا تو میں نے تھکے تھکے قدم آگے بڑھا دیئے۔ میلسی میرے پیچھے پیچھے اُسی رفتار سے چلی آ رہی تھی۔ یہاں تک کہ گھنے درختوں کا خاتمہ ہو گیا۔ سامنے ایک ریتلا میدان نظر آ رہا تھا جس کے پرے ایک بہت بڑی پرسکون جھیل لہریں لے رہی تھی۔

میلسی نے آہستہ سے کہا۔ ”یہ جھیل میکونا ہے۔“

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ جھیل کے اطراف میں ریت پھیلی ہوئی تھی۔ میں جھیل کے کنارے تک آ گیا اور ایک ہموار جگہ منتخب کر کے وہیں ڈیرہ ڈال دیا۔ کھانے پینے کے لئے میں نے انتظامات کر لئے تھے۔ کیونکہ لفٹ لے کر سفر کرنے کے لئے ان اشیاء کی ضرورت ہوتی ہے۔ میرے سفری بیگ میں قیمہ، اُبلے ہوئے انڈے اور ڈبل روٹیاں وغیرہ موجود تھیں۔ میں پاؤں پھیلا کر لیٹ گیا اور میلسی میرے نزدیک ہی بیٹھ گئی۔ ایک بار پھر میں نے اُس کا جائزہ لیا۔ شکل و صورت اور حلقے سے وہ کوئی مفلوک الحال لڑکی نظر آتی تھی۔ دل تو چاہا کہ اُس کے بارے میں معلومات حاصل کروں۔ لیکن پھر اس خوف سے خاموش ہو گیا کہ یقیناً وہ کوئی ایسی کہانی سنائے گی جو دلدوز ہوگی اور پھر اُس کے بعد موٹے موٹے آنسو بہاتے ہوئے مجھ سے مدد کی درخواست کرے گی۔ یہ لفظ میری زندگی سے چپک کر رہ گیا تھا۔ اب یہی جی چاہتا تھا کہ کسی ویرانے میں سنیاس لے لوں اور پہاڑی کی چوٹی پر بیٹھ کر باقی عمروہیں گزار دوں۔ لیکن خوف یہ تھا کہ چوٹی سے اترنے کے بعد لوگ پھر میری طرف دوڑ پڑیں گے۔ ”ہماری مدد کرو۔“ یا پھر کوئی مجھے نھو، بدھو، خیراتی کہہ کر مجھ سے لپٹ جائے گا اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کرے گا کہ وہ میری خالہ کا سگا پھوپھی زاد بھائی ہے اور میری تلاش میں سرگرداں تھا کہ میں اُس کی مدد کروں.....

”خدا کی پناہ!“ میرے حلق سے ایک آواز نکلی اور میلسی چونک کر مجھے دیکھنے لگی۔

”کچھ کہا؟“ اُس نے سوال کیا۔

”نہیں محترمہ! بھلا یہ جرات کر سکتا ہوں؟“

”اب ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ میں خود بھی یہی سوچ رہی تھی۔“ اُس نے شرمائے ہوئے انداز میں کہا۔

”کیا؟“ میں نے منہ پھاڑ کر اُسے دیکھا۔

”جھیل کا پانی ساکن ہے۔ اور موسم بھی اتنا سخت نہیں ہے کہ نہایا نہ جاسکے۔“

”دماغ خراب ہو گیا ہے آپ کا؟ اس ویرانے میں آپ غسل فرمائیں گی؟“ میں نے غرائے ہوئے لہجے میں کہا۔

”تم بھی نہالو۔ دیکھو تو سہی! ہم لوگ کتنے گرد آلود ہو رہے ہیں۔“

”محترمہ! کسی سے گفتگو کرنے سے پہلے اس کے بارے میں جان لینا ضروری ہے۔ میں زیادہ بے تکلفی کا قائل نہیں ہوں۔“

”تمہاری مرضی ہے۔ میں تو ضرور نہاؤں گی۔“ اُس نے کہا اور اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑی ہوئی۔ میں سراسیمہ نگاہوں سے اُس پاگل لڑکی کو دیکھ رہا تھا۔ جھیل میں نہاتے ہوئے اگر ڈوب مری اور بچاؤ بچاؤ چیخنا شروع کر دیا تو کیا میں بھی پانی میں اُتروں گا؟ میرے ذہن میں یہ تصور آیا ہی تھا کہ وہ پلٹ کر مجھے دیکھنے لگی۔

”آ جاؤ! اگر سیاح ہو تو ایسی چیزوں سے اجتناب، آدابِ سیاحت کے خلاف ہے۔“

”تم جھیل میں ڈوب مرو۔ مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔“ میں نے کہا اور وہ ہنستی ہوئی آگے بڑھ گئی۔ اور اُس کے بعد مجھے آنکھیں بند کرنا پڑی تھیں۔ کیونکہ یورپین تہذیب ابھی میرے حلق میں ہی اٹکی ہوئی تھی۔ معدے میں نہیں اُتری تھی۔ پھر یورپین تہذیب جھیل میں داخل ہو گئی اور میں ریت پر لیٹ کر گہری گہری سانسیں لینے لگا۔ لڑکی کے بارے میں بار بار ذہن میں کریدی پیدا ہو جاتی تھی۔ لیکن میں اُس پر زیادہ توجہ نہیں دینا چاہتا تھا۔ ایک لمحے کے لئے تو میں نے یہ بھی سوچا کہ اپنا یہ سفری تھیلا اُٹھا کر لاگن کی طرف دوڑ لگا دوں۔ اس مصیبت سے یہیں جان چھوٹ جائے گی۔ اس سے پہلے کہ وہ رورو کر اپنی داستانِ غم سنائے، مجھے یہاں سے فرار ہو جانا چاہئے۔ لیکن دونوں طرف سے جنگلوں سے ڈھکی ہوئی سڑک پر چلنا اور وہ بھی تنہا بڑے دل گردے کا کام تھا چنانچہ اس کوشش سے باز رہا۔ پھر دفعۃً کچھ خیال آیا تو اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ تھیلے سے کھانے پینے کا سامان نکال کر پیٹ کا دوزخ

بھرنے لگا۔ اخلاقاً مجھے لڑکی کا انتظار کرنا چاہئے تھا۔ لیکن میں اب احمقانہ قسم کے اخلاق برت کر اپنا اخلاق خراب نہیں کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ جب تک وہ غسل سے فارغ ہو کر آئی میں اپنا معدہ بھر چکا تھا۔ اُس نے ایک نگاہ مجھ پر ڈالی اور پھر خاموشی سے ریت پر ایک سمت بیٹھ گئی۔ آہستہ آہستہ چاند نکل آیا تھا اور لڑکی کے ریشم کی طرح ملائم بال خشک ہو کر اُس کے چہرے پر بکھر گئے تھے۔ وہ خاموش اور اُداس بیٹھی درختوں کی طرف دیکھ رہی تھی۔ دفعہ ہی مجھے اُس پر رحم آ گیا۔ ”مس میلیسی.....“ اُس نے پلٹ کر میری طرف دیکھا۔ لیکن خاموش رہی۔ ”اگر آپ کچھ کھانا پسند کریں تو یہ چیزیں موجود ہیں۔“ اُس نے اب بھی کوئی جواب نہیں دیا۔ نجانے مجھے کیا سوچھی کہ میں کھانے پینے کی اشیاء لے کر اُس کے قریب پہنچ گیا۔

”آپ کو بھی بھوک لگ رہی ہو گی؟“ اُس نے شکایتی نگاہوں سے مجھے دیکھا۔ جیسے کہہ رہی ہو کہ اس دنیا میں بسنے والوں کے لئے اخلاق بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔ مجھے کم از کم اُس کا انتظار تو کر لینا چاہئے تھا۔ جانے کیوں ایک عجیب سی شرمندگی کا احساس ہوا۔ تب میں نے آہستہ سے کہا۔ ”دراصل مجھے بہت زور سے بھوک لگ رہی تھی۔ اس لئے آپ کی واپسی کا انتظار نہیں کر سکا تھا۔“

”کوئی بات نہیں۔ میرا آپ پر کوئی حق تو نہیں ہے۔ میں تو آپ کا نام بھی نہیں جانتی۔“

”جاننے سے کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔ آپ کو میرا نام لینے میں دقت ہو گی۔“

”کیوں؟“

”میرا نام منصور ہے۔“

”منصور.....“ اُس نے کہا اور میں آسمان کی جانب دیکھنے لگا۔ کسی یورپین لڑکی نے میرے نام کا صحیح تلفظ پہلی بار ادا کیا تھا۔ اُس نے کھانے کی اشیاء اپنی جانب سرکالیں اور پھر آہستہ سے بولی۔ ”تم شاید اس بات پر یقین نہ کرو کہ میں صبح سے بھوکی ہوں۔ میں نے ناشتہ بھی نہیں کیا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو میں تمہاری دی ہوئی اس بھیک کو کبھی قبول نہ کرتی۔“ فوراً ہی میرے دل میں سویا ہوا منصور جاگ اٹھا۔ ابھی تو اُس نے مجھ سے کوئی فرمائش بھی نہیں کی ہے۔ کسی قسم کی مدد کی درخواست بھی نہیں کی۔ پھر اُس کے ساتھ میرا یہ رویہ غیر

مناسب ہے۔ بعد میں اگر کچھ ہوا تو دیکھا جائے گا۔ لیکن ابھی کم از کم مجھے اخلاقی قدروں کو پامال نہیں کرنا چاہئے۔ میں نے اُس سے معذرت کر لی۔ وہ کھانے میں مصروف ہو گئی اور میں کچھ دیر چاندنی میں ادھر ادھر دیکھتا رہا۔ اور پھر لیٹ کر آنکھیں بند کر لیں۔ اُس نے کھانے سے فارغ ہونے کے بعد تمام اشیاء احتیاط کے ساتھ واپس تھیلے میں رکھ دیں اور کھسک کر میرے نزدیک آ گئی۔ میں دہشت سے سمٹ گیا تھا۔ لیکن میلیسی کے انداز میں ایسی کوئی بات نہیں تھی جو میرے لئے خوف کا باعث ہوتی۔ کمبخت ایش نے ایک عجیب کیفیت بیدار کر دی تھی میرے اندر۔ نجانے کیوں میں اُس کے ہاتھوں بے وقوف بن گیا تھا اور اُس کی خاندانی کاک ٹیل کا شکار ہو گیا..... اب بار بار مجھے وہ کاک ٹیل یاد آ جایا کرتی تھی اور اس وقت بھی پیانے میں چھلکتی ہوئی کوئی رنگین شے میری نگاہوں کے سامنے گردش کرنے لگی تھی۔ جھیل، چاندنی، خاموشی، سرد ہوائیں، نرم ریت، بھرا ہوا پیٹ اور سر پر کھلا آسمان جانے کیا کیا کیفیتیں بیدار کر رہا تھا۔ اُس نے گھٹنوں پر سر رکھا اور آنکھیں بند کر لیں۔ میرا جی چاہا کہ میں اُسے بھی آرام کے لئے کہوں۔ لیکن اپنی زبان سے کوئی ایسا جملہ ادا نہیں کرنا چاہتا تھا جو خود میرے لئے مصیبت کا باعث بن جائے۔

”مجھے سردی لگ رہی ہے۔“ اُس کے یہ الفاظ بھی میرے لئے مشکوک تھے۔

”ریت میں گرٹھا کھودو اور گردن نکال کر باقی بدن اُس میں ڈھک لو۔“

وہ میری بات کا برا ماننے کی بجائے ہنس دی۔ ”واقعی لطف آ جائے گا۔ دراصل میں جھیل میں نہائی ہوں نا اس لئے سردی زیادہ محسوس ہو رہی ہے۔“

”ہو سکتا ہے۔“

”تم کون کون سے ممالک کی سیاحت کر چکے ہو؟“

”یہ پوچھ کر مجھے غصہ مت دلاؤ۔“ میں نے جواب دیا۔

”کیوں؟“

”اس کا جواب بھی نہیں دوں گا۔“

”عجیب آدمی ہو۔ کیا نیند آ رہی ہے؟“

”ہاں.....“

”مگر مجھے نیند نہیں آرہی۔“

”تو پھر درخت کی کسی چوٹی پر بیٹھ کر مرغ کی اذان دینا شروع کر دو۔“ میں نے کہا اور وہ چونک کر مجھے دیکھنے لگی۔

”یوں محسوس ہوتا ہے جیسے تم ناراض ہو مجھ سے۔“

”اتنا راضی بھی نہیں ہوں محترمہ! آپ کو لاگن تک جانا ہے۔ آپ رات گزرنے کا انتظار کیجئے۔ صبح میں اور آپ لاگن پہنچ جائیں گے اور اس کے بعد دوبارہ نہ آپ مجھے دیکھیں گی اور نہ میں آپ کو۔“

”تمہارا تعلق کہاں سے ہے؟“

”جنہم سے۔“

”اوہ..... میرا بھی یہی خیال تھا۔“ اُس نے آہستہ سے کہا۔

”کیا مطلب؟“

”وہاں کے رہنے والے اتنے ہی بد اخلاق ہوتے ہیں۔“ وہ ہونٹ سکڑ کر بولی۔

”خوش اخلاقی کے مظاہرے بعض اوقات عذاب بن جاتے ہیں۔“

”ہو سکتا ہے یہ تمہارا تجربہ ہو۔“

”تمہارا کیا خیال ہے؟“

”کچھ نہیں۔ میں ان حالات کے بارے میں سوچ رہی ہوں جنہوں نے مجھے اور تمہیں

اس جگہ یکجا کر دیا ہے۔“

”چلو چھوڑو۔ لاگن میں تم کہاں رہتی ہو؟“

”اپنے دادا کے پاس..... میرے دادا بہت اچھے انسان ہیں۔“

”کیا کرتے ہیں وہ؟“

”کچھ نہیں۔ اُن کا فارم ہاؤس ہے۔ اور وہیں ہم نے اپنی رہائش گاہ بنا رکھی ہے۔

میری ایک بڑی بہن بھی ہے۔ بس! ہم تین ہی افراد ہیں۔“

میں نے لڑکی کی بات پر یقین نہیں کیا۔ جس حلقے میں وہ نظر آ رہی تھی، اُس سے تو یہی

احساس ہوتا تھا کہ اُس کا دادا کسی فارم ہاؤس میں صفائی کرنے والا ہوگا۔ بہر حال! اتنا

جھوٹ بولنے کا حق ہر اُس شخص کو ہوتا ہے جس کا کسی سے زیادہ تعلق نہ رہے اور سرسری

ملاقات کے بعد دونوں ایک دوسرے سے جدا ہو جائیں۔ میں خود بھی اگر چاہتا تو قیصر و لیم

بن سکتا تھا۔ اس کے بعد میں نے خاموشی اختیار کر لی۔ لڑکی کہنے لگی۔ ”اگر لاگن میں کچھ عرصہ قیام کرو تو میں تمہیں اپنے فارم ہاؤس میں جگہ دے سکتی ہوں۔“

”آپ کے فارم ہاؤس میں کتنی جگہ ہے؟“

”کافی ہے۔ ہم نے وہاں سوئمنگ پول بنا رکھا ہے۔ ہر چیز مہیا کر رکھی ہے۔ اپنے لئے

تم دیکھو گے تو خوش ہو جاؤ گے۔“

”اور ایک گاڑی نہیں خرید سکیں آپ۔ لفٹ لے لے کر سفر کرتی رہتی ہیں۔“ میں نے

طنزیہ انداز میں کہا۔

”ہمارے پاس تین گاڑیاں ہیں۔ ایک دادا جی کی، دوسری میری بہن کی اور تیسری

میری ہے۔ لیکن میں ذرا مختلف طبیعت کی مالک ہوں۔ بعض اوقات اس طرح آوارہ گردی

کرنے میں لطف آتا ہے۔ میں باقاعدہ سیاحت تو نہیں کر سکتی لیکن کبھی کبھی مختلف علاقوں

میں نکل جاتی ہوں اور وہاں گھومتی پھرتی ہوں۔“ وہ ہنس پڑی۔ ”شاید تم یقین نہ کرو کہ میں

نے بارہا بھیک بھی مانگی ہے۔ لوگوں سے کچھ مانگتے ہوئے کتنا مزہ آتا ہے۔ میں بیان نہیں

کر سکتی۔“

میں سر کھجا کر اُسے دیکھنے لگا تھا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ شے کیا ہے؟ بہر طور! باقی

رات سوتے جاگتے ہی گزری تھی۔ ہر لمحہ یہ احساس رہتا تھا کہ کہیں کوئی اور واقعہ رونما نہ ہو

جائے۔ لڑکی کی ایک بات پر بھی میں نے یقین نہیں کیا تھا۔ بکواس کر رہی تھی۔ اپنے حلقے

اور چہرے مہرے سے قطعی طور پر کسی اچھے خاندان یا کسی دولت مند دادا کی پوتی نظر نہیں

آتی تھی۔ ماں یا باپ کا اُس نے کوئی تذکرہ نہیں کیا تھا۔ لیکن میں نے پوچھنا بھی مناسب

نہیں سمجھا تھا۔ کیا فائدہ کسی کو کریدنے سے؟ خواجہ مصیبتیں ہی گلے پڑتی ہیں۔ زیادہ گفتگو

کروں گا تو زیادہ بے تکلفی پیدا ہوگی۔

وہ سو گئی..... گھٹنوں میں سر دے کر کسی معصوم بچی کی مانند۔ اور جب صبح کی پہلی کرن

نے میری آنکھوں کے پپوٹوں کو گدگدایا تو میں بھی جاگ گیا۔ رات کے کسی حصے میں گہری

نیند آ گئی تھی۔ لیکن صبح کی خنک کرنوں نے جگا دیا تھا۔ میں نے سوئی ہوئی میلیں کو دیکھا اور

رات کے واقعات کا تجزیہ کرنے لگا۔ تب مجھے احساس ہوا کہ ذہنی طور پر وہ بالکل بچی ہے۔

جو کچھ میں نے اُس کے بارے میں سوچا تھا، ممکن ہے اس میں کوئی حقیقت نہ ہو۔ بلاوجہ کسی

کوشلوک و شبہات کا نشانہ بنانا کوئی اچھی بات تو نہیں۔

وہ بھی جاگ کر جمائیاں لینے لگی۔ پھر اُس نے جھیل کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”کیا تم منہ ہاتھ بھی نہیں دھو تے؟“

میں چونک کر سیدھا ہو گیا۔ ”کیوں نہیں..... کیوں نہیں؟“ میں نے جھیل کے کنارے پہنچ کر بدن کے کھلے ہوئے تمام حصوں کو دھویا۔ وہ خود بھی مجھ سے کچھ فاصلے پر بیٹھ گئی تھی۔ اس کے بعد اُس نے واپس آ کر بے تکلفی سے میرے تھیلے کو کھول لیا اور میں ”ارے ارے“ کہتا ہوا اُس کی جانب دوڑ پڑا۔

”کیوں..... کیا ناشتہ نہیں کرو گے؟ مجھ سے تو بغیر ناشتے کے دو قدم بھی نہیں چلا جائے گا۔“

”تو ناشتہ لے کر چلنا چاہئے تھا نا محترمہ.....“

”چھوڑو! کیسی باتیں کر رہے ہو؟ تم لاگن چلو۔ جب یہاں سے آگے جاؤ گے تو میں اتنی اشیاء تمہارے ہمراہ کر دوں گی کہ تم دس آدمیوں کو اپنے ساتھ کھلا سکو گے۔“

”کیا تم واقعی لاگن تک میرے ساتھ جاؤ گی؟“

”کیوں.....؟ میں سمجھی نہیں۔“

”مطلب یہ کہ رات کو جو تم جھوٹ بول چکی ہو، اُسے نبھانا تمہارے لئے مشکل نہیں ہو گا؟“

”کیا کہا تھا میں نے؟“ وہ شرارت آمیز لہجے میں بولی۔

”دادا جی، فارم ہاؤس وغیرہ وغیرہ۔“

”اوہ! میں لوگوں کو ایسی کہانیاں سنانے کی عادی ہوں۔ مزہ آتا ہے جھوٹ بول کر۔“

”گڈ..... گڈ..... مجھے حقیقتیں ہی پسند ہیں اور وہ کہانی جو تم نے رات کو سنائی، مجھے اس پر ذرا بھی یقین نہیں آیا۔“

”تم ذہین آدمی معلوم ہوتے ہو۔ رہنے والے کہاں کے ہو؟“

”یہ سوال تم پہلے بھی کر چکی ہو اور میں نے تمہیں اس کا جواب نہیں دیا تھا۔“

”نہیں بتانا چاہتے تو نہ سہی۔ مجھے اتنی زیادہ دلچسپی بھی نہیں ہے۔ ویسے اب ہمیں چلنا چاہئے۔ آؤ.....“ میں نے اپنا سفری تھیلا کندھے پر لادا اور جوتے کے بند کس کر لڑکی کے

ساتھ ہولیا۔ ہم ایک بار پھر سڑک پر آئے اور آگے کا سفر کرنے لگے۔ سڑک سنسان پڑی ہوئی تھی اور دُور دُور تک کوئی ٹریفک نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ کہنے لگی۔ ”لاگن کے راستے سفر کم ہی ہوتا ہے۔ عموماً اس کر اس سے لوگ دوسری جانب مڑ جاتے ہیں یا پھر فارم ہاؤس کے رہنے والے کبھی کبھی بڑی شہری آبادیوں کا رخ کرتے ہیں۔ ویسے لاگن بہت خوبصورت قصبہ ہے۔ تمہیں وہاں پہنچ کر لطف آئے گا۔“

”میں لاگن میں زیادہ عرصہ قیام نہیں کروں گا۔ مجھے اسٹاک ہوم جانا ہے۔ ویسے ایک آدھ دن قیام کے لئے تم مجھے کوئی بہتر مقام بتا سکتی ہو؟“

”ہاں ہاں..... کیوں نہیں۔ وہاں بہت سے ایسے مقامات ہیں جہاں تم قیام کر سکتے ہو۔ اور پھر میں تو تمہیں اپنے ساتھ رہنے کی پیشکش کر ہی چکی ہوں۔ ہم پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔“

”مگر رات کی کہانی تو بقول تمہارے کہانی ہی تھی۔“

”تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟ آخر میں کہیں نہ کہیں تو رہتی ہی ہوں۔“ اُس نے کہا اور میں نے گہری سانس لے کر گردن ہلا دی۔

بالآخر ہم لاگن میں داخل ہو ہی گئے۔ اچھا خاصا بڑا قصبہ تھا۔ چھوٹے چھوٹے خوبصورت مکان درختوں اور کھیتوں میں گھرے نظر آ رہے تھے۔ ایک ذیلی سڑک پر مڑنے کے بعد اُس نے آہستہ سے کہا۔ ”جناب! میں آپ سے درخواست کرتی ہوں کہ کچھ وقت میرے غریب خانے پر ضرور گزار لیجئے۔ مجھے خوشی ہو گی۔“

میں چونک کر اُسے دیکھنے لگا۔ اندازہ لگا رہا تھا کہ اُس کے لہجے میں طنز پوشیدہ ہے یا پھر وہ سنی ہے؟ میں تفریحاً اُس کے ساتھ چل پڑا۔ ذیلی سڑک سے وہ ایک پگڈنڈی پر مڑی جس کے اختتام پر موٹے بانسوں سے بنا ہوا بڑا سا احاطہ تھا۔ اُس کی ظاہری شکل و صورت کسی قلعے جیسی نظر آ رہی تھی۔ اونچی اونچی باڑیں بندھی ہوئی تھیں۔ جن کے اوپر بانسوں ہی کی برجیاں بھی بنائی گئی تھیں۔ احاطے کے سامنے بڑا سا پھاٹک تھا جو اُس وقت کھلا تھا۔ میں حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر رہ گیا۔ اُس نے جس فارم ہاؤس کا تذکرہ کیا ہے وہ یہی تو نہیں ہے؟ اگر یہ واقعی اُس کا فارم ہاؤس ہے تو پھر اُس کا کہنا درست ہی تھا۔ ویسے احاطہ جتنے وسیع علاقے کو گھیرے ہوئے تھا، اُسے بھی دیکھ کر حیرت ہوتی تھی۔ جس طرف نگاہ

اُٹھتی، بانسوں کا جنگل نظر آتا۔ لاکھوں روپے کے بانس صرف اس احاطے کی تیاری میں صرف کئے گئے ہوں گے۔ گیٹ سے وہ اتنی بے تکلفی سے اندر داخل ہوئی تھی کہ اب اس بات میں کوئی شک و شبہ نہیں رہ گیا تھا کہ اس کا کوئی نہ کوئی تعلق یہاں سے ضرور ہے۔ اندر قدم رکھا تو آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ چاروں طرف درخت جھول رہے تھے اور ان درختوں کے درمیان ترکاریوں کے کھیت پھیلے ہوئے تھے جن کے باقاعدہ قطع بنائے گئے تھے۔ ہر چیز میں ایک عجیب نفاست تھی۔ کیاریوں میں چند افراد کام کرتے نظر آ رہے تھے۔ بحری کی ایک روش اُس عمارت کی جانب چلی گئی تھی، جو اس عظیم الشان احاطے کے بیچ واقع تھی اور بناوٹ کے اعتبار سے حسین ترین کہی جاسکتی تھی۔ عمارت کے سامنے ایک وسیع چبوتر تھا جو زمین سے صرف ایک فٹ اونچا تھا۔ اُس پر رنگین کرسیاں بچھی ہوئی تھیں۔ جن میں سے ایک کرسی پر سفید گاؤں میں ملبوس ایک بوڑھا بیٹھا تھا۔ داڑھی مونچھوں سے پاک چہرہ اور آنکھوں پر نہایت نفیس فریم کی عینک اُسے خوشحال ثابت کر رہی تھی۔

اُس نے دُور ہی سے ہمیں دیکھ کر آواز لگائی۔ ”ہے میلسی..... بد بخت لڑکی! وہی ہوا جس کی پیش گوئی میں نے کر دی تھی۔ یہ تیری واپسی کا وقت ہے؟“

”میرے دادا!.....“ میلسی نے سرگوشی کے انداز میں کہا۔

بوڑھا آنکھوں سے چشمہ اتار کر غصیلی نگاہوں سے میلسی کو دیکھ رہا تھا۔ میلسی کی چال میں اٹھلاہٹ پیدا ہو گئی۔ میں جھجکتے ہوئے اُس کے پیچھے پیچھے آگے بڑھا اور ہم دونوں بوڑھے کے قریب پہنچ گئے۔

”تو نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ رات ہونے سے پہلے واپس آ جائے گی۔ یہ تیری واپسی کا وقت ہے؟“

”کمال ہے دادا جان! کیا رات ہو گئی؟“ میلسی نے حیرت سے سوال کیا اور بوڑھے نے ساتھ رکھی بیساکھی اٹھالی۔ غالباً وہ ٹانگوں سے معذور تھا۔ میلسی ہنستی ہوئی کرسی پر بیٹھ گئی۔ ”مسٹر منصور، دادا جان!“ اُس نے میرا تعارف کرایا۔

”کیا؟“ بوڑھے نے سوال کیا۔

”مسٹر منصور.....“

”تعلق ایشیاء سے ہے؟“ بوڑھے نے فوراً ہی کہا اور میلسی سوالیہ نگاہوں سے مجھے دیکھنے لگی۔

”آپ کا خیال درست ہے محترم!“ میں نے جواب دیا۔

”ایشیائی باشندوں سے مجھے محبت ہے۔ کیونکہ میں نے اپنی زندگی کے چودہ سال ایشیاء میں گزارے ہیں۔ خاص طور سے برصغیر میں۔“ بوڑھے نے میری طرف مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھا دیا۔ ”میرا نام ڈیوڈ ہوپ ہے۔ تم مجھے مسٹر ہوپ کہہ سکتے ہو۔“

”آپ سے مل کر خوشی ہوئی مسٹر ہوپ.....“

”میلسی سے تمہاری دوستی کس طرح ہوئی؟ کہیں تم اس کی کسی شرارت کا شکار تو نہیں ہوئے؟“

”نہیں۔ یہ دوستی زیادہ پرانی نہیں ہے۔“

”یہ لڑکی بالکل ہی پاگل ہے۔ اپنی ماں کی طرح سنگی.....“

”غلط کہہ رہے ہیں دادا جان! آپ بار بار بھول جاتے ہیں۔ پہلے تو کہہ رہے تھے کہ میں اپنے باپ کی طرح سنگی ہوں۔“

”ایک ہی بات ہے میلسی! وہ دونوں الگ الگ کب تھے؟“ بوڑھے کے لہجے میں یکا یک نرمی پیدا ہو گئی۔ اُس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”تم کھڑے کیوں ہو مسٹر منصور؟ بیٹھ جاؤ۔“ میں شکریہ ادا کر کے بیٹھ گیا۔ ”اب اپنا تعارف کراؤ۔“ اُس نے کہا۔

”میرا نام تو آپ جان ہی چکے ہیں مسٹر ہوپ! سیاح ہوں اور آوارہ گردی کرتے ہوئے لاگن آنکا ہوں۔ یہاں سے اسٹاک ہوم جانے کا ارادہ ہے۔“

”اگر لاگن پہلی بار آئے ہو تو اتنی جلدی تمہیں یہاں سے نہیں جانا چاہئے۔ لاگن بہت خوبصورت قصبہ ہے۔“

”لیکن مسٹر ہوپ! میلسی آپ کی پوتی ہے تو یہ اس طرح کیوں لفٹ لے لے کر سڑکوں پر سفر کر رہی تھی؟“ میں نے پوچھا۔

”ہم لوگ خاندانی مریض بن مسٹر منصور! زندگی کو مختلف رنگوں میں دیکھنے کے عادی۔ براہ کرم! اس سلسلے میں مزید سوالات مت کرنا۔ تم یہ بتاؤ کہ تمہارے شہر میں بارہ سنگھے ہوتے ہیں؟“

”جی...؟“ میں نے چونک کر حیرت سے کہا۔

”بارہ سٹھے..... وہ جن کے بارہ سینگ ہوتے ہیں۔“

”وہ شہروں میں تو نہیں ہوتے مسٹر ہوپ! لیکن آپ کو اُن کا خیال کیسے آگیا؟“

”پتہ نہیں کیوں جب بھی ایشیاء کے بارے میں سوچتا ہوں، میرے ذہن میں بارہ سنگھے پھدکنے لگتے ہیں۔ یوں..... یوں.....“ بوڑھے نے اپنے ہاتھوں کی پانچوں انگلیوں کو کھولتے اور بند کرتے ہوئے کہا۔ اُس کی آنکھوں میں خواب سے لہرانے لگے تھے۔

میلیسی بڑی سنجیدگی اور دلچسپی سے بوڑھے ہوپ کو دیکھ رہی تھی۔ پھر اُس نے کہا۔ ”مجھے اعتراض ہے دادا جان..... کیوں مسٹر منصور! بارہ سنگھوں کا یوں، یوں سے کیا تعلق ہے؟“

میرے جواب دینے سے پہلے بوڑھا ہوپ بول پڑا۔ ”گہرا تعلق ہے لڑکی! تم نے زندگی میں کبھی بارہ سنگھا دیکھا ہے؟“

”دادا جان! میں نے تو سولہ سنگھا اور اٹھارہ سنگھا بھی دیکھا ہے، آپ صرف بارہ سنگھے کی بات کر رہے ہیں۔“

”میں تمہیں ایک ہزار ڈالر نقد دے سکتا ہوں اگر تم مجھے سولہ سنگھا دکھا دو۔“

”سوچ لیجئے دادا جان! کہیں ایسا نہ ہو کہ آپ کو ایک ہزار ڈالر کا نقصان برداشت کرنا پڑے۔“

”تو کیا تم مجھے تلاش آدمی سمجھتی ہو؟ اس فارم ہاؤس کی آمدنی بیس لاکھ ڈالر سالانہ ہے۔ اس کے علاوہ میرے بیرونی ذرائع۔ لڑکی! حد سے آگے بڑھنے کی کوشش کرتی ہو تم بعض اوقات۔ مجھے یہ باتیں بالکل پسند نہیں۔ تم ڈیوڈ ہوپ کو کیا ثابت کرنا چاہتی ہو؟“

”اٹھارہ سنگھا۔“ میلیسی نے ہنستے ہوئے کہا اور بوڑھے نے ایک بار پھر میلیسی کی جانب ہاتھ بڑھا دیا۔ لیکن میلیسی ہنستی ہوئی عمارت کے اندرونی حصے کی طرف دوڑ گئی تھی۔ جب وہ بوڑھے کی نگاہوں سے اوجھل ہو گئی تو بوڑھے نے ایک قہقہہ لگایا۔

”بہت شریر ہو گئی ہے۔ اگر میں تم سے یہ کہوں مسٹر منصور! کہ مجھے زندگی میں انوکھے تجربات سے دوچار ہونا پڑا ہے تو کیا تم اس پر یقین کر لو گے؟ مرد جب ماں کی حیثیت اختیار کر جائے تو ہزاروں ماؤں سے بہتر ہوتا ہے۔ باپ کی حیثیت سے اگر اس کے فرائض میں کوئی کوتاہی ہو جائے تو شاید ہو جائے لیکن جب وہ اپنے آپ کو ماں کی حیثیت میں

ڈھال لیتا ہے تو پھر بہت عظیم ہوتا ہے۔ میں نے ان دونوں بچیوں کو ماں بن کر پالا ہے اور آج تک..... اوہ سوری! کن فضول باتوں میں پھنس گیا میں۔ یقیناً تم لوگوں نے ابھی ناشتہ نہیں کیا ہوگا۔

”نہیں مسٹر ہوپ! ہم ہلکا پھلکا ناشتہ کر چکے ہیں۔“

”ناشتہ کبھی ہلکا پھلکا نہیں ہونا چاہیے۔ اگر ایک خوشگوار دن کا آغاز ہی کفایتوں سے ہو تو اس کا انجام بہت تکلیف دہ ہوتا ہے۔ چلو اٹھو! ہم ناشتہ کریں گے۔“ بوڑھے نے بیساکھیوں کی طرف ہاتھ بڑھایا تو میں نے جلدی سے اُٹھ کر اُس کی بیساکھیاں اُس کے حوالے کر دیں اور بوڑھے نے شکریہ ادا کر کے انہیں بغلوں کے نیچے لگا لیا اور پھر آہستہ روی سے میرے ساتھ چلنے لگا۔ بظاہر اُس کی ٹانگیں ٹھیک ٹھاک محسوس ہوتی تھیں۔ لیکن وہ بمشکل تمام انہیں زمین پر جما کر چل رہا تھا۔ پھر وہ مجھے لے کر اندر داخل ہو گیا۔

اندر کی سج دھج بھی قابل دید تھی۔ ڈیکوریشن پر ہی لاکھوں روپے خرچ کئے گئے تھے۔ مگر میلیسی مجھے واقعی سکی محسوس ہوتی تھی کہ وہ اس انداز میں لفٹ سے سفر کر رہی تھی۔ اُس نے اپنا حلیہ بے حد برا بنا رکھا تھا۔ لیکن ناشتے کے کمرے میں جب وہ آئی تو ایک خوبصورت اسکرٹ میں ملبوس تھی۔ اُس نے ہم دونوں کو مسکراتے ہوئے خوش آمدید کہا اور پھر ناشتے کی میز پر بیٹھ گئی۔ دو بٹلوں نے فوراً ناشتہ لگا دیا۔ ہم نے خاموشی سے ناشتہ کیا۔

”اگر تم چاہو تو مسٹر منصور کو اپنا فارم ہاؤس دکھاؤ۔ بیرونی علاقے سے زیادہ عقبی علاقہ خوبصورت ہے۔ تمہیں پسند آئے گا۔“

بوڑھے کی بات سن کر میں نے میلیسی کی طرف دیکھا۔ وہ گردن خم کر کے اُٹھ کھڑی ہوئی اور پھر مجھے ایک کمرے میں لے آئی۔ ”دادا جان کھسک گئے ہیں اپنی جگہ سے۔ ہم نے رات جس انداز میں گزاری ہے، اُس کے بعد ہمارے لئے ایک پرسکون نیند سب سے بہتر ہے۔ فارم ہاؤس دکھانے کے لئے تو بہت وقت پڑا ہے۔ دیکھو! یہ تمہارا کمرہ ہے۔ آرام سے لباس وغیرہ تبدیل کرو اور سو جاؤ۔ جب تک جی چاہے، سوتے رہو۔“

کم از کم اس سلسلے میں، میں میلیسی سے اختلاف نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے اُس کا شکریہ ادا کیا اور کمرے میں داخل ہو کر دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ میلیسی خود ہی واپس چلی گئی تھی۔ بہترین فرنیچر سے آراستہ کمرہ تھا۔ جوتے اتارے، ملحقہ باتھ روم میں جا کر منہ ہاتھ دھویا

اور پھر بستر پر لیٹ گیا۔ نیند آنے میں زیادہ دیر نہیں لگی تھی۔ جاگا تو ساڑھے تین بج رہے تھے۔ پیٹ میں دوڑتے چوہے بتا رہے تھے کہ صبح کے ناشتے کے اثرات زائل ہو چکے ہیں اور دوپہر کے کھانے کا وقت نکل گیا ہے۔ اب جبکہ کھانے کا وقت نکل ہی گیا تھا تو پھر جی بازی سے کیا فائدہ؟ میں کسلمندی سے بستر پر ہی لیٹا رہا۔

تقریباً چار بجے اٹھ کر منہ ہاتھ دھویا اور لباس تبدیل کر کے باہر نکل آیا۔ ایک ملازم نے گردن خم کرتے ہوئے کہا کہ مسٹر ہوپ باہر لان پر انتظار کر رہے ہیں میں تیار ہو کر باہر نکل آیا۔ سٹی چبوترے کی دوسری جانب سرسبز گھاس پر مسٹر ہوپ کرسی پر بیٹھے میرا انتظار کر رہے تھے۔

”بیٹھ جاؤ میں نے سنا ہے تم نے دوپہر کا کھانا بھی نہیں کھایا۔“

”ہمیں پچھلی رات لاگن میں داخل ہونا چاہئے تھا مگر سنان راستے میں محسوس ہوئے تو میں نے اور میلیسی نے رات کو سفر کرنے کا ارادہ ملتوی کر دیا لیکن کھلے آسمان کے نیچے نیند نہیں آ سکی۔“

”ہم! تو میں تمہارے لئے کچھ منگواؤں اگر اس وقت کوئی بھاری چیز کھالی تو پھر رات کھانا نہیں کھا سکو گے۔“ ساتھ ہی انہوں نے ایک ملازم کو اشارہ کر دیا تھا۔ تھوڑی دیر بعد وہ چائے کے ساتھ کچھ لوازمات لے آیا۔ مسٹر ہوپ کافی مہمان نواز آدمی تھے۔ وہ مجھ سے میرے بارے میں پوچھنے لگے۔ اور میں نے انہیں مختصراً اپنی سیاحت کے بارے میں بتایا جس میں کچھ بھی حقیقت پر مبنی نہیں تھا بس ایک کہانی تھی۔

”ایشیا میں، میں نے بھی ایک طویل زندگی گزاری ہے نوابوں کا دور تھا اور یہ نواب بڑے خوب ہوا کرتے تھے کیا تم نے بارہ سنگھا دیکھا ہے کبھی؟“ بوڑھے ہوپ نے دوسری بار بارہ سنگھے کا تذکرہ کیا تھا۔

”جی ہاں۔ میں آپ کو بتا چکا ہوں اس بارے میں۔“

”بارہ سنگھے کے بارے میں نجانے کیوں جی چاہتا ہے کہ طویل گفتگو کی جائے۔“

”اس کی کوئی خاص وجہ ہوگی مسٹر ہوپ؟“

”کیا پتہ! میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتا۔“

”مس میلیسی کہاں ہیں؟“ میں نے سوال کیا۔ بوڑھے کی بے ربط گفتگو کچھ عجیب سی

محسوس ہونے لگی تھی۔

”وہ کہیں گئی ہوئی ہے۔“

”آپ نے کہا تھا کہ آپ کی دو پوتیاں ہیں۔ دوسری کو میں نے نہیں دیکھا۔“

”جسے نہیں دیکھا۔ اُسے دیکھنے کی کوشش بیکار ہے، ہمیں صرف سامنے دیکھنا چاہئے۔“

ادھر ادھر دیکھنے کی کوشش بعض اوقات نقصان دہ ہو جاتی ہے ویسے بارہ سنگھا اس کائنات

میں ایک عجیب و غریب مقام رکھتا ہے۔“

”مجھے یوں محسوس ہوتا ہے مسٹر ہوپ جیسے بارہ سنگھے کا آپ کی زندگی سے کوئی گہرا تعلق

ہے۔ کیا آپ نے کبھی اپنے ذہن کو ٹٹولنے کی کوشش نہیں کی کہ اس میں بارہ سنگھے کا تصور

اس قدر کیوں جاگزیں ہے۔“

”مطلب کیا ہے تمہارا مجھے پاگل قرار دینا چاہتے ہو۔ یہ کہنا چاہتے ہو کہ بارہ سنگھا

بذات خود کوئی انفرادیت نہیں رکھتا؟ صاحبزادے اگر دنیا کی حقیقت پر غور کرو تو بارہ سنگھا

اس میں تمہارا سب سے زیادہ معاون ہوتا ہے۔ میں تمہیں بارہ سنگھے کے بارے میں جو

تفصیلات بتاؤں گا شاید تم خواب میں بھی کبھی نہ سوچ سکو۔“ بوڑھے نے پر خیال انداز میں

کہا اور اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔

”زیادہ قدیم کا انسان جب تہذیب سے نا آشنا تھا اور اس کی فکر صرف چند چیزوں تک

محدود تھی.....“ میں دلچسپ نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا لیکن دفعۃً ہی میرا منہ حیرت سے

کھل گیا جو کچھ میں دیکھ رہا تھا وہ ناقابل یقین تھا بوڑھے کی بیساکھیاں وہیں کرسی کے پاس

رکھی ہوئی تھیں وہ ٹہلتا ہوا آگے بڑھ گیا تھا اور اس وقت بالکل صحیح کھڑا مجھے لپکھ رہا

تھا۔ میرے حیران چہرے کو دیکھ کر اس نے ایک مدبرانہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

”یہ نظریہ فکر اس وقت تبدیل ہوا.....“

”اوہ اوہ مسٹر ہوپ..... مسٹر ہوپ..... آپ..... آپ بغیر بیساکھیوں کے کھڑے

ہیں۔“ میں نے بوڑھے کو اس کے پیروں کی جانب متوجہ کیا لیکن بوڑھے نے میری بات کی

جانب توجہ نہیں دی۔

”میرا ذہن بھٹکا کر تم بارہ سنگھے کی افادیت اور اس کی تاریخی شخصیت کو نظر انداز کرنا

چاہتے ہو۔ نہیں ہرگز نہیں۔“

”مسٹر ہوپ آپ بغیر بیساکھیوں کے کھڑے ہیں۔“

”تو تمہیں کیوں تکلیف ہو رہی ہے۔“ بوڑھا واپسی کے لئے مڑا اور پھر اس نے دوا بیساکھیاں اٹھا کر بغلوں کے نیچے لگالیں اور ٹہلنے کے انداز میں وہاں سے آگے بڑھ گیا۔

”تو میں بارہ سنگھے کی افادیت اور اس کی تاریخی حیثیت پر تبصرہ کر رہا تھا۔“ اس نے بات کا نوٹس لئے بغیر کہا۔ اور میں احمقوں کے سے انداز میں کھوپڑی کھجانے لگا۔ مجھے پاگلوں کا خاندان معلوم ہوتا تھا۔ فقیروں کی طرح لفٹ لے کر سفر کرنے اور بھوکوں مر والی کروڑ پتی پوتی، معذوروں کی طرح بیساکھیاں بغل میں دبا کر چلنے والا دادا اور پھر ہا سنگھا، یہ سب احساس دلاتا تھا فارم ہاؤس درحقیقت پاگل خانہ ہے۔ بیساکھیاں بغل میں لگانے کے بعد بوڑھا ڈیوڈ مجھے بارہ سنگھے کے بارے میں نجانے کیا کیا بتاتا رہا لیکن اس کی کیفیت پر غور کر رہا تھا۔ اُسی وقت میلیسی ایک خوبصورت کار میں اندر داخل ہوئی اور نے کار ایک طرف کھڑی کی اور اتر کر ہمارے پاس آگئی۔

”ہیلو۔ مسٹر منصور کیسے مزاج ہیں کیا ہو رہا ہے؟“ اس نے سوال کیا۔

”یہ شخص بارہ سنگھے کو تسلیم نہیں کرتا میلیسی اور تم جانتی ہو ایسی کیفیت میں میں آؤں جاتا ہوں۔ سوری میلیسی! اس وقت اپنے مہمان کو تم خود ہی سنبھالو۔ میرا ٹیمپریز ہو رہا ہے۔“ اس نے بیساکھیوں کے سہارے تیز تیز آگے بڑھتے ہوئے کہا۔ اور پھر چبوترے۔ اتر کر عمارت میں داخل ہو گیا۔

میلیسی عجیب سی نگاہوں سے اسے دیکھتی رہی۔ پھر میری طرف رخ کر کے بولی۔ ”کیا تھا؟“

”کچھ نہیں میلیسی بس تقدیر کی خرابی کہو۔ اب میں اس سلسلے میں کیا کر سکتا ہوں، سوال اپنی تقدیر کو، کو سننے کے۔“

”ارے.... ارے.... مگر ہوا کیا۔ تمہیں دادا جان کی بات کا برا نہیں ماننا چاہئے۔ بارہ سنگھا درحقیقت ان.... کا ایک کمپلیکس ہے اور وہ جب بھی ایشیا کا تصور کرتے ہیں بارہ سنگھے کے بارے میں گفتگو کرنے لگتے ہیں۔ ویسے پچھلے کئی سال سے انہوں نے بارہ سنگھے کے بارے میں کوئی بات چیت نہیں کی تھی لیکن تمہارے نام کے ساتھ چونکہ ایشیاء کا تصور ابھڑا ہے اوہو۔ شاید تم لوگ چائے پی چکے ہو۔ لیکن میں چائے پینا چاہتی ہوں۔“

”کیا تم یہ بات سن کر حیران نہیں ہو گی میلیسی کہ تمہارے دادا جان بارہ سنگھے کے تذکرے پر اس قدر جذباتی ہو جاتے ہیں کہ بیساکھیوں کے بغیر بھی ٹہلتے ہوئے دور چلے جاتے ہیں۔ اور اپنے پیروں پر کھڑے ہو کر گفتگو کر سکتے ہیں۔“

”تو اس میں حیرت کی کیا بات ہے۔ دادا جان اکثر بیساکھیوں کے بغیر بھی چل لیتے ہیں۔“

”میں سمجھا نہیں۔“ میں نے حیرت سے کہا۔

”ایک پیالی چائے اور پیو میرے ساتھ۔ یہ میں نے تمہارے لئے بنائی ہے۔“ میلیسی نے کہا اور میں اس کے سامنے بیٹھ گیا۔

”تم کہہ رہی تھیں کہ وہ بغیر بیساکھیوں کے بھی چل لیتے ہیں۔“

”ہاں۔ وہ معذور تو نہیں ہیں صرف معذور آدمی بیساکھیوں کے بغیر نہیں چل سکتے، ان کی تو دونوں ٹانگیں درست ہیں۔“

”تب پھر یہ بیساکھیاں۔“

”بیساکھیاں..... بیساکھیاں ہوتی ہیں۔ اوہ..... کہیں تم نے یہ سوال تو نہیں کر ڈالا ان سے کہ وہ بغیر بیساکھیوں کے کیسے چل رہے تھے؟“

”نہیں میں نے ان سے یہ سوال نہیں کیا؟“ میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

”دراصل بیساکھیوں سے چلنا ان کا مشغلہ ہے اور اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ بیساکھیاں بغل میں دبا کر چلتے ہوئے وہ بے حد سکون محسوس کرتے ہیں اور اس سلسلے میں بھی اتنے ہی جذباتی ہیں جتنے بارہ سنگھے کے سلسلے میں۔“ میلیسی نے جواب دیا اور چائے کا کپ اٹھا کر منہ سے لگا لیا لیکن میں نے اپنی چائے کی پیالی نہیں اٹھائی۔ میں اس پاگل خاندان کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ میلیسی کے چہرے سے ذرا بھی اندازہ نہیں ہوتا تھا کہ اس سلسلے میں بھی وہ کوئی شرارت کر رہی ہے۔

”تم گئی کہاں تھیں؟“

”بھیک مانگنے۔“ میلیسی نے جواب دیا۔

”کیا مطلب؟“

”اکثر میں لاگن کے آس پاس کے علاقوں میں بھیک مانگنے چلی جاتی ہوں۔ دیکھ لو کار

میں میرا ڈریس رکھا ہوا ہے بالوں کی وگ بھی ہے لیکن بعض اوقات مجھے اس کی ضرورت بھی پیش نہیں آتی۔ بس بھیک مانگنے کے نئے نئے طریقے آنے چاہئیں۔“

”تم شاید سنجیدگی سے مجھ سے مذاق کر رہی ہو۔“

”مسٹر منصور! کیا یہ بہتر نہیں ہوتا کہ کسی کے ذاتی معاملات میں مداخلت نہ کی جائے۔ ہم، تم چند لمحات کے مسافر تھے دوستی کی بنیاد پر میں تمہیں یہاں لے آئی۔ میں نے تمہیں اپنے فارم ہاؤس کے بارے میں بھی بتا دیا تھا اور دادا جان کے بارے میں بھی بس اتنا کہ کافی نہیں تھا۔ ضروری ہے کہ تم، ہم لوگوں کے بارے میں ساری چھان بین کرو، دادا جان اگر بارہ سنگھے کے مرض کا شکار ہیں تو ہونے دو۔ تم ڈاکٹر تو نہیں ہو اور پھر وہ اگر بغیر بیساکھیوں کے چند قدم چل لیتے ہیں تو اس سے تم پر کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ سو ڈیز، یہ بات بہتر نہیں ہوگی۔ آئندہ احتیاط رکھنا۔“

اس نے اپنی چائے کی پیالی خالی کی اور پھر اپنی جگہ سے اٹھ گئی، میں اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا تھا، تھیلہ لینے کے لئے اندر جانا ضروری تھا ورنہ شاید یہیں سے بانسوں کے دروازے کی جانب چھلانگ لگا دیتا جو اس پاگل خانے میں داخلے کا واحد راستہ تھا کیونکہ بانسوں کی اونچی باڑھ کے حصار کو پھلانگنا میرے بس سے باہر تھا۔ یہاں اس پاگل خانے میں کسی بھی وقت کوئی ایسی بات رونما ہو سکتی ہے جو میرے لئے مصیبت کا باعث بن جائے اور اب میں کوئی مصیبت مول لینے کے لئے تیار نہیں تھا۔ حیرت تھی ان تمام لوگوں پر، میرے کافی دیر تک وہاں اکیلا بیٹھا رہا اور اس کے بعد یہی فیصلہ کر کے وہاں سے اٹھا کہ اپنا بیگ لے کر یہاں سے نکل جاؤں۔ اس کمرے میں پہنچا جہاں میرا بیگ رکھا ہوا تھا تو میلہ میرے بستر پر بیٹھی ہوئی تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ مسکرائی۔

”مجھے یقین تھا کہ تم فوراً اپنے کمرے میں آؤ گے، میں تمہارا انتظار کر رہی تھی۔“

”تمہیں یہ یقین کیوں تھا میلیسی؟“

”اس لئے کہ میں نے تمہارے چہرے پر تمہارا پروگرام پڑھ لیا تھا۔ اب تم یہاں سے بھاگنے کی کوشش کرو گے لیکن میرے خیال میں یہ تمہاری زیادتی ہوگی۔“

”نہیں میلیسی پلیز۔ میں ویسے بھی زیادہ دیر تمہارے پاس نہیں رُک سکتا تھا۔ لاگن کو دیکھو

ہوا یہاں سے اسٹاک ہوم نکل جاؤں گا۔ بس یہی میرا پروگرام ہے۔“

”اس طرح نہیں جا سکتے مسٹر منصور! میں کہتی ہوں کہ آخر تمہیں تجسس کیا پیدا ہو گیا ہے۔ دراصل بارہ سنگھا۔“

”ایک منٹ۔ اگر تم نے دوبارہ بارہ سنگھے کا نام لیا تو ہو سکتا ہے میں دیوار سے سر پھوڑ لوں۔“

”گویا بارہ سنگھا تم پر بھی سوار ہو گیا ہے۔“ اس نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا پھر بولی۔ ”مسٹر منصور! مگر اس طرح واپس جانا بد اخلاقی ہے بس تم ان تمام باتوں کو ذہن سے نکال دو۔ دادا جان اگر بیساکھیوں سے چلتے ہیں تو تمہیں اس پر کیا اعتراض ہو سکتا ہے بھی یہ ان کی پسند ہے۔ میں اگر اپنی پسند کی زندگی گزار لیتی ہوں تو یہ میرا ذاتی معاملہ ہے کیا اس کے بغیر ہم لوگ دوست نہیں رہ سکتے؟“

”نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے لیکن براہ کرم اب تم مجھے نہ بارہ سنگھے کی کہانی سنانا اور نہ اپنے بھیک مانگنے کی۔“

”وعدہ۔“ میلیسی نے میری بات کا برا مانے بغیر کہا اور اس کے بعد اٹھ کھڑی ہوئی۔ ”آؤ! میں تمہیں اپنا فارم ہاؤس دکھاؤں۔“

میں نے آمادگی کا اظہار کر دیا۔ فارم ہاؤس کی جو صورت حال میں سامنے کی سمت دیکھ چکا تھا، اُس کا عقبی حصہ اُس سے بھی زیادہ حسین تھا۔ وہاں ایک انتہائی خوبصورت سوئمنگ پول بھی تھا جس کے کنارے چھتریاں لگائی گئی تھیں۔ خاصا حسین ماحول تھا۔ لیکن میلیسی بھیک مانگنے جاتی تھی، لفٹ لے کر سفر کرتی تھی۔ اہل یورپ کا یہ رنگ بھی میرے لئے اجنبی تھا۔ کافی دیر میلیسی میرے ساتھ رہی۔ پھر شام کے سائے جھک آئے۔ رات کے کھانے پر بوڑھا دادا موجود نہیں تھا۔ صرف میلیسی ہی نے میرے ساتھ کھانا کھایا اور کھانے کے بعد ہم کافی پیتے ہوئے گفتگو کرنے لگے۔

”لاگن کے نواح بہت حسین ہیں۔ کل میں تمہیں کچھ ایسی جگہیں دکھاؤں گی جو تمہیں بے حد پسند آئیں گی۔“

”تمہاری دوسری بہن ابھی تک نظر نہیں آئی۔ کیا وہ کہیں گئی ہوئی ہے؟“

”وہ ہمیشہ غائب رہتی ہے۔ شاید ہی تمہیں نظر آئے۔“

”ان دنوں یہاں موجود نہیں ہے؟“ میں نے سوال کیا۔

میلیسی اس انداز میں ہنس پڑی جیسے مجھے ذہنی مریض سمجھ رہی ہو۔ اُس کے ہنسنے کی فوراً ہی میری سمجھ میں آگئی تھی۔ میں نے پھر اُس کے گھر کے بارے میں کرید شروع کر دی تھی۔ اُس نے مجھے اپنی بہن کے بارے میں مزید کچھ نہیں بتایا بلکہ سویڈن کی تاریخ اور وہاں کنگز لیٹروں کے بارے میں تفصیلات بتانے لگی اور میں خاموشی سے اُس کی بکواس سنتا رہا۔ مجھے ان باتوں سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی۔ باتیں کافی دیر جاری رہیں۔ اور پھر اُس نے اجازت لے کر میں اپنی آرام گاہ میں پہنچ گیا۔ روشنی گل کر کے میں بستر پر لیٹا ہی تھا دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی۔ میرے ذہن میں یہی خیال آیا کہ میلیسی کو پھر کچھ سوچ ہے۔ دروازہ کھولا تو ایک نئی صورت نظر آئی۔ عمر تقریباً تیس سال، چہرہ انتہائی خوبصورت آنکھیں بڑی بڑی اور کشادہ لیکن اُس چہرے پر ایک پراسرار سی کیفیت پھیلی ہوئی تھی، چہ وہ جاگتے ہوئے سو رہی ہو۔ اُس کے ہاتھ میں ایک لمبی مومی شمع دبی ہوئی تھی۔ گلے میں ایک خاص قسم کا زیور نظر آ رہا تھا اور اُس کے دیکھنے کا انداز بھی بہت عجیب تھا۔ وہ اندر داخل نہیں ہوئی بلکہ اُس نے مجھے گردن کے اشارے سے باہر آنے کے لئے کہا اور میں متحیرانہ انداز میں باہر نکل آیا۔ اس لڑکی کو میں نہیں پہچانتا تھا۔ اس فارم ہاؤس میں، میں نے پہلی بار اُس کی صورت دیکھی تھی۔ لیکن اُس کا انداز ایسا تھا جیسے مجھے بخوبی جانتی ہو۔ بہر طور! میں باہر نکلا تو وہ واپسی کے لئے مڑ گئی اور میں اُس کے پیچھے چل پڑا۔ اُس کے چہرے کا انداز بھی کچھ عجیب سا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ فضا میں تیر رہی ہو۔

☆.....☆.....☆

اس بار مجھے عمارت کے ایک بالکل نئے حصے میں لایا گیا تھا۔ جس کمرے میں ہم داخل ہوئے، وہاں چاروں طرف الماریوں اور شیلف میں کتابیں بند تھیں۔ لڑکی کے بارے میں ابھی کوئی صحیح اندازہ نہیں لگا سکا تھا کہ اُس نے آہستہ سے کہا۔ ”کیا تم مصری ثقافت کے بارے میں کچھ جانتے ہو؟“ میری آنکھیں پھیل گئیں۔ یہ سوال بھی میرے لئے ناقابل فہم اور عجیب سا تھا۔ ”میں سیت خاندان کے بارے میں جاننا چاہتی ہوں۔ مصریوں کی زندگی میں سیت خاندان کا دور انتہائی اہمیت کا حامل ہے۔ سیت خاندان سے پہلے جو اہرام اور مقبرے مصر میں تعمیر ہوئے تھے، اُن کی دریافت ابھی مکمل طور پر نہیں ہو سکی۔ لیکن سیت خاندان کا ابتدائی دور بڑا عجیب و غریب تھا۔ میں جاننا چاہتی ہوں کہ بیسویں صدی کے مصری مورخین تاریخ مصر پر جو بحث کرتے ہیں اور سیت خاندان کے لوگوں کو حبشہ سے منسوب کرتے ہیں، اس میں کہاں تک صداقت ہے؟“

”آپ.....آپ کون ہیں خاتون؟“

”اوہ..... میرا نام کیلیسی براؤنسن ہے۔ تمہاری دوست میلیسی براؤنسن کی بڑی بہن ہوں۔ دراصل مجھے افسوس ہے کہ تمہاری آمد کے بعد میں تم سے ملاقات نہ کر سکی۔ لیکن کیا کروں؟ خاتون کا مسئلہ حل ہو جائے تو میں اپنے کام کو آگے بڑھاؤں۔“

”مصریات پر کچھ کام کر رہی ہو؟“ میں نے سوال کیا۔

”ہاں! جسم و روح کے متعلق جو ایک الجھا ہوا تصور مصری کہانیوں میں ہے میں اُس کی حقیقت جاننا چاہتی ہوں۔ اور اس کے لئے مجھے یہ کتابیں نا کافی محسوس ہوتی ہیں۔ میلیسی نے تمہیں اپنی دنیا دکھائی ہوگی۔ آؤ! میں تمہیں اپنی دنیا دکھاؤں۔ آؤ پلیز..... میرے ساتھ آؤ! تم یقیناً اُسے دیکھ کر لطف محسوس کرو گے اور اگر تمہارے ذریعے میرا مسئلہ حل ہو جائے تو میں تمہاری شکر گزار ہوں گی۔“

تھا۔ میں نے خوفزدہ انداز میں دونوں ہاتھ چہرے پر رکھ لئے۔ دفعۃً ہی مجھے اپنے چہرے پر ایک خراہٹ سی محسوس ہوئی۔ پلاسٹک کے وہ بڑے بڑے ٹکڑے جنہوں نے میرے چہرے کو آرٹن ڈورل کی شکل میں تبدیل کر دیا تھا، خود بخود میری جلد چھوڑ رہے تھے..... یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ سوکھ گئے ہوں۔ میں نے ایک ٹکڑا چہرے سے ہٹایا تو وہ میرے ہاتھ میں آ گیا پھر میں نے اپنے چہرے کو بے چینی سے دونوں ہاتھوں سے رگڑنا شروع کر دیا..... وہ میک اپ میرے چہرے سے ختم ہو گیا تھا جس نے مجھے آرٹن ڈورل بنایا تھا۔ اور اب اگر میں آئینہ دیکھتا تو اس مجسمے سے کم از کم میری صورت الگ نہ ہوتی..... دفعۃً ہی میرے چہرے پر ایک زوردار چپت پڑی اور میرے حلق سے ایک آواز سی نکل گئی.....

راعمیس کا مجسمہ آنکھیں کھول کر مجھے گھورنے لگا تھا..... اُس کے چہرے پر شکایت کا سا انداز اُبھر آیا تھا۔ جبکہ اُس سے پہلے اس کی یہ کیفیت نہیں تھی۔ پھر اُس کے ہونٹ کھلے اور ایک آواز میرے کانوں میں اُبھری.....

”راعمیس کے ہم شکل! اس میں کوئی شک نہیں کہ تو دنیا کا سب سے ناقابل اعتبار آدمی ہے۔ لیکن یہ میری بد قسمتی ہے یا تیری کہ تو میرے ایسے جگری دوست کا ہم شکل ہے جس کے ساتھ میں نے اپنے بچپن سے آخری عمر تک کا دور گزار دیا۔ اپنی صورت کو اگر آج اس مجسمے کی شکل میں بھی نہ پہچان سکے تو پھر تیرے لئے نحوست کی گہری اور عمیق دادیوں کے علاوہ کچھ نہیں ہے..... میری رفاقت تیرے لئے وبالِ جان بن گئی یا تو نے مجھے محبت کے بدلے نفرت کا تحفہ دیا۔ لیکن میں تجھے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا اُس کے نام پر جو میرا سچا دوست اور وفادار ساتھی تھا۔ گہرا یا ر تھا.....“

میں نے راعمیس کے مجسمے کو بولتے ہوئے دیکھا اور پھر میری نگاہیں کیلیسی براؤنسن کی جانب اٹھ گئیں جو اپنی جگہ کھڑی کھڑی لہرا رہی تھی۔ اُس کی آنکھوں کی پتلیاں چڑھ گئی تھیں۔ وہ ایک لمحے میں گرنے ہی والی تھی کہ میں نے لپک کر اُسے سنبھال لیا تھا۔ میری بانہوں میں گرتے ہی وہ بے ہوش ہو گئی۔

راعمیس بدستور کینہ تو زنگاہوں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ پھر اُس نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ”اس دنیا کا ہر شخص تیرے لئے قابل توجہ اور قابل احترام ہے۔ لیکن صرف راعمیس..... تیرا گہرا دوست راعمیس..... تیری توجہ نہیں حاصل کر سکتا۔ میں اپنی اس توہین کا

”اس بار اُس نے میرا بازو پکڑ لیا تھا اور میں اُس کے ساتھ ساتھ کسی سحر زدہ شخص مانند آگے بڑھ گیا۔ لیکن وہ کمرے سے باہر نہیں نکلی بلکہ کمرے کی دیوار کے قریب پہنچنے پر اُس نے ایک ایسا دروازہ کھولا جو بظاہر اس دیوار میں نہیں محسوس ہوتا تھا۔ دوسری جانب روشنی تھی۔ وہ ایک وسیع و عریض ہال تھا۔ قدیم مصریات کا بیش بہا خزانہ وہاں موجود تھا۔ چھوٹے چھوٹے اہراموں کے ماڈل، فراعنہ کے مقبروں کی بڑی بڑی تصاویر، جگہ جگہ فرعون کے سنگی مجسمے اُس ہال میں سجائے گئے تھے۔ بلکی سی خوشبو فضا میں پھیلی ہوئی تھی۔ اطراف میں کہیں ایسی جگہ نظر نہیں آ رہی تھی جس سے یہ خوشبو نکل رہی ہو۔ نجانے کیر مجھے راعمیس کا مقبرہ یاد آ گیا جہاں میں نے پہلی بار راعمیس کو تابوت میں لیٹے دیکھا تھا۔ یہاں پھیلی ہوئی خوشبو اُس مقبرے میں پھیلی ہوئی خوشبو سے مختلف نہیں تھی۔ یہاں ماحول میں مصر کی مکمل تصویر کھینچ دی گئی تھی۔ اُس کے درمیان ہم دونوں بہت ہی عجیب محسوس کر رہے تھے۔ پتہ نہیں مصر کا میری زندگی سے کیا تعلق تھا؟ کسی نہ کسی صورت پر تھوڑے بہت وقفے کے بعد وہ میری نگاہوں کے سامنے آ جاتا تھا۔

کیلیسی براؤنسن کی آواز اُبھری۔ ”دیکھو! یہ سیت خاندان سے پہلے کے افراد ہیں۔ ان کی تاریخ میں سیت خاندان کی آمد کا پورا حال درج ہے۔ یہ شخص راعمیس ہے۔ سیت خاندان سے پہلے کا فرعون.....“

کیلیسی براؤنسن نے اتنا کہا تھا کہ میری نگاہ اُس مجسمے کی جانب اٹھ گئی جس کی طرز کیلیسی براؤنسن نے اشارہ کیا تھا اور اُس کے بعد جیسے میرا دماغ ہوا میں معلق ہو گیا..... شبہ یہ راعمیس ہی کا مجسمہ تھا..... اُس راعمیس کا جو میری زندگی پر، میرے حواس پر بڑی طرح مسلط رہا تھا اور جس سے پیچھا چھڑانے کے لئے میں نے نجانے کیا کیا جتن کئے تھے۔ اُس سے بھی زیادہ پریشان کن اور حیرت ناک بات یہ تھی کہ راعمیس کے عقب پر راعمیس کا مجسمہ بھی موجود تھا۔ وہی فرعون کی لباس، وہی قدیم انداز، لیکن صورت میری..... ہاں! میری اصلی صورت..... جسے میں زمانہ قدیم کے انسان کے مجسمے کی شکل میں دیکھ رہا تھا.....

عقب سے کیلیسی براؤنسن کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں۔ وہ مجھے سیت خاندان کے بارے میں تفصیلات بتا رہی تھی۔ لیکن اُس کے الفاظ کا مفہوم میری سمجھ میں نہیں آ رہا

تجھ سے ایسا انتقام لے سکتا ہوں کہ تو مرتے دم تک یاد رکھے..... لیکن نہیں۔ میں نے آزاد کر کے اپنی محبت کو سمیٹ لیا ہے۔“

میں نے مسکراتی نگاہوں سے راعمیس کو دیکھا۔ ”تو پہلی بار میرے سامنے مجسم شکل آیا ہے۔“

”مجسم نہ کہہ، مجسمے کی شکل میں کہہ..... یہ مجسمہ اُس لڑکی نے اپنی یادداشت کی بنیاد بنوایا ہے اور یہ تیرے بارے میں اتنا ہی جانتی ہے، جتنا میرے بارے میں..... لیکن میں نے مجھے موقع دیا کہ میں تجھ سے تیری بے وفائی کی شکایت کر سکوں اس لئے میں اس کا گزار ہوں۔“

”مگر تو خود بے وفا دوست ہے..... برے حالات میں ساتھ چھوڑ کر بھاگ جاتا ہے اور مجھے مصیبت میں پھنسا دیتا ہے۔“

”تیری بھول ہے یہ۔ جس طرح تم ذی روح اپنے مسائل میں گرفتار ہوتے ہو، اسی طرح رُوحوں کی دنیا میں بھی لاتعداد مسائل ہوتے ہیں۔ میں بھی بعض اوقات انہی مسائل کا شکار ہو جاتا ہوں۔ لیکن یہ ایسی بات تو نہیں۔ زمانہ قدیم میں جب تو انسانی قالب میں نہ تو تیری وفاداری کی مثالیں دی جاتی تھیں۔ لیکن بدلے ہوئے دور میں تو اُس کے برعکس ہے۔ اگر بہت زیادہ قلبی رشتے رکھنے والے دوستوں میں سے ایک کسی مصیبت میں پھنسا جائے تو کیا دوسرے کو اس سے کنارہ کشی اختیار کر لینی چاہئے؟ کیا اس دنیا کی یہی رسمیں ہیں؟ اگر یہ بات ہے تو، تو مریکوں نہیں جانتا؟ دوستی کے بغیر تو زندگی کا تصور ہی بے مقصد ہو کر رہ جاتا ہے..... بہر طور، راعمیس! میں تجھ سے دوستی کی بھیک نہیں مانگوں گا۔ میں تجھے یاد دلانا تھا کہ راعمیس آج بھی تیرے قریب موجود ہے۔ تو نے اُسے کتنا ہی پیچھے دیا ہو۔ لیکن وہ قلبی رشتے جن کا تعلق رُوح سے ہوتا ہے، کبھی ختم نہیں ہوتے۔ اگر میں بھی ان رشتوں کو نظر انداز کر دیتا تو اب تک تیری موت اتنی دفعہ واقع ہو چکی ہوتی کہ شاید تجھے یاد بھی نہ رہتا..... میں نے ہر نازک موقع پر تجھے سنبھالا دیا ہے اور یہ صرف دوستی کی بنیاد پر..... آج تو ایک بار پھر اپنی اصل صورت میں آ گیا ہے تو سن..... میں اب بھی تیرے ساتھ رہوں گا۔ جہاں تو مصیبت میں گرفتار ہوا، تیری مدد بھی کروں گا۔ لیکن میں تجھ سے خوش نہیں ہوں.....“

”راعمیس! یہاں اس جگہ میں تجھ سے زیادہ گفتگو نہیں کر سکتا۔ کیا یہ بہتر نہیں ہو گا کہ اس جگہ سے نکل کر ہم کہیں اور بیٹھ کر باتیں کریں.....؟“

”اپنے اطراف میں دیکھ..... تو خواہش تو کر! پوری کرنا میری ذمہ داری ہے.....“ راعمیس کے مجسمے نے کہا اور میری نگاہیں حیرت زدہ انداز میں سامنے کی سمت اٹھ گئیں۔ اور دوسرے ہی لمحے میرے حلق سے ایک عجیب سی آواز نکل گئی..... یہ وہ کمرہ نہیں تھا جہاں راعمیس کا مجسمہ اور بوڑھے دادا کی پوتی موجود تھی۔ بلکہ یہ تو کوئی کھلا علاقہ تھا۔ بے شک وقت رات ہی کا تھا، لیکن اطراف کے ماحول سے اندازہ ہوتا تھا کہ کم از کم اس علاقے سے اس جگہ کا کوئی تعلق نہیں ہے جہاں میں موجود تھا۔ راعمیس کی قربت نہ ہوتی تو یہ پاگل کر دینے والی بات تھی۔ لیکن راعمیس کو میں آج سے نہیں بلکہ کافی عرصے سے جانتا تھا۔ میں نے ادھر ادھر پلٹ کر دیکھا۔ ظاہر ہے جب یہ وہ جگہ ہی نہیں تھی تو راعمیس کا مجسمہ یہاں کہاں سے آتا؟ چنانچہ اب صرف اُس کی آواز تھی اور میرے بدن میں وہ ٹھنڈک جو راعمیس کی قربت کا احساس دلاتی تھی..... میں نے راعمیس کو پکارا.....

”ہاں ہاں..... خوفزدہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں ہمیشہ کی مانند تمہارے پاس ہوں۔ بیٹھ جاؤ..... آرام سے بیٹھ جاؤ! یہاں تم مکمل طور پر محفوظ ہو۔ جب راعمیس تمہارے ساتھ ہوتا ہے تو ہزاروں ہاتھ تمہارے ارد گرد پھیلے ہوئے خطرات کو تم سے دور دھکیلتے رہتے ہیں۔ چنانچہ تم اپنے ذہن میں اس کا تصور بھی مت لایا کرو کہ تمہیں کوئی نقصان پہنچ سکتا ہے۔“

میں نے ٹھنڈے دل سے راعمیس کی بات پر غور کیا۔ اس کا ساتھ بعض اوقات مصیبتوں کا باعث بن جاتا تھا۔ لیکن اس کے باوجود بہت سے ایسے مسائل سامنے آتے تھے جہاں میری اپنی کوششیں بے اثر ہو جاتی تھیں اور راعمیس میری مدد کرتا تھا۔ چنانچہ اس وقت راعمیس کی قربت مجھے ناگوار نہیں گزر رہی تھی۔ بلکہ میں سوچ رہا تھا کہ اگر میں اس کا ساتھ مستقل قبول کر لوں تو خود میرے بہت سے مسائل حل ہو جائیں گے۔ بلا وجہ کی ضد اس کے اور میرے درمیان قائم رہی ہے۔ میں نے تنہا رہ کر بھی دیکھ لیا اور اس میں کوئی شک نہیں کہ ابھی زندہ تھا، محفوظ تھا۔ لیکن اس کے لئے جو جدوجہد کرنا پڑی تھی یا جس طرح میں مصیبتوں میں گرفتار ہو کر وقت گزارتا رہا تھا، اُسے میرا دل ہی جانتا تھا۔ اپنے آپ کو

بعض معاملات میں اتنا تنہا محسوس کرتا تھا کہ کوئی بات سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ کم از کم راعمیس کی قربت میں تھوڑا سا تحفظ تو حاصل رہے گا۔ تقدیر مجھے فٹ بال بنائے ہوئے تھی اور میری اپنی تمام تر کوششوں کے باوجود خود کو سنبھال نہیں سکا تھا..... تو پھر راعمیس ہی کا ساتھ کیوں نہ قبول کر لیا جائے تاکہ خطرات کم ہو جائیں.....

راعمیس جیسے میرے ذہن میں بیٹھا ہوا تھا۔ کہنے لگا۔ ”یہ بات تو تمہیں بہت پہلے سونے لینی چاہئے تھی راعمیاس! یہی سب کچھ تو میں تم سے کہتا تھا میرے دیرینہ دوست! درحقیقت تمہاری شکل و صورت ہی اس بات کی سند ہے کہ تم محفوظ رہو۔ ہاں! اگر تم نے دوبارہ اپنی صورت تبدیل کرنے کی کوشش کی تو راعمیس کی محبتیں پھر کبھی تمہیں مل سکیں گی۔ اپنی صورت تبدیل کر کے تم نے راعمیس کی محبت کا مذاق اڑایا تھا۔ بار بار میرا دل چاہا کہ تمہیں ایسی مصیبت میں پھنساؤں جس سے نکلنا ممکن نہ ہو۔ لیکن کیا کرتا؟ ایک صورت ہمیشہ ذہن میں آکر مجھے روک دیتی تھی۔“

”اب بہت زیادہ احسانات نہ جتاؤ۔ یہ بتاؤ! ہمیں کرنا کیا ہے.....؟“

”بتانا بھی ضروری ہے..... تم خود نہیں سوچ سکتے کیا کہتا رہا ہوں میں تم سے اب تک.....؟“

”میرے بھائی! ایک بات تو میں نے تجھ سے ہمیشہ کھل کر کہی ہے کہ میں راعمیاس کا ہم شکل ضرور ہوں لیکن راعمیاس نہیں ہوں۔ نہ ہی میری حیثیت کسی رُوح کی ہے۔ اگرچہ پوچھو تو میں مصیبت کا مارا وہ شخص ہوں جو دھوبی کے کتے سے بھی بدتر ہو جاتا ہے۔ تو مجھے بتا راعمیس! کہ آج تک میں اپنی مرضی سے کوئی کام کر سکا ہوں؟ اگر تو میرے ماضی کے بارے میں جانتا ہے تو اس بڑھیا کی حقیقت بھی تمہیں معلوم ہوگی جس کا نام خالہ شہادت تھا اور اس کے بعد نکلنا خلد سے آدم کا اور پہنچنا سرزمین مصر پر۔ ملنا وہاں کچھ دولت مندوں کا اور کھیلنا میری زندگی سے۔ اور اس کے بعد پہنچنا ایران ہمراہ تابوت راعمیس اور اس کے بعد جو حالات بے چارے منصور پر گزرے..... سوائے راوی خوش سخن کچھ کہو تو اس کے بارے میں کہ مقدر کس کا تھا.....؟“

”تیرا..... صرف تیرا راعمیاس!.....“

”کاش تیری کھوپڑی ہوتی اور میرے ہاتھ میں ایک ڈنڈا۔ پھر بتاتا کہ مقدر کس کا

تھا.....“

”اسی لئے تو راعمیس کو کھوپڑی ملی نہ تجھے ڈنڈا..... اے بے وقوف شخص! جب راعمیس سے تیری یاری ہوگئی اور اس نے یہ بات کہہ دی کہ وہ تیری آنکھوں سے یہ نئی دنیا دیکھنا چاہتا ہے تو پھر نخروں کی کیا ضرورت تھی؟ باقی رہے وہ اتفاقیہ حالات جن کی وجہ سے تجھے کچھ پریشانیاں اٹھانی پڑیں تو راعمیس سے الگ رہ کر تو نے کون سے تیر مار لئے؟ ہاں! یہ دوسری بات ہے کہ اپنے طور پر تو نے یہی سمجھا کہ راعمیس تیری اُن خرمستیوں سے واقف نہیں ہے جو تو کبھی کاک ٹیل پی کر اور کبھی.....“

”ارے..... ارے..... ارے! تو کیا تو اُن حالات میں بھی مجھ پر مسلط رہا ہے.....؟“

”ہاں! لیکن تیری صورت سے دُور۔ تجھ پر لعنت بھیجتا ہوا۔ کیا یہ سب کچھ میری خوشی کے لئے نہیں کیا جاسکتا تھا.....؟“

”خیر..... چھوڑو راعمیس! میں اب سچے دل سے تمہارا دوست اور تمہارا ساتھی بننے پر تیار ہوں۔ واقعہ یہی ہے کہ میں اپنی مرضی سے کچھ کرنے میں ناکام رہتا ہوں۔ اگر تمہارا وجود مجھ پر مسلط ہی رہا ہے تو تمہیں یہ بھی معلوم ہوگا کہ کیسے کیسے چکروں میں پھنسا رہا ہوں۔ اور اب جیب میں ایک بہت بڑی رقم کے ٹریولر چیک ڈالے لاگن کے اس قصبے میں اُس لونڈیا کی روٹیاں کھا رہا تھا اور لنگڑے یا غیر لنگڑے بوڑھے کی حماقتیں برداشت کر رہا تھا۔ کیسے سکی لوگوں سے واسطہ پڑا تھا۔ صاحبزادی فقیر، دادا جان لنگڑے، اور وہ متحرمہ تارتخ دان..... لیکن راعمیس! تم اُس مجسمے میں حلول کیسے کر گئے.....؟“

”سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ میں تو وہاں راعمیاس کا مجسمہ دیکھ کر تجھ سے مخاطب ہوا تھا کہ شاید تیرا ذہن کچھ متاثر ہو سکے.....“

”مگر تم یہ تو بتاؤ کہ میری آنکھوں سے جو دنیا دیکھنے کا تصور تمہارے ذہن میں ہے تو ہم اس کا آغاز کیسے کریں؟ دنیا کے کون سے شعبے کو تم سب سے پہلے دیکھنا چاہتے ہو.....؟“

”تو جس انداز میں میرے بغیر اب تک کی زندگی گزارتا رہا ہے راعمیاس! مجھے وہی سب کچھ پسند ہے۔ زمانہ قدیم میں جب ہماری حکمرانی تھی تو سازشیں، فتوحات اور جنگوں کے ساتھ ساتھ حسن و عشق کی داستانیں بھی سامنے آتی رہتی تھیں۔ لیکن یہ سب کچھ الگ

کے راستوں میں معیار و اخلاق کی رکاوٹیں پیدا کرنا شروع کیں، وہیں سے اُس کا مصنوعی پن شروع ہو جاتا ہے۔ کیا سمجھے؟ راعمیس کی اتنی سی خواہش ہے۔ بھلا اس میں ایسی کون سی بات ہے جسے تم پورا نہ کر سکو.....؟“

میں نے گہری سانس لے کر گردن ہلائی۔ ”ٹھیک ہے راعمیس! بہر طور، اب بھی ساری سچائیوں کے ساتھ تمہاری دوستی قبول کر چکا ہوں۔ لیکن مروا مت دینا.....“

”میں بھی تمہیں پورا پورا تحفظ دوں گا۔ آؤ..... اب اُٹھو! یہاں سے چلیں۔ کوئی ایسی جگہ منتخب کرتے ہیں جہاں سے ہمارے کام کا آغاز ہو۔ جس طرح بھی مناسب سمجھو، مجھ سے اس خواہش کا اظہار کر دینا۔ یوں سمجھ لو، اس کی تکمیل ہوگی اور یقیناً ہوگی۔“

میں نے گردن جھٹکی۔ اتنی بات تو میں بھی سمجھتا تھا کہ راعمیس نے جو کچھ کہا ہے، اُسے کر دکھانا اُس کے قبضہ قدرت میں ہے۔ میں نے بھی یہ فیصلہ کر لیا کہ اب جس طرح بھی ممکن ہو سکے، راعمیس کے ساتھ ہی بسر کی جائے.....

اُس کے اشارے پر میں اُٹھ کر چل پڑا۔ یہ اندازہ نہیں تھا کہ لاگن کے اس قصبے سے ہم کس طرف نکل آئے ہیں؟ یہ سب کچھ تو غیر فطری طور پر ہی ہوا تھا۔ راعمیس اس کی نشاندہی کر سکتا تھا اور وہ کمبخت اس وقت میرے دماغ میں گھسا بیٹھا تھا۔ یعنی جو کچھ میں سوچتا، اُسے سمجھنے میں کوئی دقت نہ ہوتی۔ چنانچہ اُس کی آواز اُبھری.....

”پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ یہاں سے نکل کر کسی ایسی جگہ قیام کرو جو تمہارے معیار کی ہو اور اس کے بعد حالات جس طرح بھی پیش آئیں، میں یہ نہیں کہتا کہ جان بوجھ کر کسی کو قتل کر دو یا کہیں ڈاکہ ڈالو یا زبردستی کسی جھگڑے میں کود پڑو۔ میں تو تم سے یہ کہتا ہوں کہ زندگی جس انداز میں بھی تمہیں برتے، تم اپنے آپ کو اس میں کمزور مت تصور کرو بلکہ اس کا بھرپور مقابلہ کرو۔ کسی سے بھاگنے کی ضرورت نہیں۔ میرا خیال ہے یہ آبادی دیکھو۔ یہ بھی کوئی جدید آبادی ہے۔“

راعمیس نے بائیں سمت اشارہ کیا اور یہ دیکھ کر میری آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں کہ جس جگہ ہم کھڑے ہوئے تھے، ایک عظیم الشان آبادی پھیلی ہوئی تھی..... اونچی نیچی عمارتوں اور روشن سڑکوں کی آبادی..... یقیناً یہ سویڈن کا کوئی بہت بڑا شہر تھا۔ لیکن یہ بات بھی شہر میں داخل ہونے کے بعد ہی معلوم ہوئی کہ ہم شاک ہوم پہنچ گئے ہیں۔ ناقابل یقین بات

الگ ہوتا تھا۔ موجودہ دور میں جو عجیب و غریب قوتیں اس دور کے انسانوں کو حاصل ہو رہی ہیں انہوں نے شاید تمام کیفیات کو یکجا کر دیا ہے اور سب کچھ ساتھ ساتھ ہی چلتا ہے۔ زندگی جس میں تو مختلف لوگوں کا آلہ کار بنا رہا ہے، کون سی شے سے محروم تھی؟ مہم جوئی کے لئے طرح طرح کی ہنگامہ خیزیاں، سیر و سیاحت، حسن اور عشق کے لئے نئی نئی حسنائیں جنگ و جدل کے لئے ہر گلی کوچہ و بازار..... ہم تو اپنے دور میں لڑاکوں کا بندوبست کرتے تھے اور پھر ایرینا میں باقاعدہ اُن کی جنگوں کا انتظام کرتے تھے۔ لیکن یہاں تو چلتے پھرتے اُٹھتے بیٹھتے بازاروں اور گلیوں میں دس بیس قتل ہو جاتے ہیں۔ دو چار افراد مر جاتے ہیں۔ ہنگامہ خیزیاں ہوتی ہیں، سازشیں ہوتی ہیں، مہمات سرانجام دی جاتی ہیں۔ یہی سب کچھ میری پسند ہے۔ آج تک تو لوگوں کا محکوم رہ کر یہ سب کچھ کرتا رہا ہے۔ جس نے تجھے جو دیا، تو بن گیا۔ لیکن اگر راعمیس کا سچا ساتھ قبول کر لے تو لوگ تیرے محکوم ہوں گے اور اُن پر حکمرانی کر سکے گا.....“

”میرے پیارے بھائی! میں ذات کا جولا ہا ہوں یا کمہار یا پھر تیلی..... ہو سکتا ہے زاد فراہم میں یہ تینوں ذاتیں ہلکی نہ سمجھی جاتی ہوں یا پھر ممکن ہے ان کا وجود نہ ہو۔ لیکن جب زمانے میں یہ تینوں ذاتیں ذات شریف تصور کی جاتی ہیں اور ان میں حکمرانی کے جراثیم نہیں ہوتے۔ چنانچہ یہ جرثومے کہاں سے لائے جائیں؟ ہاں! یہ دوسری بات ہے کہ اگر دنیا میں جرائم پیشہ افراد کی کمی نہیں ہے۔ ہر قسم کے جرم ہوتے ہیں۔ سیاسی، سماجی، معاشرتی انسانی جرائم وغیرہ۔ ہر طرح کے مجرم با آسانی کسی بھی جگہ دستیاب ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ اگر یہی زندگی تمہیں پسند ہے تو پھر ٹھیک ہے۔ کل سے میں بھی اپنا نام سینڈو خان رکھ لے ہوں اور نکل پڑتا ہوں میدانِ عمل میں۔ کیا خیال ہے.....؟“

”بالکل ٹھیک۔ میں تجھ سے متفق ہوں۔ اور سینڈو خان کا دستِ راست راعمیس ہوگا۔ سینڈو خان جو کچھ کرے گا، راعمیس اُس میں اس کا ساتھی ہوگا۔ جہاں سینڈو خان سے غلطی ہوئی یا اُسے کوئی خطرہ درپیش ہوا، راعمیس آگے بڑھ کر اس خطرے کو سنبھالے گا۔ خان کو ایک لمحے کے لئے بھی خوفزدہ نہیں ہونا چاہئے۔ اس بار شاید اُسے زیادہ ت کا سامنا بھی نہ کرنا پڑے۔ زندگی کو میرے دوست! اس انداز میں آگے بڑھنا جس طرح وہ بڑھنا چاہتی ہے۔ اس میں حقیقی زندگی کا لطف آ سکتا ہے۔ جہاں تم نے

تھی..... لیکن راعمیس کا ساتھ ہر طرح کی ناقابل یقین کہانیوں ہی کو جنم دیتا تھا۔ چنانچہ میں نے اس پر حیرت کا اظہار نہیں کیا۔ راعمیس سے اس بارے میں مشورہ کیا تو وہ خاموش رہی رہا۔

شاہک ہوم میری نگاہوں کے سامنے تھا..... معمولی شہر نہیں تھا۔ اس کی ترتیب دیکھ دیکھ کر مجھے چکر آ رہے تھے۔ بلاشبہ اُسے ان علاقوں کا سب سے حسین ترین شہر کہا جاسکتا تھا۔ اور پھر میں رقم حاصل کرنے کی کوششوں میں مصروف ہو گیا۔ کوئی دقت پیش نہیں آئی۔ کم از کم شاہک ہوم جیسے مہنگے شہر میں میرے پاس موجود رقم میری بہترین کفالت کر سکتی تھی۔ چنانچہ وہاں کے سب سے شاندار ہوٹل برگنزا میں، میں نے اپنے لئے ایک کمرہ حاصل کر لیا اور غسل وغیرہ سے فارغ ہو کر آرام کرنے لیٹ گیا۔ سوکر اٹھا تو بدن کی ٹھنڈک نے بتایا کہ راعمیس موجود ہے۔ اب اس سے کسی قسم کی باز پرس مناسب نہیں تھی۔ تاہم میں نے بھاری لہجے میں کہا۔

”تم مجھے شاہک ہوم میں چھوڑ کر کہاں غائب ہو گئے تھے راعمیس؟“

”ہاں..... میں ذرا چلا گیا تھا.....“

”کہاں.....؟“

”یہ مت پوچھا کرو مجھ سے راعمیس! رُوحوں کی دنیا میں بے شمار باتیں ایسی ہوتی ہیں جو ذی رُوحوں کو نہیں بتائی جاسکتیں۔ بس! یوں سمجھ لو کہ مجھ پر بھی کچھ مجبوریاں مسلط ہیں اور اسی لئے کسی بھی وقت، کسی بھی لمحے میں تم سے جدا ہو سکتا ہوں۔ لیکن بہت طویل عرصے کے لئے نہیں۔ دراصل راعمیس! تم مکمل طور پر اپنی زندگی گزارو۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں ہو گا۔ اب تم نے یہاں کے سب سے خوبصورت ہوٹل کا انتخاب کیا، مجھے یہ بات پسند آئی۔ تمہارے پاس اپنا بھی بہت کچھ ہے۔ لیکن جن چیزوں کی یہاں ضرورت پیش آتی ہے، اُن کے بارے میں، میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ اُن کا حصول تمہارے لئے کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ آرام سے اس ہوٹل میں زندگی گزارو۔ جو باتیں تم سے میں کہہ چکا ہوں، اُس پر نگاہ رکھو۔ باقی اور کوئی خاص بات نہیں ہے۔“

”اور اگر کوئی ایسا لمحہ ہو، جبکہ مجھے قتل کیا جانے والا ہو اور تمہاری مجبوریاں تمہیں مجھ سے دُور لے جائیں، اُس وقت مجھے کیا کرنا چاہئے؟“ میں نے سوال کیا۔

”خود پر انحصار کرو۔ کیونکہ ہر شخص کو جینے کا ڈھنگ آنا چاہئے۔ میں تو صرف تمہارا ایک ساتھی، ایک مددگار ہوں اور دنیا میں کوئی ایسا ساتھی نہیں ہوتا جو ایک ایک لمحہ مدد کے لئے آمادہ رہے یہاں تک کہ تاریکی میں سایہ بھی جدا ہو جاتا ہے۔ میں تو تم سے یہ بھی نہیں کہہ سکتا کہ تم مجھے اپنا سایہ تصور کرو۔ لیکن ان تمام باتوں کے ساتھ ساتھ میں اپنے طور پر تمہارا ساتھ کبھی نہیں چھوڑوں گا راعمیس.....“

”ٹھیک ہے..... ٹھیک ہے..... میں تم سے متفق ہوں۔ میں اب نہیں چاہتا کہ میرے اور تمہارے درمیان کوئی اختلافی مسئلہ پیدا ہو۔“

”ہونا بھی نہیں چاہئے.....“ اُس نے جواب دیا۔

☆.....☆.....☆

دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد میں تیار ہو کر شاہک ہوم کی سڑکوں پر نکل آیا۔ خریداری بھی کرنی تھی۔ کیونکہ میرے پاس ڈھنگ کے لباس نہیں تھے۔ چنانچہ میں نے بازار سے خاصی زبردست خریداری کی اور واپس ہوٹل پہنچ گیا۔ اس تھوڑی سی ہی مٹرگشت نے مجھے یہ احساس دلا دیا تھا کہ شاہک ہوم کی زندگی الٹی گنگا کی مانند ہے۔ یعنی یہاں عورتوں کا راج تھا۔ مردوں کی حیثیت نئی نویلی نوجوان لڑکیوں کی مانند..... جنہیں قدم قدم پر خطرات درپیش ہوتے ہیں۔

شام تقریباً ساڑھے چھ بجے جب آسمان سے ہلکی ہلکی سی بوندیں برس رہی تھیں، میں موسم کی مناسبت سے لباس پہن کر برگنزا کے نچلے حصے میں آ گیا۔ میری نگاہیں چاروں طرف کا جائزہ لینے لگیں..... ابھی زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ ایک ویٹر میرے قریب پہنچ گیا۔ ”جناب! وہ سامنے والی میز پر موجود محترمہ آپ کے ساتھ وقت گزارنا چاہتی ہیں۔“ میں نے تعجب خیز انداز میں اُس طرف دیکھا تو تقریباً چالیس بیالیس سالہ ایک خاتون میک اپ میں لتھڑی، مسکراتی نگاہوں سے مجھے دیکھ رہی تھیں۔ میں اُٹھ کر اُن کے قریب پہنچ گیا۔ اس صورت میں میرے لئے کوئی شناسائی نہیں تھی۔ خاتون نے لہک کر میرا استقبال کیا۔

”میرا نام بریگیتا ہے۔“

”جی مجھے مون کہتے ہیں.....“

”ویری گڈ..... آپ کا نام بہت خوبصورت ہے.....“

”کیا آپ نے مجھے میرے نام کی خوبصورتی کی اطلاع دینے کے لئے ہی یہاں بلایا ہے.....؟“

”نہیں..... بلکہ اپنی تنہائی دور کرنے کے لئے۔“ خاتون کی آنکھوں سے ایسے تاثرات جھلک رہے تھے کہ میرے معدے میں ہلچل مچ گئی۔

”اگر مجھ سے کوئی کام ہے تو براہ کرم مجھے بتائیے۔ میرا خیال ہے اس سے پہلے ہی آپ سے کبھی متعارف نہیں ہوا۔“

”تمہارا حسین چہرہ ہی تمہارا تعارف ہے مسٹر مون! بس میں چاہتی ہوں کہ یہ شام اور یہ رات تمہارے ساتھ بسر ہو۔“

بظاہر لگتا یوں تھا جیسے یہ خاتون اپنی زندگی کے آخری لمحات کسی دیرینہ خواہش کی تکمیل کے گزارنا چاہتی ہیں۔ میں آہستہ سے اُن کی میز سے اُٹھ گیا۔ ”کسی کو بلانے سے پہلے اپنی حقیقت ضرور واضح کر دیا کریں، کہیں ایسا نہ ہو کہ کوئی آپ کا سر اُس عقبی دیوار پر دھک مارے.....“ محترمہ کا منہ حیرت سے کھلا اور میرے کانوں میں راعمیس کا قہقہہ گونج اُٹھا۔ میں جھلایا ہوا اپنی میز پر واپس آ بیٹھا۔

”اُن سے برگشتگی کا اظہار نہ کرو جو زندہ ہوں، اگر دل زندہ ہوتا ہے تو اُس کی آرزوئیں بھی جنم لیتی ہیں۔ اور تمہاری شخصیت اُن خاتون کو پسند آئی تھی.....“

”یار راعمیس! اُس عورت کے ذہن میں کچھ اور تو نہیں تھا؟ میں تو یہ سوچ کر اُس کے پاس گیا تھا کہ ممکن ہے یہ میری کوئی دیرینہ شناسا ہو۔ یعنی وہ جسے میں نہ جانتا ہوں اور مجھے جانتی ہو۔ لیکن اس دل والی بوڑھی کی حرکتیں تو ناقابل برداشت تھیں۔“

راعمیس کا دوسرا قہقہہ بلند ہوا۔ اُس نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”نہیں..... تمہارے سلسلے وہ بڑی نیک دلی سے سوچ رہی ہے اور صرف تمہارے ساتھ کی خواہش مند ہے.....“

”تو پھر میرا خیال ہے مجھے یہاں سے اُٹھ جانا چاہئے.....“

”ہاں..... یہ بوڑھوں کا ہال ہے اور یہاں زیادہ تر زندگی کی بازی ہارنے والے بوڑھیاں کسی اور نئی بازی لگانے کا انتظار کرتی ہیں۔ چلو..... یہاں سے کہیں اور چلو۔“

راعمیس انسانی وجود میں میرے ساتھ نہیں تھا۔ لیکن جب وہ میرے قریب ہوتا تو

یوں محسوس ہوتا جیسے وہ میرے قدم بہ قدم چل رہا ہو اور میں چاہوں تو اُسے چھو لوں۔ جبکہ یہ سب کچھ ممکن نہیں تھا۔ بارش کچھ تیز ہو گئی تھی۔ اس لئے باہر جانے کا وقت نہ تھا۔ ہال میں جگہ جگہ مختلف پروگرام ہو رہے تھے۔ بالآخر میں ڈسکوروم میں پہنچ گیا اور یہاں برپا طوفان بدتمیزی دیکھتا رہا۔ یہیں میں نے رات کا کھانا کھایا۔ لوگ مجھے تنہا سمجھ رہے تھے۔ اور بے شمار دل والیوں نے میری اس تنہائی پر رحم کھا کر اُسے دور کرنے کی پیشکش کی تھی۔ لیکن ایش کی کاک ٹیل ہر جگہ تو قابل قبول نہیں ہوتی۔ چنانچہ میں نے اُن سے معذرت کر لی اور وہ حیرت سے مجھے دیکھتی ہوئی آگے بڑھ گئیں۔

برگنزا کا قیام کسی بھی طرح ناقابل قبول نہیں تھا۔ یہاں تین دن گزر گئے تھے اور ان تین دنوں میں، میں نے خود کو انتہائی بہتر محسوس کیا تھا کیونکہ ان دنوں ذہن پر کوئی بوجھ نہیں تھا۔ ایک شہزادے ہی کی مانند زندگی گزار رہا تھا۔ اس دوران شاک ہوم کے زیادہ وسیع علاقے نہیں دیکھے تھے۔ بس! دو تین بار ہی باہر نکلا تھا۔ سوئڈن کی دل پھینک لڑکیاں میری جانب متوجہ رہتی تھیں۔ بعد میں مجھے اس کے بارے میں معلوم ہوا کہ یہاں کی زیادہ تر آبادی خاص طور سے لڑکیاں کالے بال، کالی آنکھوں اور گندمی رنگت پر مرتی ہیں..... سرخ، سنہرے، بھورے بال اور آنکھیں دیکھ کر وہ اُکتا گئی تھیں۔ بہر طور! یہ لمحات بھی نا پسندیدہ نہیں تھے۔

اس کے بعد میں نے فیصلہ کیا کہ ایک سیاح کی حیثیت سے شاک ہوم اور اُس کے نواح کا جائزہ لوں۔ میں نے شاک ہوم کے نقشے طلب کئے اور اُن کی مدد سے سیاحت کا ایک پروگرام بنا ڈالا۔ برگنزا سے مجھے کرائے کی کار فوراً ہی حاصل ہو گئی تھی۔ اور دلچسپ بات یہ تھی کہ اُس کی ڈرائیور ایک جوان لڑکی تھی۔ اُس کا نام سونکا تھا۔ سونکا صرف ڈرائیور ہی نہیں، گائیڈ بھی تھی۔ چنانچہ وہ مجھے لئے ہوئے شاک ہوم کے مختلف علاقوں میں گھومتی پھری۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ تعلیم یافتہ لڑکی ہے اور گفتگو کے دوران اُس کی باتوں سے علمیت جھلکنے لگتی تھی.....

”سوئڈن اخلاقی قدروں سے جنگ کرتا ہوا بہت آگے نکل گیا ہے۔ اور اب وہ واپسی کے راستے چاہتا ہے۔ لیکن نئی نسل واپسی کے راستے گم کر چکی ہے۔ جنس اپنی کشش کھو چکی ہے اور سمجھ میں نہیں آتا کہ اب کوئی کیا کرے؟ بھٹکی نسل کچھ کر کے رہے گی۔ کیونکہ یہ مایوسی

صرف تباہی کا پیغام ہوتی ہے۔“ اُس نے کہا۔

”تم اس عمر کی نمائندگی کر رہی ہو.....؟“

”ہاں! میں خود کو اُن سے الگ تو نہیں کہتی۔“ اُس نے کہا۔

”مگر تم پرسکون ہو۔“

”سکون کے اس مصنوعی خول کے دوسری طرف دیکھنا چاہتے ہو.....؟“ اُس نے

چمکدار آنکھوں سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔

میں نے گھبرا کر نفی میں گردن ہلا دی۔ ”نہیں نہیں..... میں تو صرف تمہارے خیال

پوچھ رہا تھا۔“

وہ ہنس پڑی۔ اس کے بعد سویڈن کی نئی نسل کے بارے میں مزید کچھ پوچھنے کی جرات

نہیں ہوئی تھی۔ لیکن سوچنے کے لئے سوچنے کو بہت کچھ چھوڑ دیا تھا۔

سٹاک ہوم بھی جزیروں کا شہر تھا جسے مخصوص طرز کے پُل ایک دوسرے سے ملا

تھے۔ شہر کی مشہور سڑک کنگ گاٹن، کانفرٹ ہال، کبڑا پُل، سپ کا وہ ڈیپارٹمنٹل سٹور جہاں

دنیا کی مشہور ترین شخصیتیں آچکی تھیں، اُن کی تصاویر بھی وہاں آویزاں تھیں۔ سوچا مجھے

جگہ کے بارے میں تفصیلات بتاتی جا رہی تھی۔ پھر اُس نے مجھ سے شہزادہ یوجین کا

دیکھنے کی بات کی اور میں نے گردن ہلاتے ہوئے کہا کہ اب تو میری نکیل اُس کے ہاتھ

میں ہے۔ جہاں اُس کا جی چاہے، لے جائے..... چنانچہ ہم شہزادہ یوجین کے محل کی جانب

چل پڑے جو گھنے درختوں اور سرسبز پہاڑیوں کے درمیان واقع ہے۔ یہاں سے سمندر

ایک شاخ نہر کی صورت میں سٹاک ہوم میں داخل ہوتی ہے۔ ٹیلوں کے تختوں اور بلند

درختوں کے درمیان چلتے ہوئے ہم سمندر کے کنارے آگئے جہاں بے شمار لوگ بچوں

بیٹھے دھوپ اور تازہ سمندری ہوا سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ سوچا اب صرف اب

ڈرائیور نہیں رہی تھی، بلکہ اُس کی حیثیت ایک دوست کی سی ہو گئی تھی۔

ہم ساحل کے ساتھ پانی میں ابھری ہوئی ایک چٹان پر بیٹھ گئے اور مختلف موضوعات

باتیں کرتے رہے۔ اس خطرناک صورت حال کے بعد سوچنے نے پھر کوئی ایسی بات نہیں

تھی جو باعث پریشانی ہوتی۔ نجانے کتنی دیر ہم وہاں موجود رہے۔ پھر سورج ڈھل گیا۔

کہنے لگی۔

”یہ موسم سویڈن کے رہنے والوں کے لئے بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ دھوپ نظر آگئی تو

یوں سمجھو عید ہو گئی۔ ورنہ موسم سرما کے بعد نیلے طوفان اور مہینوں نظر نہ آنے والا سورج.....

زندگی بھی منجمد ہو کر رہ جاتی ہے۔ ہر چند کہ کاروبار زندگی چلتا رہتا ہے۔ لیکن دلوں میں کوئی

امنگ نہیں ہوتی۔“

کافی دیر تک وہاں بیٹھے رہنے کے بعد ہم ایک ایسی جگہ پہنچے جو درختوں میں گھری ہوئی

تھی۔ اور وہاں سوچنے نے اپنی گہری چمکدار آنکھوں کے ساتھ مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”برگنزا

میں بے شمار مسافر آتے ہیں، قیام کرتے ہیں اور اُن میں سے لا تعداد کے لئے میں ہی

ڈرائیور ہوتی ہوں۔ ہوٹل والے خاص طور سے میرا انتخاب کرتے ہیں کہ میں دنیا کی پانچ

زبانیں جانتی ہوں۔ اور جو لوگ صاحب حیثیت ہوتے ہیں، وہ اپنی گڈ بک میں ہوٹل

برگنزا کا نام لکھ کر لے جاتے ہیں اور اس کے بعد اگر اُن کا کوئی دوست یا بذات خود وہ کبھی

سٹاک ہوم کا رخ کرتے ہیں تو برگنزا کے قیام کو اولیت دیتے ہیں..... میں نہ صرف ایک

اچھی ڈرائیور ہوں بلکہ ایک اچھی گائیڈ بھی ہوں، اور ایک اچھی ساتھی بھی۔ میرے پاس

اس کی کئی سندیں ہیں۔ لیکن ایک بات کہوں مسٹر! تم بھی میری زندگی کی کتاب میں اپنا ایک

ورق چھوڑے جا رہے ہو جبکہ میں کبھی زندگی کی ڈائری نہیں لکھتی.....“

”مطلب؟“

”مطلب یہ کہ میں اپنی ڈائری کے اس ورق پر لکھوں گی کہ میں وہ ہستی ہوں، جسے خلاء

کے ایک نامعلوم سیارے سے آنے والے کا قرب نصیب ہوا اور وہ اس دنیا کے رہنے

والوں سے بالکل مختلف تھا۔ جو ان نسل میں خواہ اُس کا تعلق زمین کے کسی حصے سے ہو، عیش

پسندی کوٹ کوٹ کر بھری ہوتی ہے اور تنہائیاں اُس کے ہوش و حواس چھین لیتی ہیں۔ لیکن

کوئی بھی تنہائی، کوئی بھی لفظ تمہیں متاثر نہیں کرتا۔ میں مسلسل محسوس کر رہی ہوں کہ تمہاری

نگاہ ایک بار بھی مجھ پر اس انداز میں نہیں پڑی جس کی میں متوقع تھی۔“

میں نے اس بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ اُس کی اس بات کا تو میں پہلے سے ہی قائل

تھا کہ وہ تعلیم یافتہ ہے اور اپنی بات ڈھنگ سے کہنا جانتی ہے۔ اور اُس نے جس انداز میں

مجھ سے اپنے وجود کے خول توڑنے کے لئے کہا تھا، اُس نے مجھے دہشت زدہ بھی کر دیا

تھا۔ میں بھلا اُس کی اس کیفیت کو کیسے سنبھال سکتا تھا؟ یہاں پھر وہی الفاظ شروع ہو گئے

تھے۔

دفعۃً میں نے کچھ محسوس کیا اور گہرے گہرے سانس لینے لگا۔ اطراف میں درختوں چھننے والی خوشبوئیں بکھری ہوئی تھیں۔ لیکن ایک عجیب سی بدبو ان فضاؤں میں شامل تھی اور میں نے اُسے محسوس کیا تھا۔ شاید سوئیا نے بھی اس بدبو کو محسوس کر لیا اور گردن کرادھر ادھر دیکھنے لگی۔

”ایک بدبو سی ہے یہاں....“

”ہاں....“

”کیا یہ سڑے ہوئے گوشت کی بدبو نہیں ہے؟“

”لگتا تو ایسا ہی ہے۔“

”حالانکہ یہ ممکن نہیں ہے۔“ اُس نے چاروں طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ میرے ذہن میں بھی تجسس پیدا ہو گیا تھا۔ چنانچہ ہم دونوں اس بدبو کا سراغ لگانے چل پڑے۔ اور کے لئے ہمیں زیادہ دُور نہیں جانا پڑا تھا۔ سوئیا ٹھٹک کر رُک گئی۔ پھولوں کے کنج کے دو سفید پاؤں مڑے مڑے نظر آ رہے تھے اور اس بات میں کوئی شک و شبہ نہیں تھا کہ وہ انسانی لاش ہے جو کئی دن سے یہاں پڑی ہوئی ہے اور یہ بدبو اُسی لاش کی ہے۔

”ہم کسی مصیبت میں نہ پھنس جائیں۔ کیا خیال ہے، واپس چلیں؟“

”ہونا تو یہی چاہئے۔ لیکن کیا اس سلسلے میں اپنے فرائض پورے نہیں کرو گی؟“

اُس نے عجیب سی نگاہوں سے مجھے دیکھا اور پھر شرمندہ سی ہو کر آگے بڑھ گئی۔ تھوڑے دیر کے بعد ہم پھولوں کے کنج کے پاس تھے۔ کنج بہت زیادہ گھنے نہیں تھے۔ لاش کو ان ٹھونس دیا گیا تھا۔ لیکن اُسے بخوبی دیکھا جاسکتا تھا اس میں سے بدبو بے شک اُٹھ رہی تھی۔ لیکن لاش کا چہرہ بھیانک نہیں ہوا تھا۔ وہ کسی لڑکی کی لاش تھی۔ میں نے اُسے دیکھا اور محسوس ہوا جیسے کوئی انتہائی گرم شے میں نے بے دھیانی میں اپنے حلق سے نیچے اتار دیا اور وہ سینہ، دل، پھیپھڑے اور کلیجہ جلاتی ہوئی معدے تک پہنچ رہی ہو۔ کچھ ایسی ہی کیفیت پیدا ہو گئی تھی میرے اندر۔ کیونکہ وہ چہرہ میرے لئے اجنبی نہیں تھا..... میں نے چہرے کو چھوڑ کر بہت دُور بھاگ آیا تھا، یہ سوچ کر کہ سارے جہاں کا درد میرے ذہن میں کیوں ہو..... لیکن یہاں شاک ہوم میں شہزادہ یوجین کے اس محل کے پاس مظلمہ

لاش کہاں سے آگئی....؟

ہاں..... یہ کبھی ہی تھی، جس کے سینے میں انتقام کا سمندر موجزن تھا اور جو اپنے بھائی بیل کیروسا کی موت کا انتقام لینا چاہتی تھی۔ جس کے لئے اُس نے میری امداد طلب کی تھی۔ میں نے بغور اُسے دیکھا۔ کبھی کے بدن پر چاقوؤں کے لاتعداد نشانات تھے اور یہی نشانات اُس کی موت کا سبب بنے تھے.....

سوئیا سہمی ہوئی نگاہوں سے اُس لاش کو دیکھ رہی تھی۔ پھر اُس نے انہی نگاہوں سے میری جانب دیکھا اور آہستہ سے بولی۔ ”مظلوم لڑکی کئی دن پہلے قتل کی گئی ہے۔ لیکن ہمیں یہاں سے ہٹ جانا چاہئے۔ تم موقع کی نزاکتوں کو نہیں سمجھتے۔ بعض اوقات زیادہ انسانیت بھی گلے پڑ جاتی ہے۔“

”وہ تو ٹھیک ہے سوئیا! لیکن کیا اس لاش کو اس طرح بے گور و کفن چھوڑ دیا جائے.....؟“

”اسے زمین کی گہرائیوں میں دفن کر کے تم صرف اپنے ضمیر کو تسکین دے سکتے ہو۔ اس سے زیادہ اب میں یا تم کیا کر سکتے ہیں..... بہتر یہ ہے کہ کسی پبلک کال بوتھ سے پولیس کو ٹیلی فون کر دو..... میں اس سلسلے میں تمہاری مدد کرتی ہوں۔ پولیس خود اُسے سنبھال لے گی۔“

میں نے متاسف انداز میں گردن ہلائی۔ بے چاری سوئیا کو کیا پتہ تھا کہ میں خود بھی اس سلسلے میں تھوڑا سا مجرم ہوں۔ کبھی کو اگر میں اُس کے بھائی کے قاتلوں کے سلسلے میں کوئی مدد نہیں دے سکتا تھا تو کم از کم اُسے تسلیاں دے کر اُس کا یہ جنون تو ختم کر سکتا تھا کہ وہ کسی باقاعدہ گروہ سے انتقام لینے کا ارادہ ترک کر دے۔ ہو سکتا تھا کہ میرے محبت بھرے انداز سے اُس کے خیال میں کچھ تبدیلیاں پیدا ہو جاتیں۔ اب یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ وہ اپنے اسی جنون کا شکار ہوئی۔ ایک بے بس لڑکی کر بھی کیا سکتی تھی؟ ابھی یہی سوچ رہا تھا کہ قدموں کی آوازیں سنائی دیں اور ہم دونوں ہی چونک کر پلٹے۔

پولیس کی وردی میں ملبوس چند افراد ہمارے عقب میں پہنچ گئے تھے۔ اُن میں سے ایک بھاری بدن کے بڑی بڑی مونچھوں والے شخص نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔ ”لاش اور تم دونوں..... واہ..... کب قتل کیا تھا اسے؟ کیا تلاش کرنے آئے تھے اس کے پاس.....؟“

”اوہ..... دیکھئے جناب! ہم دونوں تو..... میرا مطلب ہے یہ صرف سیاح ہیں اور یہاں شہزادہ یوجین کا محل دیکھنے آئے تھے۔ ہواؤں کے دوش پر تیرتی ہوئی بونے ہمیں ہر طرف متوجہ کیا اور ہم یہاں نکل آئے۔ معاف کیجئے گا..... ہمارا اس لاش سے کوئی تعلق نہیں ہے اور ہم پولیس کو اطلاع دینے کا ہی فیصلہ کر رہے تھے۔“

”خوب اتفاق کی بات ہے کہ پولیس خود ہی تمہاری خدمت کے لئے یہاں پہنچ گئی۔ چلو..... آ جاؤ!“

”آپ غلط سمجھ رہے ہیں جناب! میں ہوٹل برگنزا کی ملازم ڈرائیور ہوں اور آج مارا دن اپنے مہمان کو شاک ہوم کی سیر کراتی رہی ہوں۔ آپ ہوٹل کو رنگ کر کے.....“

”بے بی! یہ ساری باتیں پولیس با آسانی معلوم کر لے گی۔ فی الحال تم ہماری مدد کرو اور ہمارے ساتھ چلو۔ تم لوگ لاش کا بندوبست کرو.....“ پولیس آفیسر نے اپنے ساتو موجود دوسرے لوگوں سے کہا۔

سونکا بری طرح گھبرا گئی تھی۔ اُس سے اُس کی گاڑی کے بارے میں پوچھا گیا تو اُس نے ایک طرف اشارہ کر کے کہا کہ ہوٹل کی گاڑی وہاں موجود ہے۔ تب پولیس آفیسر نے اپنے دو آدمیوں کو اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”تم میڈم کے ساتھ ہوٹل کی گاڑی میں پہنچو! میں ان صاحب کو لئے جا رہا ہوں۔“

چند ساعتوں کے لئے تو میرے اوسان بھی خطا ہو گئے تھے۔ لیکن اس کے بعد میں سکون ہو گیا۔ ظاہر ہے کہیمی کو میں نے قتل نہیں کیا تھا اور پولیس میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتی تھی۔ اگر حالات نے کوئی غلط صورت اختیار بھی کی تو اب میں اتنا لاوارث نہیں تھا۔ چنانچہ خاموشی سے اُن کے ساتھ چل پڑا۔

پولیس کی بڑی دین میں مجھے بٹھا دیا گیا۔ سونکا کو وہ لوگ ہوٹل کی گاڑی میں لارے تھے۔ پولیس آفیسر میرے ساتھ ہی بیٹھ گیا تھا اور دلچسپ نگاہوں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ اُس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”تم غالباً انڈین ہو.....“

میں نے سنجیدہ نگاہوں سے اُسے دیکھا اور پھر آہستہ سے بولا۔ ”جی نہیں! میرا تعلق پاکستان سے ہے.....“

”اوہ، اوہ..... سمجھ گیا۔ ہمارا اندازہ بالکل درست تھا۔“ پولیس آفیسر بولا۔

”کیا مطلب..... جو کچھ سمجھ گئے ہو، مجھے بھی سمجھانے کی کوشش کرو۔ میں نے تلخ لہجے میں کہا۔“

”اتنی جلدی بھی کیا ہے جناب! پولیس سٹیشن پہنچ کر سب کچھ آپ کی سمجھ میں آ جائے گا اور ہمیں زحمت کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔“

میں نے تلخ انداز میں مسکراتے ہوئے کہا۔ ”اس کا مطلب ہے کہ پولیس کی ڈیوٹی ہر جگہ یکساں ہی ہوتی ہے۔“ میری اس بات کو شاید وہ نہیں سمجھ سکا تھا۔ لیکن میں نے بھی اپنے جملے کی وضاحت نہیں کی۔

تھوڑی دیر کے بعد پولیس دین غالباً اُس عمارت میں داخل ہو گئی جو پولیس سٹیشن کی عمارت تھی۔ پولیس آفیسر نے مجھ سے نیچے اترنے کے لئے کہا۔ مسلح پولیس مین، دین کے آس پاس کھڑے ہوئے تھے۔ لیکن یہ عمارت پولیس سٹیشن کی عمارت نظر نہیں آتی تھی۔ مجھے اندر چلنے کا اشارہ کیا گیا۔ چونکہ میں ان علاقوں کے بارے میں بہت زیادہ جانتا تھا اس لئے میں نے تعرض نہیں کیا۔ مجھے عمارت کے اندرونی حصے میں لایا گیا۔ کہیں کوئی دفتر نہیں تھا۔ ایک رہائشی عمارت محسوس ہوتی تھی۔ وہ لوگ مجھے لئے ہوئے عمارت کے انتہائی اندرونی گوشے میں پہنچے اور پھر مجھ سے ایک کمرے میں چلنے کے لئے کہا گیا۔

کمرہ اندر سے خالی تھا۔ اس سے قبل کہ میں چونک کر پلٹتا، دروازہ باہر سے بند کر دیا گیا۔ اور میں احمقوں کی طرح کھڑا رہ گیا۔ یہ کیسی پولیس تھی جس نے مجھے اپنا پرائیویٹ قیدی بنا لیا تھا۔ غصے کے عالم میں، میں نے بار بار دروازہ پیٹا لیکن مجھے کوئی جواب نہ ملا۔ اور اب ذہن کے گوشے سے یہ آواز ابھر رہی تھی کہ معاملہ پولیس کا نہیں ہے۔ بلکہ یقیناً کوئی گھپلا ہوا ہے..... میں نے اتنا ہی سوچا تھا کہ راعمیس کہنے لگا۔

”ہاں! یہ لوگ پولیس والے نہیں ہے۔ بلکہ معاملہ واقعی کچھ مختلف ہے۔“

”اور تم نے مجھے بروقت خبردار نہیں کیا.....؟“

”کیا کرتے؟ وہ تعداد میں کئی تھے۔ مسلح تھے۔ مشکل ہی تھی تمہارے لئے۔“

”تمہارے لئے بھی مشکل تھی؟“

”ہاں بھئی! کیوں نہیں..... جو کچھ میں کر سکتا ہوں، وہ اتنا ہی ہے کہ پجوشن تبدیل کر دوں۔ لیکن اگر کسی گوشے سے گولی چلے اور تمہارے بدن میں پیوست ہو جائے تو اس وقت

میں کیا کر سکتا ہوں..... لیکن گھبرانے کی بات نہیں۔ کم از کم اس بات پر اطمینان رکھو کہ لوگ تمہیں نقصان نہیں پہنچا سکیں گے۔ میں چلتا ہوں۔ تم فکر مند نہ ہونا۔ میں ذرا اُن کی حقیقت معلوم کروں۔“ راعمیس کی آواز معدوم ہو گئی اور میں ایک گہری سانس لے کر کمرے کے اندرونی ماحول کی جانب متوجہ ہو گیا.....

کمرے میں قالین کے علاوہ کچھ نہیں تھا۔ کوئی فرنیچر یا کوئی ڈیکوریشن پیس ٹائپ کی چیز کا یہاں کوئی وجود نہیں تھا۔ مجھے حیرت ہو رہی تھی کہ پولیس کی وردی میں یہ کون لوگ تھے جو دھڑلے سے کام کر رہے ہیں اور پھر سب سے حیرت ناک بات یہ تھی کہ اُنہوں نے مجھے کیوں پکڑ لیا..... کیا چکر ہے؟ کبھی سے میرا تعلق کیا اُن کے علم میں آ گیا ہے؟ بے شمار سوالات تھے، جن میں سرکھپانا حماقت تھی۔ کیونکہ اس کا کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہو سکتا تھا۔ چنانچہ قالین پر بیٹھ کر میں نے دیوار سے ٹیک لگائی اور آنکھیں بند کر لیں۔ ذہن کو آزاد چھوڑ دیا۔ کیا فائدہ..... جتنا وقت سکون سے گزارا تھا، اُس کی یاد ہی کافی تھی۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ نئے ہنگامے کیا ہوتے ہیں؟ اندازہ تو یہی تھا کہ یہ لوگ وہی ہیں جو نیل کیروسا کے قاتل تھے اور اُس کے بعد انہوں نے اُس کی بہن کو بھی ہلاک کر دیا..... لیکن میری گرفتاری میرے لئے ناقابل فہم تھی۔

پھر مجھے سوچنا کا خیال آیا۔ ہوٹل کی یہ پڑھی لکھی ڈرائیور اب اپنی ساری منطق بھول جائے گی۔ نئی نسل کے المیے کے بارے اُس نے بڑی عالمانہ گفتگو کی تھی۔ اب اُس کی علمیت جرم کی اس دنیا کے سلسلے میں کیا کہتی ہے؟ یہ سوال میں اُس سے ضرور کروں گا..... لیکن وہ میرے ساتھ یہاں نہیں پہنچی حالانکہ اُسے میرے ساتھ ہی لایا گیا تھا۔ اس بات کے امکانات بھی تھے کہ اُسے الگ رکھا گیا ہو۔ یہاں آ جاتی تو کم از کم تنہائی ہی ختم ہو جاتی۔ اور اس سے اس موضوع پر بھی تھوڑی سی بحث ہو جاتی۔

جانے کتنے گھنٹے مجھے اُس قید خانے میں گزارنے پڑے۔ اس کے بعد دروازہ کھلا اور ایک بڑی مونچھوں والے نے مجھے باہر آنے کے لئے کہا۔ باہر رات ہو چکی تھی۔ مدھم مدھم روشنیاں جل رہی تھیں۔ وہ مجھے ساتھ لئے ہوئے ایک اور کمرے میں داخل ہو گیا جو روشنی سے جگمگا رہا تھا۔ کمرے کے درمیان نصف دائرے کی شکل کی ایک خوب صورت میز لگی ہوئی تھی۔ جس کے پیچھے تین کرسیاں تھیں اور اُن تینوں کرسیوں پر تین شاندار آدمی

بیٹھے ہوئے تھے۔ اُن میں سے ایک کا چہرہ جارج واشنگٹن سے ملتا جلتا تھا۔ دوسرا فریج کٹ ڈارچی، بڑی بڑی گھنی مونچھوں اور خوبصورت چشمے کے ساتھ، پروتار شخصیت کا مالک نظر آ رہا تھا۔ تیسرا ایک سُتے ہوئے چہرے کے ساتھ کسی قدر سخت گیر طبیعت کا مالک شخص تھا۔ تینوں نے کڑی نگاہوں سے مجھے دیکھا۔ بڑی بڑی مونچھوں والا عقب میں دروازے میں جم گیا تھا۔ میں مضحکہ خیز نگاہوں سے اُن تینوں کو دیکھنے لگا۔

”اگر ہمارا اندازہ غلط نہیں ہے تو تم ہی ٹھا کر رنجیت کمار ہو۔“ جارج واشنگٹن نے گہری نگاہوں سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔

”نہیں..... تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے ڈیر! میرا نام تو مہاراجہ وکرماجیت ہے۔“ میں نے کہا۔

”بکواس کرتے ہو۔ ہمیں دھوکہ دیتے ہو ٹھا کر! تمہارے بہت سے کارنامے سنے ہیں۔ لیکن پہلی بار ہمارے جال میں پھنسے ہو۔ جو کھیل تم کھیل رہے ہو ٹھا کر! اس کے نتائج پر تم نے غور نہیں کیا۔ وہ سب کچھ تمہارے بس کی بات نہیں ہے جس کے لئے تم میدانِ عمل میں آئے ہو۔ کیا سمجھے؟“

”اب یہ تو آنے والا وقت ہی بتائے گا مسٹر جارج واشنگٹن! کہ میں کیا ہوں؟ اور جو کھیل میں کھیل رہا ہوں، اُس کے کیا نتائج ہوں گے..... لیکن ایک پیش گوئی، بلکہ حقیقت میں بیان کئے دیتا ہوں۔ تم لوگ مجھے کسی تھیٹر کے مسخرے معلوم ہوتے ہو اور کسی جاسوسی ڈرامے کی ریہرسل کر رہے ہو۔ اس سے زیادہ تمہارے بارے میں کچھ کہنا میرے اپنے لئے تو ہین آمیز ہے۔“

خشک چہرے والے نے گہری نگاہوں سے اپنے قریب بیٹھے ہوئے دونوں آدمیوں کو دیکھا اور پھر نرم لہجے میں بولا۔ ”نیل کیروسا سے تمہارا کیا تعلق تھا؟ تمہیں اس بات پر اعتراض تو نہیں ہے کہ ہم تمہیں ٹھا کر رنجیت کمار کے نام سے پکار رہے ہیں؟“

”جس طرح تم نے مجھے دھوکہ دے کر یہاں بلایا ہے، اس سے میں تمہاری ذہنیت کے بارے میں اندازہ لگا چکا ہوں۔ اب اگر تم مجھے سکندر اعظم بھی کہہ دو تو میں تمہارا کیا بگاڑ سکتا ہوں؟ حقیقت یہ ہے کہ میرا نام صرف منصور ہے اور اس سے زیادہ کچھ نہیں.....“

”خوب..... گویا تم اس بات سے انکار کرتے ہو کہ تم ٹھا کر رنجیت کمار ہو.....؟“

”میرے انکار کرنے سے کیا فرق پڑتا ہے؟ اگر تم مجھے ٹھا کر رنجیت کمار سمجھتے ہو تو وہ سہی! لیکن اس کے فوائد ضرور بتا دو مجھے۔ اگر کچھ نقصانات ہوں تو مجھے منصور ہی رہنے جائے.....“

”نیل کیروسا کی کہانی سناؤ۔ اس نے تمہاری مدد سے کیا کیا کر لیا تھا اور تمہارے ساتھ مزید کتنے افراد ہیں جو تمہارے ساتھ اس کام میں مصروف ہیں؟“

”دنیا کی آبادی میں سے صرف اُن لوگوں کو نکال دو جو یہاں اس عمارت میں تمہارے ساتھی ہیں۔ باقی سب میرے ساتھ ہیں۔ مقابلہ کر سکو گے اُن سے؟“ میں نے کہا۔

”بہت خود اعتمادی ہے تمہارے اندر ٹھا کر! لیکن اس کے نتائج بہتر نہیں ہوں گے۔ جو

کچھ ہمیں حاصل کرنا ہے، وہ ہمارا ہی رہے گا۔ تم اپنے دوست نیل کیروسا کا حشر اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے ہو۔ اور وہ چوہیا..... جو بڑی تیزی سے دوڑ رہی تھی، بالآخر اپنی رفتار کا شکار ہو گئی۔ کیا تم اس بات سے انکار کر سکتے ہو کہ پہلے تمہیں نیل کیروسا کے ساتھ دیکھا گیا اور اس کے بعد اُس کی بہن تمہارے ساتھ دیکھی گئی؟“

”ہاں.....“ میں نے مسکراتے ہوئے گردن ہلا دی۔ ”اگر تم لوگوں نے واقعی نیل کیروسا کو میرے ساتھ دیکھا ہے تو میں بھلا انکار کیسے کر سکتا ہوں؟ اور اس کے بعد اُس کی بہن کبھی بھی کچھ عرصے مجھ سے منسلک رہی۔ لیکن اب حقیقتوں کی طرف آ جاؤ..... نہ تو نیل کیروسا سے میرا کوئی تعلق تھا اور نہ ہی اُس کی بہن کبھی سے۔ البتہ کبھی نے نیل کیروسا کی موت کے بعد ایک کہانی ضرور سنائی تھی، جس کا تعلق نیل کیروسا ہی سے تھا۔ لیکن وہ خود بھی اس کہانی سے پوری طرح واقف نہیں تھی۔ اور اُس نے مجھ سے درخواست کی تھی کہ اُس کے بھائی کے قاتلوں کے سلسلے میں، میں اُس کی مدد کروں..... لیکن میں صرف ایک سیاح ہوں میرے دوستو! جس طرح چاہو، میرے بارے میں معلومات حاصل کر لو۔ بغرض سیاحت دنیا گردی کو نکلا ہوں اور اس سے زیادہ اور میرا کوئی مقصد نہیں ہے۔ باقی اپنے طور پر تمہارا جو دل چاہے، فیصلہ کر لو۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔“

”خوب صورت الفاظ کو لفافے میں رکھ کر تم ہمیں بے وقوف بنانا چاہتے ہو ٹھا کر رنجیت کمار! تمہارے بارے میں جس قدر معلومات ہمیں حاصل ہیں، شاید تمہارے ماں باپ کو بھی نہ ہوں۔ اس لئے فضول باتوں سے گریز کرو۔ پہلے یہ تسلیم کرو کہ تم ٹھا کر رنجیت کمار

ہو..... ہمارے تمہارے درمیان گفتگو اُس کے بعد ہوگی۔“

”اور پہلے تم یہ تسلیم کرو کہ تم بین الاقوامی گدھے ہو۔ اور یہ جو شکلیں بنائے بیٹھے ہو، ان کی حقیقت کچھ بھی نہیں ہے۔ تمہارے دماغوں میں بھوسا بھرا ہوا ہے۔ اور تم کچھ سوچنے سمجھنے کے قابل نہیں ہو.....“

میرا یہ خیال تھا کہ میرے یہ الفاظ انہیں مشتعل کر دیں گے..... لیکن وہ سب ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکراتے رہے۔ پھر فرینچ کٹ داڑھی والے نے میرے عقب میں کھڑے ہوئے لمبی مونچھوں والے شخص سے کہا۔ ”جاؤ..... اُسے لے آؤ۔“ اُس نے گردن خم کی اور دروازے سے باہر نکل گیا۔

میں نے یہاں کسی قسم کا کوئی ہنگامہ مناسب نہیں سمجھا تھا۔ چنانچہ میں نے اُن سے کہا۔ ”اگر تم مجھے ٹھا کر رنجیت کمار سمجھتے ہو تو کم از کم یہ بد اخلاقی تمہیں زیب نہیں دیتی کہ تم تینوں بیٹھے ہوئے ہو اور میں کھڑا ہوا ہوں۔“

”سامنے کرسی پر بیٹھ سکتے ہو ٹھا کر! تم بہت چالاک اور شاطر قسم کے آدمی ہو۔ لیکن اس بات کو ذہن میں رکھنا کہ جن لوگوں کے چنگل میں تم پھنسے ہو، وہ تم سے کہیں آگے کی چیز ہیں..... اگر تمہارے ساتھ دس ہزار افراد کا گروہ بھی ہے، تب بھی وہ ہمارے سامنے بے بس ہی رہے گا۔“

میں نے ہلکا سا قہقہہ لگایا اور کرسی پر جا بیٹھا۔ پھر بڑی مونچھوں والا شخص جس شخصیت کو لے کر اندر داخل ہوا، اُسے دیکھ کر میرے دل میں عجیب سے تاثرات ابھر آئے تھے۔ مصر میں، ایران میں اور دوسرے تمام علاقوں میں جہاں جہاں کی میں سیاحت کر چکا تھا، جس قدر حسین لڑکیاں میرے نزدیک آئی تھیں اور اُن کی جو جو شخصیتیں تھیں، اُن کا تذکرہ میں کر چکا ہوں۔ کی مورا، اُن میں ایک عجیب و غریب شخصیت کی مالک تھی۔ لیسی، جین گروجر اور وہ تمام لڑکیاں جن میں ایش بھی شامل تھی۔ لیکن اُن میں سے کوئی میرے ذہن یا دل کی گہرائیوں میں وہ ہلچل نہ پیدا کر سکی تھی جو اُس لڑکی کو دیکھ کر ایک دم میرے اندر پیدا ہو گئی تھی۔

بلند و بالا قد..... انتہائی حسین، سنگ مرمر جیسی تراش کا بدن، لمبے لمبے بال جو پنڈلیوں تک آتے تھے۔ بڑی بڑی آنکھیں، کشادہ پیشانی، ستواں ناک، انتہائی حسین تراش کے

اُبھرے اُبھرے ہونٹ، صراحی دار گردن..... غرض کہ ہر شے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے جگہ مکمل ہو اور عورت کی ایک مکمل تصویر..... اگر افسانوی نقطہ نگاہ سے حسن کے معیار پرکھی جائے تو وہ اُس شکل میں موجود تھی۔

ساڑھی میں ملبوس، چہرے سے مشرقیت جھلکتی ہوئی۔ لیکن آنکھوں میں ذہانت جھلک۔ نجانے کون تھی یہ..... بظاہر یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ قیدی ہو۔ لیکن چال و حرکت بتاتی تھی کہ رستی جل گئی ہے پر بل نہیں گیا۔ وہ ٹھہری ٹھہری سی چلتی ہوئی اندر داخل ہوئی اور تھکی نگاہوں سے ماحول کا جائزہ لینے لگی۔

”کماری پدما! ہم نے تم سے کہا تھا نا کہ باآخر ٹھا کر رنجیت کمار بھی ایک نہ ایک ہمارے چنگل میں آجائے گا۔ دیکھ لو..... ہم نے اپنے قول کی تصدیق کر دی ہے۔“ رنجیت تمہارے سامنے موجود ہے.....“

آنے والی کی نگاہیں میری جانب اُٹھ گئیں۔ ایک لمحے تک اُن نگاہوں میں سپاٹ اندر داخل ہونے کے بعد آہستہ قدموں سے چلتی ہوئی صوفے کی طرف بڑھ گئی اور پھر پر کیفیت رہی۔ اور پھر اُس کے ہونٹ سرگوشی کے انداز میں مسکرائے اور اُن سے آواز نکلی..... ”ٹھا کر! تم.....؟“

”بیڑہ غرق.....“ میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ آگنی پھر وہی مصیبت..... چہرے میں کیا آیا کہ یہ لوگ پھر اُسی جنون کا شکار ہو گئے۔ میں نے لڑکی کے الفاظ کی تردید کرنا مناسب نہیں سمجھا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی میرے نزدیک پہنچ گئی۔ اور پھر اُن نے اسی انداز میں کہا۔

”تو تم بھی ان کے چنگل میں پھنس گئے ٹھا کر.....“

”اللہ کی مرضی بی بی! میں آج تک کچھ کر سکا ہوں، جو اب کروں گا؟“ میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

”مجھے یہ توقع نہیں تھی۔ تم پر تو بہت انحصار تھا۔“

”ہاں ہاں..... بے شک! دنیا کے بے شمار لوگ مجھ پر نجانے کیا کیا انحصار کرتے ہیں..... تم بھی کر لو..... ایک بات دماغ میں رکھنا! جو کچھ انہیں ملا ہے، اس سے الگ کچھ نہیں ملے گا۔ بہر حال بھائیو! میں ٹھا کر رنجیت کمار ہوں۔ باپ کا نام اس میں شامل کروں گا کیونکہ وہ گالی بن جائے گا۔ اب بولو! کیا چاہتے ہو مجھ سے؟“

جارج واشنگٹن کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔ اُس نے کہا۔ ”فی الحال میں اتنا ہی بتانا چاہتا تھا کہ اب تم دونوں یکجا ہو کر میرے لئے کام کرو گے۔ جیکل! انہیں احترام کے ساتھ ان کی کمین گاہ میں چھوڑ آؤ.....“

جیکل ہمیں لے کر باہر نکل آیا۔ اور اُسی وقت راعمیس کی آواز اُبھری۔ ”رب السموات کی قسم! وہ کلو پیٹرہ سے زیادہ حسین ہے۔ آہ..... اس کا دل نہ توڑنا راعمیاس! اس کی دلجوئی میں دانت پیس کر رہ گیا تھا۔“

اس بار جس کمرے میں ہمیں قید کیا گیا، یہ وہ جگہ نہیں تھی جس میں، میں پہلے موجود تھا۔ شاید یہ کماری پدما کا قید خانہ ہو۔ یہاں دو حسین بستر بچھے ہوئے تھے۔ فرش پر انتہائی قیمتی ہمارے چنگل میں آجائے گا۔ دیکھ لو..... ہم نے اپنے قول کی تصدیق کر دی ہے۔“

”کماری پدما! ہم نے تم سے کہا تھا نا کہ باآخر ٹھا کر رنجیت کمار بھی ایک نہ ایک ہمارے چنگل میں آجائے گا۔ دیکھ لو..... ہم نے اپنے قول کی تصدیق کر دی ہے۔“

”بیڑہ غرق.....“ میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ آگنی پھر وہی مصیبت..... چہرے میں کیا آیا کہ یہ لوگ پھر اُسی جنون کا شکار ہو گئے۔ میں نے لڑکی کے الفاظ کی تردید کرنا مناسب نہیں سمجھا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی میرے نزدیک پہنچ گئی۔ اور پھر اُن نے اسی انداز میں کہا۔

”تو تم بھی ان کے چنگل میں پھنس گئے ٹھا کر.....“

”اللہ کی مرضی بی بی! میں آج تک کچھ کر سکا ہوں، جو اب کروں گا؟“ میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

”مجھے یہ توقع نہیں تھی۔ تم پر تو بہت انحصار تھا۔“

”ہاں ہاں..... بے شک! دنیا کے بے شمار لوگ مجھ پر نجانے کیا کیا انحصار کرتے ہیں..... تم بھی کر لو..... ایک بات دماغ میں رکھنا! جو کچھ انہیں ملا ہے، اس سے الگ کچھ نہیں ملے گا۔ بہر حال بھائیو! میں ٹھا کر رنجیت کمار ہوں۔ باپ کا نام اس میں شامل کروں گا کیونکہ وہ گالی بن جائے گا۔ اب بولو! کیا چاہتے ہو مجھ سے؟“

پھیل گئی۔ اس مسکراہٹ میں اتنا حسن، اتنی دلکشی تھی کہ دل سے سارا غبار نکل گیا اور مجھے
کہ نہ صرف ہمیشہ کے لئے ٹھا کر رنجیت کمار بن جاؤں بلکہ اپنی خدمات کمار کی صلاحیتوں کو
کردوں اور اُن سے کہوں کہ بس! اب دنیا سے بچا کر اپنے ہی قدموں میں بسرا کر
دیتے۔

وہ بدستور مسکراتی نگاہوں سے مجھے دیکھتی رہی تھی۔ ”تم جو کوئی ہو، میں نہیں جانتی
تمہارا تعلق کہاں سے ہے اور تم ان لوگوں کے جال میں کیسے آ پھنسے؟ میں یہ بات اُن
طرح جانتی ہوں کہ تم ٹھا کر رنجیت کمار نہیں ہو۔ ٹھا کر رنجیت سے میری صرف ایک
ملاقات ہوئی تھی۔ لیکن میں اُسے اچھی طرح پہچانتی ہوں۔ اب اس وقت جبکہ میں اُن
آپ کو دشمنوں کے درمیان بالکل تنہا پاتی ہوں، اس کے علاوہ اور کوئی چارہ کار نہیں
میرے پاس کہ میں اُن لوگوں کی خواہش کے مطابق تمہیں ٹھا کر رنجیت کمار کہہ دوں۔ کم
کم ایک ساتھی تو ملے۔ عارضی ہی سہی لیکن ڈوبتے لوگ تنکے کا سہارا بھی پسند کرتے ہیں
میں اپنی تمام کوششوں میں ناکام ہو گئی ہوں اور اب میرے پاس اس کے علاوہ اور کوئی
ذریعہ نہیں ہے کہ کسی بھی ایرے غیرے کو میں اپنا ساتھی بنانے کی کوشش کروں.....“
”تو محترمہ! یہی ایرا غیر آپ کو کیوں مل گیا تھا؟“ میں نے طنزیہ انداز میں کہا۔

”دیکھو! نہ میں تمہیں خود گرفتار کر کے یہاں لائی ہوں نہ جان بوجھ کر تمہارے پاس
تھی۔ تم جو کوئی بھی ہو، ہو سکتا ہے تمہیں یہاں سے رہائی نصیب ہو جائے۔ اگر کرنا
میرے لئے تھوڑا سا کام کر دینا۔ اس کے بدلے کا کوئی تصور میرے ذہن میں نہیں ہے
ایک ایسی بے دست و پا لڑکی جس کا کوئی سہارا نہ ہو، کچھ بھی کر سکتی ہے تمہیں اس کا اندازہ
ہوگا۔ اگر تم چاہو گے تو میں بعد میں اس بات سے انکار کردوں گی کہ تم رنجیت نہیں ہو۔
اس وقت کچھ دیر میرے ساتھ گزار لو۔ میں زندگی بھر تمہارا یہ احسان نہیں بھولوں گی۔“

”اُس کی آواز میں ایک حسرت سی پیدا ہو گئی تھی۔ میں اس صورت حال کو سمجھنے
کوشش کرنے لگا۔ راعمیس بار بار میرے ذہن میں چٹکیاں کاٹ رہا تھا اور میں اُن
مقصد سمجھ رہا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ میں لڑکی سے یگانگت کی باتیں کروں اور اُس کی
حاصل کروں۔ بہر طور! یہ تو کرنا ہی تھا۔ کم از کم پہلی بار ایک ایسی شخصیت ملی تھی جس
مجھے وہ ماننے سے انکار کر دیا تھا جو دوسرے سمجھتے تھے۔ یعنی میرے خدو خال اس بار

لوگوں کو دھوکہ دینے کا باعث ضرور بنے تھے۔ لیکن جس شخصیت سے میری شناخت کرائی گئی
تھی اُس نے کہا تھا کہ میں وہ نہیں ہوں۔ یہ بات ذرا باعث اطمینان تھی۔ اور منصور دی
گریٹ..... جن کے سپرد دنیا میں آنے کے بعد یہ ذمہ داری کی گئی تھی کہ وہ کبھی ہنلر کے
دست راست بن جائیں، کبھی آرٹن ڈورل، کبھی لارڈ کرزن اور کبھی کچھ..... اور جب کہ
بذات خود وہ صرف ایک بے روزگار نو جوان جس کی بے روزگاری مثالی حیثیت رکھتی ہو اس
کے علاوہ اور کچھ نہیں تھے۔ میں راعمیس سے اختلاف نہ کرتے ہوئے اُس کے ساتھ نرم ہو
گیا۔

”کماری پدما! آپ ہیں کیا چیز؟ اس بات کا اعتراف تو آپ کر چکی ہیں کہ آپ نے
مجھے صرف ایک ساتھی کی حیثیت سے رنجیت تسلیم کیا ہے اور آپ کے ذہن میں ایسی کوئی
بات نہیں ہے کہ میری شخصیت بلکہ قومیت ہی بدل جائے۔“

”ہاں! میں اپنا مفہوم تم پر واضح کر چکی ہوں۔ اب دیکھو نا! میں خود تمہیں یہاں نہیں
لائی۔ لیکن مجھے ایک موقع ملا تو میں اُسے ہاتھ سے کیوں گنواؤں؟ ذرا مجھے یہ بتاؤ کہ ان
لوگوں نے آخر تمہیں رنجیت کمار کے دھوکے میں کیسے پکڑا؟ اگر پسند کرو تو یہ بات بتا دو۔
میں اسے تمہارا تعاون تصور کروں گی.....“

”نیل کیروسا نامی ایک شخص میرے لئے مصیبتوں کا باعث بنا ہے۔“ میں نے کہا۔
لڑکی بری طرح چونک پڑی۔ اُس کی آنکھوں کے بدلے ہوئے انداز اور اُس کی
چونکنے کی کیفیت کو میں نے بخوبی محسوس کیا تھا۔ چند لمحوں بعد اُس نے کہا۔ ”نیل کیروسا کو تم
کیسے جانتے تھے؟“

”کیا تم بھی نیل کیروسا سے واقف ہو.....؟“
”ہاں! یہ بہت اچھا انسان میری وجہ سے موت کا شکار ہوا..... صرف میری وجہ سے۔“
”خوب..... خوب... اس کا مطلب ہے کہ اب تم مجھے اُس کی کہانی بھی سناؤ گی۔“

”اگر تم پسند کرو۔ ویسے میں تمہیں اپنی کہانی سنانا ضروری سمجھتی ہوں۔ کیونکہ تم سے بہت
سی امیدیں وابستہ کر لی ہیں میں نے۔ دیکھو! اُن لوگوں نے تمہیں اٹھا کر رنجیت کمار کے
دھوکے میں پکڑا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ تمہارے خدو خال کسی حد تک ٹھا کر
رنجیت کمار سے ملتے ہیں۔ لیکن یہ بات میں اچھی طرح جانتی ہوں کہ تم رنجیت کمار نہیں ہو۔
میں اُن کے بعد میں ان لوگوں کو بھی اس کا علم ہو جائے گا اور اس کے بعد ممکن ہے یہ تمہیں چھوڑ دیں۔

یہاں سے جاؤ میرے دوست! تو ایک کام کر دینا میرا جس کے لئے میں تم سے پہلے
چکی ہوں۔ کام ایسا نہیں ہوگا کہ تمہارے لئے ناممکن ہو۔ لیکن ممکن ہے میری زندگی
جائے۔“

”کیا تم بیل کیروسا کی بہن کیمی کو بھی جانتی ہو.....؟“

”جانتی نہیں ہوں..... بیل کیروسا کی زبانی ہی میں نے اُس کا نام سنا تھا۔ بیل کہتا تھا کہ اُس کی ایک ہی بہن ہے اور زندگی بنانے کا جو تصور اُس کے ذہن میں ہے صرف کیمی کی وجہ سے ہے۔ وہ چاہتا تھا کہ کیمی کو زندگی کی ساری آسائشیں فراہم کر دے لیکن بد نصیب بھائی، بہن کے لئے یہ نہ کر سکا اور ان درندوں کا شکار ہو گیا۔ کاش اب ہوتا.....“

”مس پدما! اب ایسا کوئی معاملہ نہیں رہا۔ وہ بہن بھی اپنے بھائی کے پاس پڑی ہے۔“ میں نے کہا اور پدما ایک بار پھر چونک پڑی۔ اُس کی آنکھوں میں دکھ کے تاثر نظر آئے اور پھر اُس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

”کیا واقعی کیمی بھی..... کیمی.....“

”ہاں..... اُن لوگوں نے مجھے اُس کی لاش کے پاس ہی پایا تھا۔ اور وہاں والدین کے بھیس میں انہوں نے مجھے گرفتار کیا۔“

”ہاں..... میں یہ جانتی ہوں۔ وہ باقاعدہ جرائم پیشہ ہیں۔ اور شاید ہر طرح کے کر لیتے ہیں۔ اکثر میں نے اُن میں سے کچھ کو پولیس کے لباس میں دیکھا ہے جبکہ اُن سے اُن کا کوئی تعلق نہیں ہے۔“

”اب تو اس کہانی میں مجھے بھی دلچسپی محسوس ہو رہی ہے مس پدما! چلئے ٹھیک ہے۔“ تقدیر ہمیں اس طرح یکجا کر رہی ہے اور آپ کے لئے مجھ سے کوئی کام لینا چاہتی ہے۔ پہلی بار..... زندگی میں پہلی بار میں آپ کے لئے کچھ کرنے پر آمادہ ہوں..... بیل کیروسا سے میری ملاقات اتفاقہ طور پر ہوئی تھی۔ وہ چند روز میرے ساتھ رہا اور اُس کی ایک بار پہلے بھی میں ایک مصیبت میں پھنسا۔ پھر بیل کیروسا مارا گیا اور اُس کی لاش مجھے ملی۔ اُس نے اپنے بھائی کے قاتلوں کے خلاف میری مدد حاصل کرنا چاہی۔ لیکن پدما! میں ایک سیاح فطرت آدمی ہوں اور ہنگاموں سے بچنا چاہتا ہوں۔ میں بھلا کیمی کی مدد کر سکتا تھا؟ چنانچہ میں یہاں آ گیا اور میں نے ایسے ہی سیر و تفریح کے دوران

لاش شہزادہ یوجین کے محل کے پاس جھاڑیوں میں پڑی ہوئی پائی۔ کیونکہ میں اُسے پہچانتا تھا اس لئے فطری طور پر میرے دل میں اُس کے لئے ہمدردی کے جذبات پیدا ہو گئے۔ لیکن اس سے قبل کہ میں اُس لاش کے سلسلے میں کوئی کارروائی کرتا، ان لوگوں نے مجھے پولیس والوں کی حیثیت سے پکڑ لیا اور اس کے بعد یہ معلوم کرنا چاہتے تھے کہ میں رنجیت کمار ہوں یا نہیں؟ میں نے انکار کیا، تو اس کی تصدیق کے لئے انہوں نے آپ کو طلب کر لیا۔“

پدما گردن ہلانے لگی تھی۔ اُس کے گھٹاؤں جیسے سیاہ بال اڑ اڑ کر اُس کے چہرے پر آ پڑے تھے اور ایسا لگتا تھا جیسے آدھا چاند بادلوں کی اوٹ سے جھانک رہا ہو۔ حسن و جمال میں یکتا اس حسین لڑکی نے واقعی دلوں پر حکمرانی کرنے کے تمام انتظامات اپنے اندر سمو رکھے تھے۔ وہ غم زدہ انداز میں گردن جھکائے رہی۔ اور چند لمحوں کے بعد اُس کی حسین آنکھوں میں آنسوؤں کو دیکھ کر مجھے عجیب سی بے چینی کا احساس ہوا تھا۔

میں دل سوزی سے آگے بڑھا اور اُس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔ اسی وقت راعمیس کی جھلائی ہوئی آواز میرے کانوں میں ابھری۔ ”اے عقل کے اونٹ! اس دستِ محبت کو دستِ شفقت میں کیوں تبدیل کر رہا ہے؟ سر پر ہاتھ رکھنے کا مطلب سمجھتا ہے تو؟ بے وقوف آدمی! اگر ہاتھ رکھنے کا موقع مل ہی گیا ہے تو کمر پر رکھ..... شانوں پر رکھ..... اس طرح تو، تو اپنی شخصیت ہی تبدیل کئے دے رہا ہے۔“

میں نے بوکھلا کر پدما کے سر سے ہاتھ ہٹا لیا۔ پدما نے ڈبڈبائی آنکھوں سے مجھے دیکھا اور پھر بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ ”منصور نام بتایا تھا نا تم نے اپنا؟“

”ہاں۔“ میں نے گردن ہلائی۔

”یقین کرو منصور! میری ذات میں ایک ایسی تشنگی ہے جو شاید کبھی کسی انسان کی ذات میں نہیں رہی ہوگی۔ تم جن حالات سے بھی گزر دو، زندگی تمہیں جو کچھ بھی بنائے کم از کم اپنے آپ سے واقف تو ہوتے ہو۔ کوئی تم سے تمہارے بارے میں پوچھے تو اتنا تو کہہ سکتے ہو تم کہ تمہارا خاندان یہ تھا۔ والدین یہ تھے، تمہارا ماضی کچھ اس طرح تھا۔ اس طرح انسان اپنی شناخت کرا سکتا ہے۔ لیکن اگر کوئی مجھ سے پوچھے کہ میں کون ہوں تو میرے پاس اس کا کوئی جواب نہیں ہے۔ لوگ مجھے پدما کہتے ہیں۔ میں پدما ہوں۔ اگر میرا کوئی اور نام لیا جائے تو میں اُس کی تردید نہیں کر سکتی اس لئے کہ میں خود اپنی ذات میں ناقابلِ شناخت ہوں۔ میں نہیں جانتی کہ میں کون ہوں؟ وہ لوگ جو ہوش سنبھالنے کے بعد میری نگاہوں

کے سامنے رہے، بالآخر یہ کہہ کر چلے گئے کہ میں وہ نہیں ہوں جو اب تک تھی۔ سمجھے منہ
میں وہ نہیں ہوں جو اب تک تھی اور وہ بھی نہیں ہوں جو آئندہ رہوں گی۔ تمہیں میرے
الفاظ اُلجھے ہوئے محسوس ہوں گے۔ لیکن میری ساری زندگی ہی اُلجھے ہوئے دھاگوں پر
ایک انبار کی مانند ہے جس کا کوئی سرا کہیں سے نہیں ملتا۔ میں اپنی شناخت بھی چاہتی ہوں
منصور! اور زندگی بھی۔ مجھے جینا پسند ہے۔ میں دنیا کو اُن نگاہوں سے دیکھنا چاہتی ہوں
جن آنکھوں سے جینے والے دیکھتے ہیں۔ لیکن مجھ پر نجانے کیا کیا قیامتیں ٹوٹتی رہی ہیں
میں.... میں سب کچھ ہونے کے باوجود اتنی افسردہ ہوں منصور! کہ شاید میرا دل اندر سے
گیا ہو اور اگر کوئی میرے سینے کو چیر کر دیکھے تو دل کی جگہ اُسے ایک گلا ہوا خون کا لوتھراؤ
آئے گا۔ جس پر اتنی ضربیں پڑی ہیں کہ وہ اپنی اصل شکل ہی کھو بیٹھا ہے۔ میں اپنے الفاظ
کا مفہوم سمجھانے کے لئے نہ جانے کیا کیا کہہ رہی ہوں۔ بس! تم ایک غمزہ لڑکی
بارے میں جو بھی تعین کر سکتے ہو، وہ میری ذات کے ساتھ کر لو۔ میں تمہیں اپنے بارے
میں بتانا چاہتی ہوں۔ سنو منصور! کم از کم میری داستان سن لو۔ میرا دل ہلکا کر دو اور اُن
کے بعد چاہو تو مجھ پر لعنت بھیج کر چلے جانا۔ میں اپنی تقدیر کی سیاہی اپنے ہاتھ سے نہیں
سکتی۔“

اُس کی آواز رندھ گئی تھی اور اس بار میں نے اُس کے دونوں بازو پکڑ لئے تھے اور اُن
کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ ”پدما....! براہ کرم خود کو سنبھالو۔ میں تم سے وعدہ کیا
ہوں کہ حالات کیسے ہی ہوں، میں تمہیں تنہا نہیں چھوڑوں گا۔“

پدما نے اپنا خوبصورت سر میرے بازو سے ٹکا دیا اور راعمیس نے ایک بار پھر میرے
کان میں سرگوشی کی۔ ”عمدہ جا رہے ہو راعمیس!.... عمدہ جا رہے ہو!“
دل تو چاہا کہ راعمیس کو گالیاں سناؤں۔ لیکن اپنے آپ کو باز رکھا۔

پدما میرے بازو سے سر ٹکائے روتی رہی۔ پھر اُس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ”
تعلق کہاں سے ہے؟ یہ تو نہیں جانتی۔ لیکن میں نے جب ہوش سنبھالا تو کنڈولا کے آگے
قبے رتنور یا میں موجود تھی....“

میں نے خود کو ایک نئی کہانی کے لئے تیار کر لیا۔ کہانیاں جو میرا مقدر تھیں۔ کہیں سے
کسی سے بھی ایک کہانی ضرور سننے کو ملتی تھی۔ اور اس کے بعد....

پدما بدستور سسکیاں بھرتے ہوئے اپنی داستانِ غم سن رہی تھی....
”رتنور یا میں، میں اُس قصبے کے سب سے بڑے آدمی گوپال سانگا کی حویلی میں رہتی
تھی جس کا تعلق، رانا سانگا کے خاندان سے تھا۔ میں اُسے پتا جی کہتی تھی۔ بچپن کے حالات
کیا تھے؟ کب میں گوپال سانگا کے گھر میں آئی؟ بالکل نہیں جانتی تھی۔ جس طرح بچے اپنے
گھروں میں رہتے ہیں، اسی طرح میں بھی اُس کے گھر میں رہتی تھی۔ گوپال کی زمینیں دُور
دُور تک پھیلی ہوئی تھیں۔ ہر شخص اُسے جھک کر سلام کرتا تھا۔ مگر وہ میرا غلام تھا۔ ہاں منصور!
باپ اپنی بیٹی کا غلام.... میں بچی تھی، شرارتیں کرنا چاہتی تھی، شرارتیں کرتی تھی اور دیکھتی
تھی کہ شرارتیں کرنے پر دوسری لڑکیوں کے ماتا پتا انہیں برا بھلا کہتے ہیں، مارتے ہیں،
ڈانٹتے ہیں۔ لیکن میری ہر شرارت پر وہ لوگ نہ صرف بے بس ہو کر رہ جاتے تھے بلکہ ایسے
ڈرے ڈرے انداز میں مجھے سمجھاتے جیسے اگر میں ناراض ہو گئی تو اُن کی تقدیر کا سورج
غروب ہو جائے گا۔ اس صورتحال سے میں ایک ذہنی مریضہ کی حیثیت اختیار کر گئی۔ نو جوانی
کی عمروں کو چھونے لگی تھی۔ لیکن کبھی بھی اپنی وہ حیثیت نہ پاسکی جو ماں باپ کی نگاہوں میں
اولاد کی ہوتی ہے۔ میں نے ایک دن ہرناولی کو پیٹ ڈالا۔ غصے کے عالم میں وہ پہلی بار
میرا مقابلہ کرنے کے لئے کھڑی ہوئی تو مجھے ایسا سرور آیا منصور! کہ میں بیان نہیں کر سکتی۔
مجھے یوں محسوس ہوا کہ اچانک اُن لوگوں نے مجھے انسان مان لیا ہو۔ لیکن دُور سے ہرناولی
کی ماں نے اُس کی یہ بدتمیزی دیکھ لی اور پھر اُس کی جوتیوں سے ایسی پٹائی ہوئی کہ میں خود
بھی کسی کو نہ روک سکی۔ وہ یہی کہتی رہی کہ غلطی دیدی کی تھی۔ لیکن میری غلطی کبھی غلطی نہیں
ہوتی تھی۔ اس صورتحال پر اب میں غور کرنے لگی تھی۔ میں جاننا چاہتی تھی کہ میرے ساتھ یہ
سلوک کیوں کیا جاتا ہے کہ میں اپنے آپ کو حویلی میں اجنبی سمجھوں۔ سچی بات یہ ہے کہ
انہوں نے مجھے ہر طرح کا سکھ دیا تھا۔ لیکن وہ محبت، وہ اپنائیت نہیں دی تھی، جو ماتا پتا کے

دلوں میں ہوتی ہے۔ بلکہ ہر شخص میری عزت کرتا تھا۔

ایک رات کچھ نامعلوم لوگوں نے حویلی پر گولیوں کی بارش کر دی۔ پہلے تو ہمارے ملازم مارے گئے۔ مگر اُس کے بعد گوپال سانگا بندوق لے کر اُن لوگوں کے مقابلہ پر اُڑ گیا۔ اُس کے آدمیوں نے تھوڑی ہی دیر میں جنگ کا پانسہ پلٹ دیا اور نہ صرف حملہ آور کو مار مار کر بھگا دیا بلکہ ایک شخص کو بھی اُٹھالایا جو گوری چمڑی والا ایک غیر ملکی تھا۔ گوپال اُسے دیکھ کر حیران رہ گیا۔ وہ اُس وقت بے ہوش تھا۔ کافی دیر بعد اُسے ہوش آیا تو گوپال کڑک کر اُس سے سوال جواب کرنے لگا۔

”کون ہو تم؟ اور میری حویلی پر حملہ کیوں کیا گیا تھا؟“

”تو جانتا ہے کہ میں کون ہوں اور تیری حویلی پر حملہ کیوں کیا گیا تھا.....“ غیر ملکی۔

جواب دیا۔

”میں نہیں جانتا۔ تجھے بتانا ہو گا۔“

”بیوقوف آدمی! کرنل جیمز کو بھول گیا؟“ میں نے محسوس کیا کہ اس نام پر گوپال کا رُخ

پہلا پڑ گیا۔ یہ کرنل جیمز کون تھا اور گوپال سانگا سے اس کا کیا تعلق تھا؟ ظاہر ہے میں بارے میں کچھ نہیں جانتی تھی۔ گوپال سانگا اُس زخمی سے مختلف سوالات کرتا رہا اور اُسے جواب دیتا رہا۔ اُس کے چہرے پر عجیب سے تاثرات پھیل گئے تھے۔ پھر اُس نے پستول نکالا اور سفید فام کے سر کا نشانہ لے کر دو گولیاں داغ دیں۔ سفید فام کے منہ سے آواز بھی نہیں نکل سکی تھی۔ میں نے گوپال سانگا کی یہ درندگی پہلی بار دیکھی تھی۔ سفید فام لاش کو خاموشی سے دفن کر دیا گیا۔ لوگ گوپال سے طرح طرح کے سوالات کرنے آئے مگر اُس نے سختی سے اُن سب کو منع کر کے بھگا دیا۔

دوسری رات اُس نے اپنی بیوی اور اپنی بیٹی کو خاموشی سے وہاں سے کہیں اور بھیج دیا۔ یہ بات مجھے صبح ہی پتہ چلی۔ گوپال مجھے اس بارے میں کوئی تسلی بخش جواب نہیں دے سکا لیکن مجھے جھوٹی تسلیاں دیتا رہا۔ پھر اگلی رات میرے لئے بھی اس حویلی میں آخری رات ثابت ہوئی..... گوپال نے تین گھنٹوں کا بندوبست کیا۔ ایک گھوڑے پر ساز و سامان ہوا تھا اور باقی دو میرے اور اُس کے لئے۔ آدھی رات کو گوپال میرے کمرے میں آیا آہستگی سے بولا۔

”پدما بیٹے! ہم لوگ چل رہے ہیں۔“

”کہاں پتا جی؟“

”چلو! میں تمہیں بعد میں بتاؤں گا۔ منہ ہاتھ دھولو۔ گھوڑے تیار ہیں۔“

میں گھڑ سواری کی شوقین تھی۔ حویلی کے اصطبل میں چار گھوڑے تھے جو کبھی کبھی میرے استعمال میں آ جاتے تھے۔ گھوڑے کے سفر کا سن کر میں خوش ہو گئی اور اُس کے بعد میں نے اُس سے کوئی سوال نہیں کیا۔ اوریوں ہم انتہائی خاموشی سے تنوریا سے نکل گئے۔ رات بھر یہ سفر جاری رہا۔ ہم جنگلوں اور چٹانوں میں بھٹکتے رہے۔ راجپوتانہ کے پہاڑی علاقے سرخ چٹانوں کے ساتھ نگاہوں کے سامنے تھے۔ صبح کا سورج نکلا تو ہم نے اپنے آپ کو ایک خوبصورت جنگل میں پایا۔ یہاں کا موسم تنوریا اور اُس کے قریبی علاقوں سے کہیں زیادہ خوب صورت اور حسین تھا۔ ہلکی ہلکی خنکی رچی ہوئی تھی۔ چاروں طرف بکھرے ہوئے پہاڑوں اور اُن کے گرد اُگے ہوئے درختوں کو دیکھ کر میں خوشی سے پھولی نہ سائی۔ گوپال کسی غار کی تلاش میں تھا۔ بالآخر اُسے ایسا غار مل گیا جو اُس کے خیال میں مناسب تھا۔ چنانچہ ہم نے وہیں پڑاؤ کا فیصلہ کر لیا۔

رات کو جب ہم سونے کے لئے لیٹے تو میں نے نرم آواز میں گوپال کو مخاطب کیا۔ ”کیا اب بھی نہیں بتاؤ گے پتا جی! کہ ہم یہاں کیوں آئے ہیں؟“

گوپال جواب میں عجیب سی نگاہوں سے مجھے دیکھنے لگا۔ ”تم مجھے کیا سمجھتی ہو پدما؟“

”پتا جی.....“

”تو بیٹی! یہ نہیں ہو سکتا کہ اگر تمہارا پتا تم سے کہے کہ اس بارے میں کوئی سوال نہ کرو تو تم خاموش ہو جاؤ گی؟“

”خاموش تو میں ہو جاؤں گی۔ لیکن ایک بات آپ بھی سمجھ لیجئے کہ میرے دل میں ہمیشہ سے آپ کے لئے ایک احساس رہا ہے کہ میں آپ لوگوں کے درمیان اجنبی اجنبی ہوں۔ مجھے اس کی وجہ نہیں بتائیں گے؟“

گوپال پریشان نگاہوں سے مجھے دیکھنے لگا۔ اُس کے چہرے پر مختلف رنگ آ رہے تھے۔ پھر اُس نے آہستگی سے کہا۔ ”ٹھیک ہے۔ کچھ ایسی باتیں میں تمہیں بتائے دیتا ہوں جو اس وقت ضروری بھی ہیں۔“ وہ ذرا دیر کو جیسے سانس لینے کے لئے رُکا اور پھر مجھ سے

مخاطب ہوا۔ ”تم برا مت ماننا اور نہ ہی دل چھوٹا کرنا۔ یہ انکشاف تمہارے لئے عجیب ہے لیکن سچ یہ ہے کہ تم میری بیٹی نہیں ہو۔ ہم سب تمہارے غلام ہیں۔ ہمارے سپرد مرز تمہاری پرورش کی گئی تھی۔“

میرا منہ حیرت سے کھلے کا کھلا رہ گیا۔ آج اس سلوک کی وجہ مجھے معلوم ہو گئی تھی میرے ساتھ کیا جاتا تھا۔ لیکن یہ بات غم ناک بھی تھی کہ میں اپنوں میں نہیں ہوں۔ ”میرے ماما پتا کون ہیں؟“ میں نے سرگوشی کے انداز میں پوچھا۔

”افسوس! میں بھی یہ نہیں جانتا۔ مجھے تو تم تنہا ایک جگہ ملی تھیں۔ تمہارے پاس ایسا سا وساماں تھا جس سے یہ پتہ چلتا تھا کہ تم کسی بہت بڑے آدمی کی بیٹی ہو۔ میں تمہیں اٹھا لیا اور پھر میں نے تمہاری اپنی بیٹیوں ہی کی طرح پرورش بلکہ خدمت کی۔ میں نے سب سے کہہ دیا کہ پدما کو کسی راجکماری کی طرح رکھا جائے۔ مگر اب برا وقت آ گیا ہے.....“

”کیوں..... اب کیا ہو گیا ہے؟“ میں نے اُس کی بات کاٹی۔

”کچھ ایسے لوگ میرے پیچھے پڑ گئے ہیں جو تمہیں اپنے ساتھ لے جانا چاہتے ہیں۔ وہ..... وہ میرے بھی دشمن ہیں اور تمہارے بھی۔ تم اُس جنگ کو بھول گئیں جو حویلی میں ہوئی تھی؟ وہ تمہیں اغواء کرنے آئے تھے۔ تمہارے سامنے ہی اُس سفید فام نے کسی کرنل جیمز کا نام لیا تھا۔ وہی تمہارا اصل دشمن ہے۔ ہو سکتا ہے وہ لوگ میرا تعاقب کرتے ہوئے یہاں تک آجائیں۔ میں تمہاری حفاظت کرنے کی کوشش کروں گا۔ لیکن تم اگر کرنل جیمز کے ہاتھ لگ جاؤ تو احتیاط سے اُس سے معلوم کرنا کہ وہ تمہیں کیوں اغواء کرنا چاہتا ہے؟“

میں رات بھر کی جاگی ہوئی تھی۔ لیکن اب نیند میری آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ گوپال تو کروٹ بدل کر سو گیا لیکن میں روتی رہی اور انگاروں پر لوٹتی رہی۔ جب دوپہر بھی گزر گئی تو میں نے اُسے جگانے کی کوشش کی۔ مجھے بھوک لگ رہی تھی۔ لیکن میں نے اُس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا تو ڈر کر ہاتھ ہٹا لیا۔ وہ تیز بخار میں مبتلا تھا۔ غالباً سفر کی تھکن نے اُسے نڈھال کر دیا۔ میں نے اُسے جگا کر پانی پلایا تو وہ اُٹھ کر بیٹھ گیا۔

”میں بیمار ہو گیا ہوں۔ مگر تم چتنا نہ کرو۔ کچھ کھایا پیا تم نے؟“

”نہیں۔“

”کچھ کھا لو۔ میں تو بیماری کی وجہ سے کچھ کھانا سکوں گا۔ ایک گلاس پانی اور پلا“

مجھے.....“

میں نے اُسے پانی دیا لیکن خود بھی کچھ نہیں کھایا۔ وہ میری خوشامد کرتا رہا۔ مگر میں نے اُس کی ایک نہ مانی۔ میں یہ جاننے پر مُصر تھی کہ میں کون ہوں اور وہ یہ بتانے پر تیار نہ تھا۔ اُس کی باتوں سے میں نے اندازہ لگایا کہ اُس نے مجھ سے جھوٹ بولا ہے۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ گوپال کی حالت خراب سے خراب تر ہوتی گئی۔ وہ اب نیم غشی کی کیفیت میں تھا۔ جب مجھے بہت زیادہ بھوک لگی تو میں نے کچھ کھاپی لیا۔ لیکن اُس سے میں نے اور کوئی گفتگو نہیں کی۔

دوسرے دن صبح دس بجے اُس نے پھر پانی مانگا۔ میں نے اُسے پانی پلایا تو اُس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور نڈھال لہجے میں بولا۔ ”پدما! میری حالت خراب سے خراب تر ہوتی جا رہی ہے۔ میں مرنا نہیں چاہتا۔ کیونکہ ابھی مجھے تیرے لئے بہت کچھ کرنا ہے۔ لیکن اگر مجھے کچھ ہو جائے تو جس طرح بھی بن پڑے، تو یہاں سے چاند نگر روانہ ہو جانا۔ وہاں ٹھاکر لاج پال کی حویلی تلاش کرنے میں تجھے کوئی دقت نہیں ہوگی۔ اُسے بس یہ بتا دینا کہ تو گوپال سانگا کی بیٹی ہے اور تیرا نام پدما دیتی ہے۔“ میں نے نام ذہن نشین کر لیا۔ لیکن اس تصور ہی سے مجھے خوف آ رہا تھا کہ میں اس جنگل، اس ویرانے میں تنہا رہ جاؤں گی۔ لیکن کیا کر سکتی تھی؟

دوپہر کے تقریباً بارہ بجے ہوں گے کہ اچانک باہر سے گھوڑوں کی ٹاپوں کی آوازیں اُبھریں اور گوپال کے جسم میں جیسے بجلی کا کرنٹ دوڑ گیا ہو۔ وہ اب تک بری طرح نڈھال نظر آ رہا تھا۔ لیکن اس وقت اُس نے پھرتی سے بندوق اٹھائی اور غار کے دہانے کے قریب آ کر بیٹھ گیا۔ دوسرے گھوڑوں کو دیکھ کر وہ گھوڑے بھی ہنہانے جو ہمارے تھے، اور ابھی تک اُس غار کے عقب میں بندھے ہوئے تھے۔ غالباً اُن کی ہنہناہٹ نے دوسرے لوگوں کو اس طرف متوجہ کر دیا اور گھوڑوں کی ٹاپیں تیز رفتاری سے غار کے قریب آنے لگیں.....

چند لمحوں کے بعد وہ غار میں بیٹھا رہا۔ پھر اُسے نجانے کی سوجھی کہ غار سے باہر نکل گیا۔ لیکن دہانے پر رُک کر اُس نے مجھ سے کہا کہ میں باہر نکلنے کی کوشش نہ کروں۔ ذرا دیر بعد میں نے گولیاں چلنے کی آوازیں سنیں جو کافی دیر تک آتی رہیں۔ اور پھر بند ہو گئیں۔ میں خاموشی سے سانس روکے غار میں ہی بیٹھی تھی کہ دفعۃً کسی نے اندر جھانک کر کہا۔ ”لڑکی! باہر نکل

آؤ۔ اطمینان رکھو! تمہیں کچھ نہیں کہا جائے گا۔ لیکن اگر تم نے ہتھیار استعمال کرنے کی کوشش کی تو تمہیں اسی جگہ ختم کر دیا جائے گا۔“

زبان اور لہجہ ہندوستانی ہی تھا۔ میں تھوڑی دیر سوچتی رہی اور پھر باہر نکل آئی۔ پانچ آدمی تھے جن میں سے صرف ایک ہندوستانی تھا۔ گوپال کا کوئی پتہ نہیں تھا۔ میں ادھر ادھر دیکھا تو ہندوستانی نے آگے بڑھ کر مجھ سے کہا۔ ”گوپال کو تلاش کر رہی ہو؟ خیریت سے ہے اور آگے جا چکا ہے۔“

”کہاں؟“ میں نے سوال کیا۔

”اُس کی حالت خراب تھی۔ ہم نے اُسے گھوڑے پر بٹھا کر شہر بھجوا دیا ہے تاکہ ڈاک اُس کا علاج کر سکیں۔“

چاروں انگریز بھوکے نگاہوں سے مجھے گھور رہے تھے۔ وہ نوجوان تھے اور چہروں سے خطرناک نظر آتے تھے۔ نجانے کیوں مجھے اُن کی مسکراہٹیں بہت مکروہ محسوس ہوئیں۔ میں نے ہندوستانی کی طرف دیکھا۔ وہ اُن سے مختلف نظر آتا تھا۔ میرا وہ گھوڑا جس پر میں یہاں تک آئی تھی، اُسی کے قبضے میں تھا جبکہ اُس کا اپنا گھوڑا تھوڑے فاصلے پر کھڑا ہوا تھا۔ ”سوچو سمجھو مت..... جو کچھ تم سے کہا جا رہا ہے، کرو۔“

”میں بابا کے بغیر کہیں نہیں جاؤں گی۔“

”تم سے کہا نا کہ بابا کو اُس کی بیماری کی وجہ سے آگے لے جایا جا چکا ہے۔ پریشان کیوں ہو؟ یہاں سے تم بھی اُنہی کے پاس جاؤ گی۔“

میں چند لمحے سوچتی رہی۔ اُن کی نگاہوں میں نہ آتی تو یقیناً اُن کے ساتھ جانا پسند کرتی۔ لیکن گوپال موجود نہیں تھا اور میں بے بس ہو چکی تھی۔ چنانچہ اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ اُن کے ساتھ ہی چلوں۔“

ہمارا سفر تقریباً تین گھنٹے جاری رہا۔ ہم ایک جگہ رُکے تو ہندوستانی میرے قریب آ گیا۔ غالباً وہ میری حفاظت کرنا چاہتا تھا۔ میں نے مشکوک نگاہوں سے اُسے دیکھا تو اُس نے جلدی سے ہونٹوں پر اُننگی رکھ کر مجھے خاموش کر دیا اور آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک سن اشارہ کیا۔ پہلے تو میں اُس کا مقصد نہ سمجھ سکی۔ لیکن پھر میری نگاہیں اُسی طرف اٹھ گئیں۔ ایک درخت کے پاس میں نے جو منظر دیکھا، وہ میرے لئے انتہائی دہشت ناک تھا۔

ایک شخص درخت کے تنوں میں کیلوں سے گڑا ہوا تھا۔ اُس کی گردن سینے پر جھکی ہوئی تھی۔ ہاتھ اور پاؤں پھیلا کر اُن میں کیلیں جڑ دی گئی تھیں۔ یہ دہشت ناک منظر دیکھ کر میرے حلق سے ایک دلخراش چیخ نکلی اور میں گھوڑے سے نیچے آ رہی۔ انگریز چونک کر میری جانب متوجہ ہو گئے۔ میں اپنی جگہ سے اٹھ کر اُس درخت کی جانب چل پڑی۔ درخت کے ساتھ کیلوں میں گڑا ہوا شخص گوپال سا نکا تھا..... اُسے نہایت درندگی کے ساتھ، زندہ درخت کے ساتھ جڑ دیا گیا تھا۔ میرے حلق سے مشینی انداز میں چیخیں نکلنے لگیں اور پھر میں بے ہوش ہو گئی تھی۔

ہوش آیا تو خود کو انتہائی خوب صورت کمرے میں پایا۔ میرے بدن کے نیچے بڑی آرام دہ مسہری تھی۔ لیکن میں تنہا تھی۔ میں اٹھ کر دروازے کے پاس پہنچ گئی اور اُسے زور زور سے پینا شروع کر دیا۔ ذرا دیر کے بعد ایک ادھیڑ عمر ہندوستانی عورت نے دروازہ کھولا جس کے پیچھے کچھ مرد بھی کھڑے ہوئے تھے۔

”کیا بات ہے؟“ عورت نے کرخت لہجے میں کہا۔

”میں..... میں کہاں ہوں؟ میں باہر آنا چاہتی ہوں.....“

”نہیں..... تمہیں اندر ہی رہنا ہے۔ بیکار باتوں سے پرہیز کرو۔ اگر تم نے کوئی گڑبڑ کی تو یہ چاروں وحشی کتے تمہیں بھنبھوڑ کر رکھ دیں گے۔ جاؤ..... اندر جاؤ۔ ان کے سامنے آنے کی کوشش مت کرو۔ یہ تمہارے حق میں بہتر ہے.....“

عورت نے کچھ ایسے انداز میں یہ جملے کہے تھے کہ میں خوف زدہ ہو گئی اور واپس اندر آ کر مسہری پر جا لیٹی۔ میری آنکھیں آنسو برس رہی تھیں۔

تھوڑی دیر گزری تھی کہ دروازے پر دوبارہ آہٹیں ہوئیں۔ اس بار کچھ نئے لوگ اندر داخل ہوئے۔ ایک بوڑھا آدمی جس کے بال بالکل سفید تھے۔ وہ انگریز نظر آتا تھا۔ اُس کے ساتھ گٹھے ہوئے سر کا مالک ایک اور شخص تھا جو دھوتی اور کرتا پہنے ہوئے ماتھے پر چندن کا ٹیکہ لگائے ہوئے تھا۔ اُس کے ہاتھ میں ایک قیمتی چھڑی دبی ہوئی تھی۔ پیچھے کچھ اور لوگ آئے جو دروازے کے قریب ہی کھڑے ہو گئے۔ وہ دونوں مجھے گھورتے ہوئے میرے پاس آ گئے تھے۔ دھوتی والے شخص نے کہا۔

”پدما کماری ہوش میں آ گئیں؟“

”دیکھو! تم لوگ مجھے چھوڑ دو۔ میں نے کیا بگاڑا ہے تمہارا؟ کیوں اس طرح بڑے یہاں لے آئے ہو؟ کیا دشمنی ہے تمہاری مجھ سے؟ میں کون ہوں اور میری ذات سے تمہارے کیا نقصان پہنچا ہے.....؟“

”فکر مت کرو کماری جی! یہاں تم آرام سے ہو اور ہم تمہیں یہی کہنے آئے تھے کہ کس قسم کی فکر نہ کرنا۔ تم سے کچھ باتیں پوچھنی تھیں۔ اگر تمہارا دماغ صحیح ہو تو ان باتوں کا جواب دے دو..... ہو سکتا ہے تمہاری جان بچ جائے۔ ورنہ نقصان بھی اٹھا سکتی ہو۔“

”بالکل..... بالکل.....“ انگریز نے اردو میں کہا اور میں چونک کر اُسے دیکھنے لگی۔ پھر میں نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے اُس ہندوستانی شخص کو دیکھا اور بولی۔

”کیا پوچھنا چاہتے ہو تم مجھ سے؟“

”گوپال سانگا کے بارے میں۔“

”اُسے تو تم نے مار دیا۔“

”اُسے مرنا ہی تھا لڑکی! لیکن اگر تم اُس کی طرح مرنا نہیں چاہتیں تو یہ بتاؤ کہ گوپال نے مرنے سے پہلے تم سے کچھ کہا تھا؟“

”صرف اتنا کہ کچھ لوگ اُن کے دشمن ہو گئے ہیں اور وہ مجھے بچانا چاہتے تھے اور یہ بھی کہ وہ میرے باپ نہیں تھے۔ میں کسی اور کی اولاد ہوں۔ لیکن وہ یہ نہیں جانتے تھے کہ کس کی.....“

”لڑکی! ذہن پر زور دے کر گوپال کی تمام حرکتوں کی تفصیل بتاؤ! کوئی ایسی چیز ہے تمہارے پاس جو گوپال نے اپنے قبضے میں کر لی ہو یا جس کے بارے میں اُس نے کبھی اشارتاً کہا ہو کہ اس سے تمہاری شناخت ہو سکتی ہے؟“

”کاش! ایسی کوئی چیز ہوتی۔“ میں نے غم زدہ لہجے میں کہا اور ہندوستانی، انگریز کی طرف دیکھنے لگا۔ تب انگریز سے ٹوٹی پھوٹی اردو میں کہا۔

”کوئی بات نہیں..... کوئی بات نہیں..... میں ساری زندگی انتظار کر سکتا ہوں لاٹ پال.....“

میں بری طرح چونک پڑی۔ لاٹ پال کا نام ہی تو لیا تھا گوپال نے۔ لیکن اُس نے تو یہ کہا تھا کہ اگر اُسے کچھ ہو جائے تو میں چاند نگر جا کر لاٹ پال کے پاس پناہ لوں۔ کیا یہی

شخص لاٹ پال ہے.....؟

”چلے کرل جیمز! میرا خیال ہے یہ ہمیں کچھ نہیں بتا سکے گی۔ لاٹ پال نے کہا تو میں بھونچکا رہ گئی۔ دونوں نام ہی میرے شناسا نکلے تھے۔ اُس وقت تو وہ چلے گئے لیکن اگلی صبح دونوں مکار پھر میرے پاس موجود تھے..... اس بار وہ دونوں تنہا ہی تھے۔ بڑے اطمینان سے آکر کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ کرل جیمز نے جیب سے پائپ نکال کر دانتوں میں دبایا اور اُسے سلگانے لگا۔

لاٹ پال بولا۔ ”پدماوتی جی! آپ نے صورت حال کا اچھی طرح اندازہ لگا لیا ہوگا۔ بہتر یہ ہے کہ اپنی یادداشت استعمال کر کے ہمارے سوالات کے جواب دے دیں۔ بچپن سے کوئی ایسی شے جو آپ کے لئے محفوظ رکھی گئی ہو یا جس کا تذکرہ گوپال نے اس انداز میں کیا ہو کہ یہ آپ کی زندگی کا کوئی اہم راز ہے۔ اگر آپ اس کی نشاندہی کر دیتی ہیں تو یوں سمجھ لیجئے کہ ہمارے اور آپ کے درمیان ہر کھیل ختم ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد آپ کو جیون گزارنے کی آزادی ہوگی۔ جس کے ساتھ جی چاہے رہیں۔ ہمیں آپ سے کوئی دلچسپی نہیں ہوگی۔ بلکہ یہی نہیں آپ کو جیون گزارنے کے لئے ایک اچھا گھر اور بہت سی دولت دے دی جائے گی تاکہ آپ کو کوئی تکلیف نہ ہو۔ ورنہ آپ اسی قید خانے میں اپنی بقیہ زندگی گزار دیں گی۔“

میں نفرت بھری نگاہوں سے اُن دونوں کو دیکھتی رہی۔ کرل جیمز چہرے سے مکار نظر آتا تھا۔ کبخت بوڑھا تھا لیکن ایسی شاندار صحت کا مالک کہ سفید بال مصنوعی معلوم ہوتے تھے۔ وہ پائپ کے گہرے گہرے کش لے رہا تھا اور بظاہر خود کو ان تمام باتوں سے لاتعلقی ظاہر کر رہا تھا۔

میں نے لاٹ پال کا چہرہ دیکھا اور پھر آہستہ سے بولی۔ ”ایک بات مجھے بھی بتا دیجئے چاچا جی! کیا یہ چاند نگر ہے؟“

لاٹ پال نے کسی قدر چونک کر مجھے دیکھا اور پھر آہستہ سے بولا۔ ”ہاں! چاند نگر ہی ہے۔ مگر اس سے تمہیں کیا واسطہ؟“

”یہی تو پریشانی کی سب سے بڑی بات ہے لاٹ پال جی! اگر یہ چاند نگر ہے اور آپ لاٹ پال تو پھر بابا نے مجھے یہ کیوں کہا تھا کہ اگر وہ ان غاروں میں مر جائیں تو میں کسی

بیشہ ساتھ رکھنی چاہئے۔ اور یہی جنم کنڈلی میری گردن میں پڑی ہوئی تھی۔ میں نے ٹٹول کر اُسے دیکھا اور سوچنے لگی کہ کیا یہی جنم کنڈلی اُن لوگوں کے لئے باعث دلچسپی ہو سکتی ہے؟ بہر طور! میں نے بھی یہ فیصلہ کر لیا کہ یہ شے جنم کنڈلی ہے یا نہیں لیکن میں اسے کسی کو کبھی نہیں دوں گی۔

پورا دن گزر گیا۔ کھانے پینے کا بندوبست کر دیا جاتا تھا اور میں تھوڑا بہت زہر مار بھی کر لیتی تھی کیونکہ بچپن ہی سے مجھ میں بھوک کی برداشت نہیں تھی۔ سارے غم تکلیفیں اپنی جگہ، شام کو لاج پال دوبارہ میرے کمرے میں آیا۔ اس بار کرنل جیمز اُس کے ہمراہ نہیں تھا۔ اُس کے چہرے میں بھی کچھ تبدیلیاں نظر آ رہی تھیں۔ اندر داخل ہوتے ہی وہ بے اختیار مجھ پر چھٹا..... میں سمجھ نہیں سکتی تھی کہ وہ کیا کرنا چاہتا ہے؟ لیکن لاج پال نے میرا سراپنہ سینے سے لگا لیا اور میرے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے کہنے لگا۔

”میری بچی..... میری بیٹی! اپنے چاچا کو اتنا مجبور سمجھ کہ اس کے بعد مجبور یوں کا تصور ختم ہو جائے۔ تو میری اولاد کی طرح ہے۔ جو کچھ میں نے تجھ سے کہا، مجھے معاف کر دینا۔ اگر میں یہ سب کچھ نہ کروں تو یوں سمجھ لے کہ میرا خاندان تک ختم ہو جائے۔ میں تیرے پاس زیادہ وقت نہیں رہ سکتا۔ صرف ایک بات بتائے دیتا ہوں کہ اگر تیرے علم میں کچھ ہے بھی تو انہیں ایک لفظ نہ بتانا، بلکہ معصومیت سے یہی ظاہر کرتی رہنا کہ تجھے کچھ نہیں معلوم۔ ایک خاص بات اور سن لے! ٹھا کر رنجیت کمار تیرا دوست ہے۔ شاید تو نے کبھی گوپال کے منہ سے ٹھا کر اجیت کمار کا نام سنا ہو۔ رنجیت کمار اُسی کا بیٹا ہے۔ ٹھا کر اجیت نے مرتے وقت اُسے وصیت کی تھی کہ ساری زندگی تیری سیوا میں بسر کر دے۔ وہ جہاں اور جس حالت میں بھی تیرے سامنے آئے، دوسروں کے سامنے اس کا اظہار مت کرنا۔ اُس نے تیری ہی وجہ سے کرنل جیمز کی نوکری اختیار کی ہے۔ اُسے اپنے دل کا راز بتا دینا۔ وہ تیرا سب سے بڑا محافظ ہے۔“

میں حیرت سے لاج پال کی صورت دیکھتی رہی۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ پوچھتی، باہر قدموں کی چاپ سنائی دی اور لاج پال پھرتی سے دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔ اگلے دن کرنل جیمز پھر میرے پاس آیا۔ وہ بھی تنہا تھا۔ ٹوٹی پھوٹی اُردو بول لیتا تھا۔ اُس نے بدلے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”میں تمہیں لندن لئے جا رہا ہوں۔ تم اطمینان رکھو!

طرح کوشش کر کے چاند گز پہنچ جاؤں اور آپ کے پاس پناہ لے لوں۔ ایسا کیوں کہ انہوں نے نہ؟ مجھے دشمنوں کے منہ میں کیوں پھینکنا چاہا تھا؟“

میں نے سوال کیا اور لاج پال ہنس دیا۔ ”اگر اُس نے یہ کہا تھا تو پھر اس کے علاوہ کچھ نہیں سوچا جاسکتا کہ اپنی عمر کے آخری وقت میں وہ پاگل ہو گیا تھا۔ ورنہ ہوش کے میں یہ کبھی نہ کہتا۔“

”چلیں..... یہ تو بتا دیں کہ میں کون ہوں؟ اس کے بعد جو سلوک چاہیں میرے ساتھ کریں۔“

”تو..... تو سونے کی چڑیا بلکہ ہما ہے کہ جس کے سر پر بیٹھ جائے، اُس کی زندگی جائے.....“

بوڑھے کرنل جیمز کا مکروہ قہقہہ کمرے میں گونج اُٹھا۔ ”لاج پھال! تم بہت ہائے.....“

لاج پال ہنستے ہوئے مجھے دیکھتا رہا۔ ”سمجھ گئی تو..... کہ تو کون ہے؟ ہاں! اب میرا سوال کا جواب دے۔ ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔“

”تو پھر لاج پال! میرا بابا تو شاید آخری وقت میں پاگل ہو گیا تھا مگر تم ساری زندگی پاگل رہو گے۔ ایسی کوئی چیز میرے علم میں نہیں ہے۔ اگر ہوتی بھی تو تمہیں کبھی نہ بتانا لیکن ایک بات سن کر تمہیں خوشی ہوگی کہ میں اپنی دُھن کی پکی ہوں۔ تم لوگ جو سلوک میرے ساتھ کر سکتے ہو۔ لیکن کسی بات میں مجھے جھکا نہیں سکتے۔ مرنا ہر شخص کے بس ہوتا ہے۔ اگر تم نے میرے ساتھ کوئی بدتمیزی کرنے کی کوشش کی تو میں جان دے گی۔“

کرنل نے اپنی جگہ سے اُٹھتے ہوئے کہا۔ ”چھالو لاج پال! یہ لڑکی ابھی ٹھیک نہیں گا۔“

لاج پال ایک گہری سانس لے کر اُٹھ گیا تھا۔ جب وہ چلے گئے تو میں سوچنے لگی۔ ایسی کون سی چیز ہو سکتی ہے جو ہمیشہ سے میرے پاس رہی ہو اور مجھے اُس کی حفاظت کر کے لئے کہا گیا ہو۔ صرف ایک چیز ہمیشہ سے میرے پاس تھی۔ سونے کا وہ زیور..... وقت بھی میرے گلے میں تھا۔ ایک بار بابا نے کہا تھا کہ یہ میری جنم کنڈلی ہے اور جنم

میری تم سے کوئی دشمنی نہیں ہے۔ جن لوگوں سے میری دشمنی ہے، اُن تک تمہارے ذریعے ہی پہنچا جا سکتا ہے۔ مجھ سے تعاون کرنا۔ ورنہ میں نہ سہی کچھ اور لوگ تمہیں موت گھاٹ اُتار دیں گے۔“

میرا دل دھک سے رہ گیا۔ میری بستی، میرے لوگ مجھ سے چھوٹ رہے تھے۔ بہر میری تقدیر میں کیا کیا لکھا تھا؟ پھر مجھے لندن تک کا سفر کرنا پڑا اور اس سفر میں وہ نوجوان میرے ساتھ تھا جس کا نام رنجیت کمار بتایا گیا تھا۔ ہم لوگ بحری جہاز سے سفر کر کے مقامات پر اترے اور بالآخر لندن پہنچ گئے۔ لندن پہنچ کر مجھے انگریزی زبان سکھانی جا لگی۔ رہائش کے لئے معقول بندوبست کر دیا گیا اور دلچسپ بات یہ تھی کہ رنجیت کمار محافظ تھا۔ لاج پال کے بیان کے برعکس اُس نے آج تک مجھ سے ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ البتہ ایک رات جب شدید بارش ہو رہی تھی اور چاروں طرف ہوکا عالم طاری ہو رہا تھا رنجیت کمار سنجیدہ چہرہ لئے میرے پاس پہنچ گیا.....

”پدما جی! آج پہلی بار مجھے موقع ملا ہے کہ میں آپ سے کچھ ذاتی باتیں بھی لوں..... چند جملے کہنا چاہتا ہوں۔ میں آپ کے دشمنوں میں ضرور شامل ہوں لیکن آپ کو ایک واحد دوست ہوں۔ پتا جی نے مجھے وصیت کی تھی کہ میں آپ کو اپنا جیون سوپ ڈول آپ ہی کے لئے مرجاؤں۔ میں آپ کو پوری تفصیل تو نہیں بتا سکتا بس! اتنا کہتا ہوں! اگر آپ اپنے بارے میں کچھ نہیں جانتیں تو اپنی حفاظت کا بندوبست ضرور رکھئے گا..... ایسی بات جو آپ کے ذہن میں ہو، انہیں نہ بتائیے ورنہ اس کے بعد آپ کی زندگی کا ضمانت نہیں رہے گی۔“

”لاج پال جی نے بھی مجھے یہی کہا تھا۔ میں اتنی عاجز آچکی ہوں اپنی زندگی سے اب اگر مجھے موت بھی آجائے تو مجھے چتنا نہیں۔“

”نہیں کمار جی! آپ کو مرنا نہیں ہے۔ بہت سے کام ہیں آپ کے سپرد۔ آپ جیون اپنا نہیں ہے۔ بلکہ کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جو آپ کے لئے جی رہے ہیں۔ اپنا خیال رکھئے گا۔“

وہ واپسی کے لئے پلٹا ہی تھا کہ میں نے اُسے عقب سے پکڑ لیا۔ ”کیا تم بھی مجھ سے نہیں بتاؤ گے کہ میں کون ہوں؟ اور میرے جیون کا کیا راز ہے؟“

”بھگوان کی سوگند! یہ میں بھی نہیں جانتا۔ کہیں کسی جگہ اس راز کا کوئی مرکز ضرور ہے۔ یہ لوگ آپ سے جو کچھ پوچھتے رہے ہیں، اُس کا کوئی نہ کوئی مقصد تو ہوگا۔“

”ٹھیک ہے! تم یہ زیور لے جاؤ۔ اس کے تعویذ میں میری جنم کنڈلی ہے۔ اگر تم معلوم کر سکتے ہو تو اس کاغذ کے ذریعے کوئی معلومات حاصل کر لینا۔ پتہ چل جائے تو مجھے بھی بتا دینا۔ اور اگر اس میں سے کچھ نہ نکلے تو اسے پھینک دینا۔ مجھے زیوروں سے دلچسپی نہیں ہے۔“ میں نے اپنی جنم کنڈلی اُتار کر اُسے دے دی۔ اور رنجیت کے چہرے پر عجیب سے آثار پھیل گئے۔ اُس نے اُسے چوم کر آنکھوں سے لگا لیا۔ ”اگر اس میں کچھ نہیں بھی ہے دیوی جی! تو اس میں آپ کا اعتماد چھپا ہوا ہے۔ چتنا نہ کریں۔ یہ میرے پاس آپ کی امانت ہے۔ اگر اس سے مجھے کچھ معلوم ہو گیا تو میں آپ کو بھی خبردار کر دوں گا۔ اور اگر کچھ نہ پتا چلا تو آپ کی یہ امانت حفاظت سے آپ کے پاس پہنچا دی جائے گی۔“

رنجیت کمار باہر نکلا۔ لیکن اُس کے بعد بھاگ دوڑ اور گولیاں چلنے کی آوازیں فضا میں ابھریں۔ میں وحشت زدہ ہو گئی۔ کچھ لوگ میرے کمرے کے دروازے سے بھی ٹکرائے تھے۔ انہوں نے دروازہ کھول کر اندر بھی جھانکا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک شخص اندر آیا اور اُس نے خونخوار نظروں سے مجھے گھورتے ہوئے کہا۔ ”چالاک لڑکی! تو نے ہمارا بیڑا غرق کر دیا۔ کیا وہ زیور تو ہمارے حوالے نہیں کر سکتی تھی؟“

مجھے شدید حیرت ہوئی کہ اُن لوگوں کو میری اور رنجیت کمار کی گفتگو کے بارے میں کیسے معلوم ہو گیا؟ لیکن بعد میں صورتِ حال پتہ چل گئی۔ میرے کمرے میں ایسے خفیہ آلات لگا دیئے گئے تھے جو میری آوازوں کو ریکارڈ کر کے دوسری جگہ منتقل کر دیتے تھے۔ مجھے یہ بھی پتہ چل گیا کہ رنجیت کمار چند لوگوں کو زخمی کر کے میری جنم کنڈلی لے کر نکل گیا ہے۔ اس کے بعد سے میں بھٹکتی رہی ہوں۔ کرنل جیمز سے میری دوبارہ ملاقات نہیں ہوئی۔ لیکن میں بہت سے شہروں میں لے جائی گئی۔ اب مجھ سے اُس راز کے بارے میں بھی نہیں پوچھا جاتا۔ صرف مجھے قید رکھا جاتا ہے۔ بیل کیروسا کی کہانی بھی اسی درمیان شامل ہوئی تھی۔ وہ بھی میرے نگرانوں میں سے تھا۔ لیکن اُسے مجھ پر ترس آ گیا۔ میں نے اُسے اپنی کہانی سنائی تو اُس نے وعدہ کیا کہ وہ رنجیت کمار کو تلاش کرے گا۔ لیکن وہ اس سلسلے میں ناکام رہا اور فرار ہو گیا۔ اور اب تم نے مجھے کبھی کی کہانی بھی سنائی ہے۔ بہر طور! میں کسی کے لئے کیا غم

ایک شاطرانہ چمک تھی۔ مجھے دیکھ کر اُس نے مسکراتے ہوئے گردن ہلائی اور سامنے کبھی بوئی کرسی پر بیٹھنے کی پیشکش کی۔

”ہیلو مسٹر منصور!“ اُس نے بھاری لہجے میں کہا اور ایک لمحے کے لئے میں بوکھلا کر رہ گیا۔ تاہم میں نے خود کو سنبھال لیا تھا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ اُس شخص نے مجھے میرے نام سے کیسے مخاطب کیا ہے؟ وہ گہری نگاہوں سے میرا جائزہ لیتا رہا۔ پھر اُس نے کہا۔ ”تم یقیناً سوچ رہے ہو گے کہ میں تمہارے اصل نام سے کیسے واقف ہو گیا؟ ڈکٹا فون ایک معمولی سی ایجاد ہے۔ پدما کے کمرے میں ایک سیٹ لگا ہوا ہے جس کے ذریعے وہاں ہونے والی تمام گفتگو سنی جا رہی تھی۔ لیکن اسی گفتگو نے تمہاری پوزیشن صاف کر دی ہے اور تمہیں ایک عذاب سے بچا لیا ہے۔ میرے ساتھی رنجیت کمار کو نہیں جانتے۔ انہیں صرف اُس کی قلمی تصویریں دکھائی گئی ہیں۔ تمہارے خدو خال کافی حد تک رنجیت کمار سے ملتے جلتے ہیں اس لئے وہ لوگ تمہیں پکڑ لائے تھے۔“

میں خاموش رہا۔ ظاہر ہے کیا کہہ سکتا تھا؟

کرنل تھوڑی دیر منتظر رہا۔ لیکن میں خاموش رہا تو وہ دوبارہ گویا ہوا۔ ”تم ایک سیاح ہو اور میں تمہیں اپنی طرف سے سیاحت کی دعوت دیتا ہوں اور پچاس لاکھ روپے نقد معاوضے کی پیش کش بھی کرتا ہوں بشرطیکہ تم ہیرو بننے کا خیال دل سے نکال دو۔ یہ رقم میں تمہیں اپنے ایک کام کے عوض پیش کر سکتا ہوں۔ بشرطیکہ تم اس کی تکمیل میں پوری پوری محنت کرو۔“

راعمیس نے میرے کان میں کہا۔ ”لپک لے لپک لے۔ موقع اچھا ہے۔“ میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیل گئی تھی۔ کرنل جیمز بھی مسکرانے لگا۔

”مجھے کرنا کیا ہوگا کرنل؟“

”میرا نام کرنل جیمز ہے۔ میں بھارت میں ایک اعلیٰ سرکاری عہدے پر رہا ہوں۔ وہاں سے ہماری حکومت ضرور ختم ہو گئی، لیکن ہندوستان میں ہمارے وفاداروں کی کمی بھی نہیں تھی۔ کچھ لوگوں نے میرے خلاف کارروائی کی تھی اور ان سے بدلہ لینے کی خواہش آج بھی میرے دل میں چٹکیاں لیتی رہی ہے یہ معاملہ بھی کچھ ایسا ہی ہے میں کچھ لوگوں کے خلاف صف آرا ہوں اور اسی سلسلے میں، میں تمہیں استعمال کرنا چاہتا ہوں۔“

کروں؟ میں آج تک خود اپنے بارے میں کچھ نہیں جان سکی۔ کیا قصہ ہے؟ اور کون میرا ہے؟ منصور! میں وہ بد نصیب لڑکی ہوں جسے اپنے ماں باپ کے بارے میں بھی کچھ نہیں معلوم۔ تمہیں یہ رنجیت کمار کے دھوکے میں پکڑ لائے ہیں۔ تمہارے خدو خال اور جسامت اُس سے ملتی جلتی ہے۔ لیکن اگر تمہیں کرنل جیمز کے سامنے پیش کیا گیا تو ظاہر ہے وہ بات کی تصدیق کر دے گا کہ تم رنجیت کمار نہیں ہو اور اس کے بعد تمہیں چھوڑ دیا جائے گا۔ میں افسردہ ہوں کہ تم میری وجہ سے مصیبت میں پھنسے۔ اپنے آپ کو رنجیت کمار تسلیم نہ کرو کسی نہ کسی وقت اس کی تصدیق ہو جائے گی۔“

”شکر ہے خاموشی تو ہوئی۔۔۔۔۔“ میرے کان میں راعمیس کی جھنجھناہٹ اُبھری اور گہری سانس لے کر رہ گیا۔ اُس کا مطلب مجھے اچھی طرح معلوم تھا۔ بہر طور! میں بھی اُبھندو راجکماری سے متاثر ہو گیا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ پدما سے کیا کہوں؟ لپک سمجھانے کے لئے وہ خبیث رُوح جو موجود تھی۔ ایک بار پھر اُس کی آواز میرے کانوں میں اُبھری۔ ”بہت زیادہ سمجھانے کی ضرورت بھی نہیں۔ تم دونوں ہی ایشیائی ہو اور تھوڑے۔۔۔۔۔ فاصلے کے پڑوسی ہو۔ اس سے انسانی بنیادوں پر اظہارِ ہمدردی کرو۔ رنجیت کمار اتنا محبوب نہیں ہے، صرف ہمدرد ہے۔ اور تم بھی اُس کے ہمدرد بن سکتے ہو۔ میرا خیال۔۔۔۔۔ صورت حال ہموار ہے اور ایسی حسین صورت نظر انداز کرنے کے قابل نہیں۔“

دل تو چاہا کہ اُس سے پوچھوں کہ بد بخت! میں کیا کر سکتا ہوں؟ تو نے میرے گردن بن رکھے ہیں۔ لیکن ظاہر ہے پدما کی موجودگی میں یہ سوالات میں اُس سے نہیں کر سکتا۔ چنانچہ خاموش رہا۔ پدما بھی گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی۔ میں نے اُس کی طرف دیکھ کر عجیب حسن تھا۔ چہرے سے گویا گلاب کے رنگ حاصل ہوتے تھے۔ اتنی متناسب اور لڑکی بلاشبہ اس سے پہلے کبھی میری نگاہوں سے نہیں گزری تھی۔ میں نے اُس سے دعا لیا کہ رہا ہونے کے بعد بھی میں اُسے نہیں بھولوں گا۔ پدما جواب میں خاموش ہی رہی تھی۔ کافی دیر کے بعد چند لوگ مجھے بلانے کے لئے آئے۔ مجھے اُسی کمرے میں پہنچا دیا جہاں پہلی بار میری اُن لوگوں سے بات چیت ہوئی تھی۔ وہاں اس وقت صرف دو آدمی تھے۔ ایک بھاری بدن اور گنجنے سر کا آدمی تھا اور دوسرا ایک بوڑھا جس کے ہونٹوں پر پاپ دبا ہوا تھا۔ اگر میرا اندازہ غلط نہیں تھا تو یہ کرنل جیمز ہی تھا۔ بڑی بڑی آنکھوں

راعمیس نے پھر میرے کان میں سرگوشی کی۔ ”اس مردود کی ہاں میں ہاں ملاؤ۔“
میں گردن ہلانے لگا پھر میں نے آہستہ سے کہا۔ ”کرنل جیمز تم مجھ پر اعتبار کیسے کر رہے
اور مجھے یہ بات قطعی ناپسند ہوگی کہ جب میں تمہارا..... کام کرنے کا وعدہ کر لوں تو تم
مشکوک نگاہوں سے دیکھو۔“

کرنل جیمز منہ سے پائپ نکال کر ہاتھ میں لیتے ہوئے بولا۔

”میں نے پون صدی گزار دی ہے عمر کے بیس سال نکال دو تو پچپن سال تجربے
ہیں۔ یہ بات مجھ پر چھوڑ دو کہ کس طرح تم پر اعتماد کرنا ہے؟“
”تو پھر ٹھیک ہے کرنل میں پچاس لاکھ کے حصول کے لئے ہر وہ کام کرنے کے لئے
ہوں جو تم کہو۔“

کرنل جیمز نے گرم جوشی سے مجھ سے ہاتھ ملایا اور پھر کہنے لگا۔ ”اس کے لئے تمہیں
بدستور کماری پدما کو بیوقوف بنانا ہوگا۔ حسین لڑکی ہے اپنے طور پر تم جس طرح چاہو
سے تعلقات رکھو تم سے متاثر ہو کر اگر وہ تمہیں اپنا قرب بخش دے تو مجھے کوئی اعتراض
ہوگا میں ان لوگوں کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں جو اس لڑکی کے سرپرست ہیں یا
کے والدین ہیں۔ بس اتنا سا کام ہے جو تمہیں کرنا ہے۔ یہ سچ ہے کہ وہ لڑکی خود بھی اپنا
والدین کے بارے میں کچھ نہیں جانتی صرف ایک کم بخت تھا جو سچ بات بتا سکتا تھا اور اس کا
نام گوپال سانگا تھا جو مرچکا ہے ہمارے تمام ذرائع بے اثر ہو چکے ہیں چنانچہ اب ایک
ترکیب ذہن میں آتی ہے اور وہ بھی تمہارے توسط سے۔ تم پدما کو واپس ہندوستان
جاؤ۔ راجپوتانہ کے علاقے میں تمہیں ”کنڈوالا“ جانا ہے جس کا ایک قصبہ ”تنوریا“ ہے۔
کی تمہارے ساتھ موجودگی اس بات کی تصدیق کر دے گی کہ تمہارا تعلق اسی سے ہے اور
پدما کو اس طرح اپنے ساتھ شامل کرو کہ وہ تم پر مکمل اعتبار کر لے۔ ہو سکتا ہے وہ لوگ
پدما کے اپنے ہیں کسی طرح اسے پالیں اور ہمارا کام بن جائے۔ میں تمہیں کچھ نام ڈوں
جن سے تمہیں اس طرح ملاقات کرنی ہے کہ یہ ملاقات حقیقی محسوس نہ ہو اور پھر تم
حقیقتوں کو پاسکتے ہیں جن کا معاوضہ پچاس لاکھ ہے۔“

کرنل کی اس بات پر میں دیر تک غور کرتا رہا، پھر میں نے گردن ہلاتے ہوئے
”ٹھیک ہے کرنل جیمز!“ میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ اپنی تمام تر صلاحیتوں کے ساتھ

یہ کام انجام دوں گا۔“
”باقی گفتگو ہماری دوسری ملاقات پر ہوگی۔ تم پدما کے ساتھ رہو اور اس پر اپنا اعتماد
بھانے کی کوشش کرو۔“

میں کرنل کے پاس سے اٹھ گیا اور چند لوگوں نے مجھے وہیں چھوڑ دیا جہاں پر پدما
موجود تھی وہ مجھے دیکھ کر مضطربانہ انداز میں اٹھ کھڑی ہو گئی۔
”کیا ہوا منصور؟“

”کرنل جیمز نے مجھے شناخت کر لیا ہے کہ میں رنجیت کمار نہیں ہوں لیکن اس کے ساتھ
ہی اس نے یہ ذمہ داری بھی میرے سپرد کر دی ہے کہ میں تمہیں لے کر ہندوستان چلا جاؤں
اور گوپال کے خاندان کو تلاش کر کے ان سے تمہارا راز معلوم کروں۔“

”اوہ۔ تم نے اس بات کی حامی بھر لی ہے؟“

”اس کے علاوہ تمہاری مدد کرنے کا اور کوئی ذریعہ ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ اطمینان رکھو جو
کچھ ہو رہا ہے اب تمہارے حق میں بہتر ہو رہا ہے۔“

”میں تو پاگل ہو گئی ہوں یہ سن کر اپنے دیس جانا چاہتی ہوں منصور! تمہیں کچھ دے تو
نہیں سکتی بس یہی کہہ سکتی ہوں کہ جیون بھر تمہارا احسان مانوں گی کسی طرح مجھے میرے
اپنوں سے ملا دو۔“

”میں پوری کوشش کروں گا تم فکر مت کرو۔“

اس کے بعد پدما مجھ سے طرح طرح کے سوالات کرتی رہی تھی اور میں اسے بڑی
ہوشیاری سے جواب دیتا رہا تھا پھر وہ خاموش ہو گئی میں نے بھی اسے نہیں چھیڑا۔

راعمیس نے آہستہ سے میرے کان میں کہا۔ ”اتنا ہی نہیں آہستہ آہستہ اس سے اظہار
محبت بھی کرتے رہو۔ تمہیں اس کے مواقع حاصل ہیں۔“

”راعمیس جو کچھ میں کر رہا ہوں بس اتنا ہی رہنے دو۔ مدد کر سکتے ہو تو مجھے پدما کے
بارے میں حقیقتیں بتاؤ۔“ میں نے دل ہی دل میں اسے کہا۔

”یہ ممکن نہیں ہے میرے دوست جو باتیں صیغہ راز میں ہیں مجھے ان کا علم نہیں ہوتا
۔ البتہ میں کوشش کرتا رہا رہوں گا کہ وقت سے پہلے تمہیں حالات سے آگاہ کرتا رہوں۔“

”دوسرے دن پھر مجھے کرنل جیمز کے سامنے پیش کیا گیا وہ اپنے مخصوص انداز میں بیٹھا

پائپ پی رہا تھا مجھے دیکھ کر اس نے سرد مہری سے گردن ہلائی اور سامنے بیٹھنے کی پیشکش کی۔
”اگر تم کہو تو رقم تمہیں کام کی تکمیل سے پہلے بھی ادا کی جاسکتی ہے یہ صرف تم پر منحصر ہے۔“ اس نے بغیر کسی تمہید کے کہا۔

”نہیں میں کام کے بعد یہ سب کچھ حاصل کرنا چاہتا ہوں۔“

”گڈ۔ تمہارا یہ جواب انتہائی تسلی بخش ہے۔ تمہیں جتنی جلد ممکن ہو سکا، ہندوستان روانہ کر دیا جائے گا۔ کام کا آغاز تمہیں اسی طرح کرنا ہے جس طرح تم نے پدما سے کہا ہے۔ یہ حقیقت بھی ہے کہ ریاست کنڈوالا میں جا کر تمہیں گوپال سانگا کے اہل خاندان کے بارے میں معلومات حاصل کرنا ہیں۔ اگر گوپال کے اہل خاندان سے ملاقات نہ ہو تو پھر چاند نگر جاؤ گے کیونکہ لاج پال ان غداروں میں سے تھا جنہوں نے جان بوجھ کر ہمیں دھوکا دیا اور ڈبل کر اس کیا۔ لاج پال زندہ نہیں ہے البتہ اس کی اولادیں وہاں موجود ہیں۔ رنجیت کمار کے بارے میں بھی ہمیں یہ معلوم ہو چکا ہے کہ وہ اپنی بستی نہیں پہنچا بلکہ دہلی سے روپوش ہے۔ ہمارے پاس اب اس کے علاوہ کوئی چارہ کار نہیں ہے کہ ہم پدما، منظر عام پر لے آئیں۔ حالات جس طرح تمہارے سامنے آتے رہیں اسی انداز میں کام کرو۔ اس سے پہلے کبھی کسی کو ایسا موقع نہیں مل سکا کہ وہ پدما کے ساتھ اس کے اہل خاندان کی تلاش میں نکلے۔ لیکن تم پہلے آدمی ہو جسے یہ آزادی دی گئی ہے۔ رنجیت کمار اہل مل جائے تو اسے بھی اپنے جال میں پھانسو اور اس سے پدما کے زیور کے بارے میں معلومات حاصل کرو۔ اگر وہ زیور تمہارے ہاتھ آ جاتا ہے تو ممکن ہے اس کے بعد ہم کسی دوسرے کام کی ضرورت نہ پیش آئے۔“

”میرا خیال ہے کرنل تقریباً تمام ہی ضروری باتیں تم نے مجھے بتادی ہیں۔ البتہ اگرچہ اور معلوم ہو جاتا تو میں زیادہ محنت سے کام کر سکتا تھا۔“

”کچھ اور سے تمہاری کیا مراد ہے؟“

”اس تمام کارروائی کے پس پردہ کیا حقیقت ہے؟“

”نہیں میرے دوست یہ راز تمہیں نہیں دیا جاسکتا۔ اس لئے میں تم سے معذرت خواہ ہوں۔“ وہ تھوڑی دیر رک کر دوبارہ بولا۔ ”تم کوئی مؤثر منصوبہ تیار کر لو کہ تمہیں یہاں سے فرار کس طرح ہونا ہے۔ یہ تمہاری ذمہ داری ہے پدما کو اس کا احساس نہ ہونے پائے۔“

ہمارے لئے کام کر رہے ہو۔“

”اس کی تو تم فکر ہی مت کرو۔ جہاں تک یہاں سے روانہ ہونے کا تعلق ہے اس کا بندوبست تمہیں ہی کرنا ہوگا۔ میں خود کچھ نہیں کر سکتا۔“

کرنل جیمز پر خیال انداز میں گردن ہلانے لگا تھا پھر بولا۔ ”ٹھیک ہے تمہیں یہاں سے منتقل کیا جائے گا اور اسکے بعد راستے میں تم فرار ہونے کی کوشش کرنا۔ کسی ہوٹل میں ٹھہر جانا باقی انتظامات کرنے کے بعد تمہیں ہندوستان روانہ کر دیا جائے گا۔“

میں نے پرسکون انداز میں گردن ہلا دی اور وہاں سے اٹھ آیا۔

میں کرنل جیمز کی ہدایات کے مطابق عمل کرتا رہا۔ پدما بھی کافی حد تک پرسکون تھی کم بخت راعمیس کی ہدایات بھی میرے ساتھ تھیں۔ اس کی ابتداء میں نے اس وقت کی جب کرنل جیمز کے پروگرام کے بعد ہم ہوٹل میں منتقل ہوئے۔ کافی خوبصورت ہوٹل تھا۔ وہاں ہمیں کمرہ حاصل ہو گیا تھا۔ پدما اس احساس سے خوش تھی کہ اسے ایک بار پھر اپنی سرزمین پر جانا نصیب ہو رہا ہے۔ میں نے سب سے پہلے ہوٹل کے اس کمرے میں ڈکٹافون تلاش کرنے کی کوشش کی لیکن چونکہ کمرہ کرنل جیمز کی طرف سے بک نہیں کرایا گیا تھا بلکہ اسے میں نے اپنے طور پر حاصل کیا تھا۔ چنانچہ ڈکٹافون نہیں مل سکا اور میں مطمئن ہو کر وہاں مقیم ہو گیا۔

”آزادی کے لمحات بھی کتنے خوشگوار ہوتے ہیں منصور!“

پدما نے بستر پر ڈھیر ہوتے ہوئے کہا۔ ”تمہارے بارے میں کچھ تفصیلات نہیں معلوم ہو سکیں۔ بہر طور میں سمجھتی ہوں کہ تمہارا سہارا میرے لئے نہایت قیمتی ہے۔“

”اپنے بارے میں تمہیں صرف اتنا ہی بتا سکوں گا کہ ایک سیاح ہوں۔“

”تمہارے اپنے چاہنے والے بھی تو تمہاری واپسی کے منتظر ہوں گے۔ اگر ان کے بارے میں کچھ بتانے میں دقت محسوس کرتے ہو تو میں تم سے معافی چاہتی ہوں۔ کچھ نہیں پوچھوں گی لیکن ایک دوسرے سے تعارف تو ضروری ہوتا ہے تمہاری تو کم از کم شناخت ہے۔ مجھ سے کوئی یہ سوال کرے تو ذرا میری کیفیت کا اندازہ لگاؤ۔“

”میں جانتا ہوں پدما! لیکن تمہیں یہ سن کر یقیناً عبرت ہوگی کہ کم از کم تم کسی کی تلاش میں تو سرگرداں..... ہو۔ اپنے بارے میں کچھ جاننا چاہتی ہو جبکہ میں اپنے بارے میں سب

کچھ جانتے ہوئے بھی کسی کی تلاش میں سرگرداں نہیں ہوں کیونکہ یہ جاننا میرے لئے دکھ کا باعث ہے کہ میرا اس دنیا میں کوئی نہیں ہے۔“

”اوہ تنہا ہو بالکل؟“

”ہاں۔“

”اب تو میں ہوں تمہارے ساتھ۔ تم میرے محسن ہو تو میں تمہاری اس محبت کو کیسے بھول سکتی ہوں۔“

کم بخت راعمیس نے گردن کے پاس چٹکی لی تھی۔ ”موقع، موقع، فائدہ اٹھاؤ۔“ وہ بولا اور میں کان جھاڑنے لگا۔

پدمائیٹھی نگاہوں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ پھر وہ بولی

”کیوں کیا مجھے اپنوں میں تسلیم کرنے میں پس و پیش ہے؟“

”نہیں پدما۔ اپنی اس خوش بختی کا یقین نہیں آ رہا۔ بہر طور تمہارے یہ الفاظ میرے لئے بے حد قیمتی ہیں۔ مجھے زیادہ مسرت اس وقت ہوگی جب تمہیں ... تمہارے مقصد میں کامیاب دیکھوں۔“

پدما مسکراتی رہی اور پھر آہستہ آہستہ سنجیدہ ہو گئی۔

”تم نے میرے دل میں اُمید کی بہت سے روشنیاں کر دی ہیں۔“

اس نے ایک صوفے پر بیٹھ کر آنکھیں بند کر لی تھیں وہ واقعی کسی ماہر سنگ تراش کا ایک حسین مجسمہ معلوم ہو رہی تھی۔ میں گہری نگاہوں سے اسے دیکھتا رہا۔ راعمیس پر خواہ مخواہ غصہ آتا تھا ورنہ یہ حقیقت تھی کہ پدما کو اگر ساری زندگی اپنے سامنے بٹھا کر دیکھا جاتا تو زندگی گزرنے کا احساس بھی نہ ہوتا۔ وہ پاؤں کے ناخن سے لے کر سر کے بالوں تک ایک ایسی مکمل عورت تھی جس کے بعد تناسب کا تصور ختم ہو جاتا ہے اس نے آنکھیں کھولیں تو میں اپنی محویت سے چونکا۔

”کیا دیکھ رہے ہو؟“

”کچھ نہیں پدما۔ تم پر غور کر رہا تھا بلاشبہ تمہیں کسی ریاست کی راجکماری ہی کہا جاسکتا

ہے کیونکہ عام لوگ اتنے حسین نہیں ہوتے۔“

میں نے ان الفاظ پر اس کے چہرے پر شگفتگی دیکھی تھی لیکن اس نے سنجیدگی سے

کہا۔ ”میں ریاست کی راجکماری کی بجائے اگر کسی بیٹے کی لڑکی بھی نکلوں تو مجھے اتنی ہی مسرت ہوگی، جتنی کسی راجکماری کے ہونے سے۔“

”ایک سوال کروں، برا تو نہیں مانو گی؟“

”نہیں اب تمہاری کسی بات کا برا ماننا میرے بس میں بھی نہیں ہے۔“

”رنجیت کمار کے بارے میں تمہارے ذہن میں کیا تاثرات تھے؟“

”وہ صرف لمحوں کا ساتھی تھا۔ اس بات کے امکانات بھی ہو سکتے ہیں کہ وہ مجھ سے

محبت یا وفاداری بھول کر جنم کنڈلی سے اپنا ہی کوئی مقصد حاصل کرنے میں مصروف ہو گیا ہو۔ دنیا کے بارے میں تو کچھ نہیں کہا جاسکتا منصور! لوگ طرح طرح کے ہوتے ہیں اور

زیادہ تر افراد اپنے مفاد کو سب سے زیادہ برتر سمجھتے ہیں۔“

”ہاں پدما اس میں تو کوئی شک نہیں اور اگر میں تم سے یہ کہوں کہ میں ان میں سے نہیں

ہوں تو ظاہر ہے یہ میرا کہا ہوگا اور تمہارا اس پر یقین کرنا ضروری نہیں ہوگا۔“

”نہیں منصور! یہ جملے کہہ کر میرا دل مت توڑو۔ اندر کی آواز بھی کچھ ہوتی ہے اور اس

وقت میرے اندر سے جو آواز ابھر رہی ہے، اس کے الفاظ یہی ہیں کہ تم دوسروں سے مختلف ہو۔“

میرا دل چاہا کہ زور زور سے قہقہے لگاؤں۔ نجانے کتنے لوگوں نے مجھے اپنا ساتھی بنایا۔

نجانے کس کس نے اپنے مفادات مجھ سے حاصل کئے یہ کہانی اگر رقم کرنے بیٹھوں تو اسے

دنیا کی سب سے بڑی گپ سمجھا جائے گا۔ یہ راجکماری یا بیٹے کی بیٹی مجھ پر اس قدر بھروسہ کر

رہی تھی۔ لیکن دنیا کا جو رنگ میں نے دیکھا تھا، وہ کچھ اور ہی کہتا تھا۔ میں اگر کسی سے مخلص

بھی ہوں تو ضروری نہیں ہے کہ وہ میرے لئے اتنا ہی مخلص ہو۔

☆.....☆.....☆

”منصور کیا تم نے محسوس کیا کہ بہت سے لوگ ہمیں خاص طور سے دیکھ رہے تھے؟“
 ”ہاں۔“ میں نے سرسری انداز میں کہا۔

”اس کی وجہ کیا ہو سکتی ہے؟“ پدما نے ہونٹوں پر ہلکی سی شوخی مسکرا رہی تھی۔

”تمہاری خوبصورتی کے علاوہ اور کیا کہا جاسکتا ہے۔“ میں نے سادہ سے انداز میں کہا۔ ظاہر ہے یہی بات میرے ذہن میں آئی تھی۔ لیکن پدما کی آنکھوں میں شرم کے تاثرات نظر آنے لگے تھے۔ پھر وہ بولی۔

”اور تمہیں کیوں دیکھ رہے تھے؟“ اب میں نے محسوس کیا کہ اس کے اس سوال میں شرارت سی چھپی ہوئی ہے۔ چنانچہ میں نے بھی مسکراتے ہوئے کہا۔

”سوچ رہے ہوں گے کہ حور کے پہلو میں لنگور کہاں سے پہنچ گیا۔“ پدما ہنس پڑی۔

”یہ انکسار.... تو لکھنؤ والوں کا ہے۔ تم نے کہاں سے سیکھ لیا؟“

”سچ بولا ہے اس میں انکسار.... کی کیا بات ہے؟“

”میرا خیال کچھ اور ہے۔“

”کیا؟“

”بس جو ہے بتایا نہیں جاسکتا۔“

”چلو ٹھیک ہے جانے دو۔“ میں آہستہ سے بولا۔

پدما خاموش ہو گئی۔ ذرا دیر بعد پھر کہنے لگی۔

”یوں لگتا ہے جیسے برسوں کی قید کے بعد رہائی ملی ہو۔ میرے دل میں طرح طرح کے خیالات ضرور ہیں منصور! مگر تمہارا ساتھ مل جانے سے ایسا لگتا ہے جیسے اب میں محفوظ پناہ میں ہوں۔“

”میں کوشش بھی یہی کروں گا کہ تمہیں اس پناہ کا احساس ہو تا رہے اور تم اپنی منزل پر پہنچ جاؤ۔“

”منزل“ اس نے ایک سسکی سی لی۔ ”یہ منزل تو میری زندگی کی سب سے بڑی آرزو ہے نجانے کیسا ہے اس وقت جب میرے اپنے مجھے ملیں گے۔ کیسے ملیں گے۔ یہ بھگوان کا جانے۔“ میں نے کوئی جواب نہیں دیا تو بولی۔ ”تم کچھ بچھے بچھے سے ہو؟“
 ”نہیں پدما ایسی بات تو نہیں ہے۔“

دہلی ایئر پورٹ تک کوئی قابل ذکر واقعہ پیش نہ آیا۔ ہمیں دہلی سے بذریعہ ٹرین راجپوتانہ کا سفر کرنا تھا اور پھر جے پور پہنچ کر کنڈوالا کے راستے دریافت کرنے تھے۔ پدما نے مجھ سے پوچھا کہ اب کیا ارادہ ہے؟ دہلی میں قیام کیا جائے گا یا فوراً ہی یہاں سے روانگی کا بندوبست۔

”جیسا تم کہو کماری جی! بہتر تو یہ ہے کہ دہلی میں رُک کر ہم اپنے آپ کو سنبھالیں اور اس کے بعد آگے کا سفر کریں۔ کچھ منصوبے بھی بنانے ہیں۔ اس دوران تو ہم اس قسم کی کوئی بات کر ہی نہیں سکے۔“

”مجھے تو کوئی اعتراض نہیں ہے۔“ پدما نے کہا اور اس کے بعد ہم کسی ہوٹل کی تلاش میں چل پڑے۔ اشوکا حسین ترین ہوٹل تھا۔ جس میں ہمیں کمرہ مل گیا اور ہم اس کمرے میں مقیم ہو گئے۔ پدما اس دوران مجھ سے کافی بے تکلف ہو چکی تھی۔ یہاں ہم نے اپنے نام پاسپورٹوں کے مطابق ہی درج کرائے تھے جو جعلی تھے۔ اس کی ہدایت بھی کرنل جیمز ہی نے مجھے کی تھی۔ ہم نے خاصا وقت کمرے میں گزارا اور پھر شام کو نیچے اتر آئے۔ دہلی دیکھنے کو دل چاہ رہا تھا چنانچہ طے یہ پایا کہ تھوڑی دیر دہلی کی سڑکوں پر چہل قدمی کی جائے۔ ہم ہوٹل سے نکل کر پیدل ہی چل پڑے تھے۔ لاتعداد روایتیوں کا شہر دہلی ہمارے سامنے تھا۔ اس سے پہلے میں کبھی دہلی نہیں آیا تھا لیکن اس کی کہانیاں بہت سنی تھیں۔ آج دہلی کی شکل بدلی ہوئی تھی لیکن ان روایتیوں کے کھنڈرات آج بھی دیکھے جاسکتے تھے۔ پدما میرے ساتھ بہت خوش تھی۔ ہم نے محسوس کیا کہ لاتعداد نگاہیں ہماری طرف اٹھ رہی ہیں پتہ نہیں اس کی وجہ کیا تھی لیکن پدما کچھ جھینپی جھینپی سی نظر آ رہی تھی کافی دیر تک ہم چہل قدمی کرتے رہے اور اس کے بعد اشوکا واپس آ گئے۔ اپنے کمرے میں پہنچ کر پدما نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”پتہ نہیں تمہارا دل کہاں جانے کا تھا۔ میرے چکر میں پڑ کے اپنا راستہ کھوٹا کر لیا۔“
 کے صلے میں، میں تمہیں کیا دوں گی؟“

راعمیس نے میرے کان میں کہا۔ ”کہہ دے۔ کہہ دے میرے یار ہمت سے کام لے۔“
 ”بکواس مت کرو راعمیس! ہر وقت کی ٹیٹیں اچھی نہیں لگتی۔“

میں نے مدھم لہجے میں کہا تو پدماسکراتی نگاہوں سے مجھے دیکھنے لگی۔ ”جو کچھ کہنا چاہو
 زور سے بھی کہہ سکتے ہو میں برا نہیں مانوں گی۔“

”نہیں پدما! تم جو کچھ سوچ رہی ہو ایسا نہیں ہے میں اپنی خوشی سے تمہارے کام کے
 لئے آمادہ ہوا ہوں اور میری یہی خواہش ہے کہ تمہارے مقصد کی تکمیل ہو جائے۔“
 پدما ہنس کر چپ ہو گئی۔

شام کو اتر کر ہال میں آ گئے۔ ہم اپنی میز پر بیٹھے خوش گپیاں کر رہے تھے کہ ہماری نگاہ
 تھوڑے فاصلے پر اٹھ گئی ایک بہت ہی قد آور اور اسمارٹ سا سبک بیٹھا ہوا ہماری طرف دیکھ
 رہا تھا۔ اس کے ساتھ ایک خوبصورت عورت بھی تھی۔ اس کی توجہ بھی ہماری طرف ہی تھی،
 یہ کوئی بات نہیں تھی کہ میں.... خاص طور سے اس کے بارے میں سوچتا۔ لیکن اس وقت میں
 ضرور چونکا، جب وہ سکھ جوڑا اٹھ کر ہماری میز کے پاس آ گیا۔

”بھیا جی! کسی بھی جوڑے کے بیچ مداخلت کرنا اچھی بات نہیں۔ لیکن دوستیوں کی
 خواہش کس کے دل میں نہیں ہوتی۔ اجازت ہو تو آپ کے چند لمحات ہم لے لیں؟“

اس نے اتنی خوش اخلاقی سے یہ جملے ادا کئے تھے کہ انکار کرتے نہ بن پڑا اور میں نے
 آہستہ سے کہا۔ ”بیٹھے سردار جی۔“

”بیٹھو کرن کور۔“ اس نے اپنی ساتھی عورت سے کہا۔ اور دونوں بیٹھ گئے۔ پدما بھی
 چونک کر انہیں دیکھنے لگی۔

”ہمارا نام جی وسنت سنگھ ہے اور یہ ہماری دھرم پتی کرن کور ہے۔ لوگوں کا خیال تھا کہ
 ہم دونوں ایک دوسرے کے ساتھ بہت سچے ہیں اور آج ہمارا یہ خیال ہے کہ ہم دوسرے

نمبر پر آ گئے آپ کی دھرم پتی بہت سندر ہیں اور آپ بھی۔“ اس نے پدما کی طرف دیکھ
 ہوئے کہا اور پدما کا چہرہ گلاں ہو گیا۔ میں نے کچھ کہنا چاہا تو پدما نے میرے بازو پر ہاتھ
 رکھ دیا۔ میرے ذہن میں یہی تصور ابھرا کہ پدما ان جملوں کی تردید نہیں چاہتی۔ میں مسکرا

کر رہ گیا۔

”آپ سے تعارف نہیں ہوا بھائی جی آپ کا شبھ نام؟“

”میرا نام شیتل کپور ہے اور یہ میرے پتی سندرا لال کپور۔“ میری بجائے پدما بول پڑی
 تھی۔

”بڑی خوشی ہوئی آپ لوگوں سے مل کر کہیں باہر سے آئے ہیں شاید، دلی کے نہیں
 لگتے؟“

”ہاں ہم دونوں کئی ملکوں کی سیر کر کے واپس آئے ہیں۔“

”اوہو۔ میرا بھی یہی خیال تھا تو نے دیکھا کرن کور، میں نے سچ ہی کہا تھا۔ دراصل
 آپ کا لباس یہ بتاتا ہے کہ آپ تازہ تازہ کہیں باہر سے لوٹے ہیں۔“ وسنت سنگھ کہنے لگا۔

”میرا یہاں گاڑیوں کا چھوٹا موٹا کاروبار ہے اور مہا گورو کی عنایت سے اچھی خاصی
 زندگی گزار رہے ہیں۔ بات یہ ہے جی کہ ہم حسن پرست ہیں۔ کرن کور نے ایک نگاہ مجھے
 دیکھا اور پسند کر لیا اور تل گئی اس بات پر کہ شادی کرے گی تو مجھ سے ہی کرے گی۔ میں
 نے اسے دیکھا تو میں نے بھی یہ سوچا کہ چلو ٹھیک ہے اپنی ٹکمر پر آ ہی جائے گی آہستہ
 آہستہ۔“ کرن کور ہنسنے لگی تھی میں احمقوں کی طرح ان دونوں کو دیکھ رہا تھا۔

وسنت سنگھ کہنے لگا۔ ”کیا بات ہے بھائی جی۔ آپ ذرا کم بولتے ہیں مگر آپ کی دھرم
 پتی جی خاصی خوش اخلاق ہیں۔“

”نہیں دوست خوش اخلاق تو میں بھی ہوں بس مجھے ذرا اپنی خوش اخلاقی کا اظہار
 کرنے میں دیر لگ جاتی ہے۔“

میں نے صورتحال کو سنبھالتے ہوئے کہا۔ ویسے پدما کی اس حرکت کو میں نے عجیب سی
 نگاہوں سے دیکھا تھا۔ رفتہ رفتہ وہ کھلتی جا رہی تھی۔ خیر، اب ایسی بات بھی نہیں تھی کہ میں
 اس کی اس بے تکلفی سے کسی پریشانی کا شکار ہو جاتا بس فطرتاً ہی میں دیر سے گھٹنے ملنے
 والوں میں سے تھا۔

وسنت سنگھ ضرورت سے زیادہ ہی ملنسار تھا۔ ہم لوگوں کو اس نے اپنی رہائش گاہ پر
 دعوت بھی دے دی اور وعدہ لیا کہ دوسرے دن رات کا کھانا ہم اس کے ساتھ
 کھائیں گے۔ زبردستی کی بات تھی ہم لوگ تو یہ فیصلہ بھی نہیں کر پائے تھے کہ دوسری رات

ہمیں دہلی میٹر رکنا ہے یا نہیں۔ خیال یہی تھا کہ یہاں کچھ وقت گزار کر ذرا معلومات حاصل کی جائیں گی اور اس کے بعد ہم راجپوتانہ کی طرف چل پڑیں گے۔

”میں نہیں جانتی۔ بس یوں سمجھ لو، میری چھٹی حس نے مجھے خبردار کیا تھا۔ اور میں نے ان کی طرف دیکھا تھا۔ وہ ہماری طرف دیکھ کر کچھ گفتگو کر رہے تھے میں تم سے پہلے بھی پہنچی ہوں کہ دن میں جب ہم لوگ یہاں چہل قدمی کر رہے تھے تو بہت سی نگاہیں ہماری طرف اٹھی تھیں۔ لیکن ان نگاہوں کا مفہوم کچھ اور تھا۔ جبکہ اس جوڑے کی نگاہوں میں، میں نے کچھ مختلف کیفیت دیکھی ہے۔“

”سب ہم اپنے کمرے میں پہنچے تو میں نے پدما کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔“ پدما بات کچھ سمجھ میں نہیں آئی۔“

”محسوس مت کرنا منصور! دراصل نجانے کیوں مجھے ان لوگوں کی آنکھوں میں کچھ شبہات محسوس ہوئے تھے اور تم جانتے ہو کہ اس وقت میں زمانے سے ڈری ہوئی ہوں میں نہیں چاہتی تھی کہ ہم انہیں اپنی اصلیت بتا دیں اور پھر زبانی طور پر یہ جملے کہنے میں اتنا بوجھ بوجھ بھی نہیں ہے۔“

رات کا کھانا ہم نے کمرے میں ہی منگوا لیا تھا اور اس کے بعد ہم آرام کرنے لیٹ گئے۔ پدما مجھ سے کچھ فاصلے پر لیٹی خاموشی سے چھت کو گھور رہی تھی۔ نجانے کیوں میرے ذہن میں سنسنائیں پیدا ہونے لگیں۔ کافی دیر اسی طرح خاموشی سے گزر گئی پھر پدما نے مجھے پکارا۔

”تعب ہے۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”کیوں؟“

”نیند آرہی ہے؟“

”نہیں کوئی خاص نہیں۔“

”تو پھر خاموش کیوں ہو؟“

”یہ بھی کوئی خاص بات نہیں۔“

”چلو عام ہی سہی بتا تو دو؟“

”نہیں پدما۔ ظاہر ہے مختلف خیالات ذہن میں آتے رہتے ہیں۔ ان میں عموماً بے پرواہی ہوتے ہیں میں اس وقت کوئی خاص بات نہیں سوچ رہا لیکن تم بھی تو سوچ میں کوئی بات نہیں۔“

”ہاں۔ میں تو بس وہی سب سوچ رہی تھی جو آج تک سوچتی رہی ہوں۔“

”ہاں میں جانتا ہوں تمہارے ذہن میں نجانے کیا کیا خیالات آتے ہوں گے۔“

”نیند آرہی ہے تو پھر کیوں نہ چائے منگوا کر پی جائے؟“

”اگر تم ضرورت محسوس کر رہی ہو؟“

”نہیں۔ بس بیٹھیں گے کچھ باتیں کریں گے۔“ پدما نے کہا۔

”میں نے کوئی کارروائی بھی نہیں کی تھی کہ دروازے پر دستک ہوئی نجانے کون آیا؟ میں نے دروازہ کھولا تو بہترین لباس میں ملبوس ایک شخص ایک ویٹر کے ساتھ کھڑا تھا۔ وہ ویٹر تھا جو ہمارے کمرے میں سروس کر رہا تھا۔ دوسرے شخص نے دونوں ہاتھ جوڑ کر

اس لئے کہ تم ہندوستانی خاتون ہو اور ہندوستانی لڑکیوں کے بارے میں، میں نے یہ سنا ہے کہ وہ جسے ایک بار دل سے اپنا پتی مان لیتی ہیں، ساری زندگی اس کا پیچھا نہیں چھوڑتیں۔“

پدما ہنسنے لگی۔ ”تم اطمینان رکھو منصور میرے اور تمہارے درمیان تو بہت بڑی خلیج حائل ہے۔ مذہب کی خلیج..... اور پھر ویسے بھی نہ تم اتنی بڑی طبیعت کے مالک ہو اور نہ میں۔ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں تم جب چاہو گے میں تمہارا پیچھا چھوڑ دوں گی۔“

میں نے گہری نگاہوں سے اسے دیکھا۔ ”اور اگر میں نہ چاہوں تو؟“ میں نے سوال کیا۔ مجھے محسوس ہوا کہ راعمیس میری کھوپڑی پر ہاتھ پھیر رہا ہے۔ میں نے اُس کا ہاتھ جھٹک دیا تھا۔

”یہ سب بعد کی باتیں ہیں پہلے تو ہمیں اپنی منزل تلاش کرنی ہے، جس کا تم نے مجھ سے وعدہ کیا ہے۔“

پدما نے کہا اور ایک لمحے میں، میں نے محسوس کر لیا کہ اب اس کی ذہنی کیفیت کافی بدل چکی ہے وہ میری... طرف مائل نظر آتی تھی چند لمحے ہم دونوں خاموشی سے کچھ سوچتے رہے پھر میں نے کہا۔

”تمہارا کیا خیال ہے پدما۔ یہ شک کس قسم کا ہو سکتا ہے۔“

ہمیں پر نام کیا۔

”معاف کیجئے گا! مجھے آپ کے آرام میں مداخلت کا حق تو نہیں پہنچتا لیکن میں نے آپ کو بے حد شکر یہ میجر۔ ایک بار پھر ہم اس عنایت کے لئے شکر گزار ہیں۔“

باتیں کرنی ہیں آپ سے۔ اس ویٹر کو اپنی تصدیق کے لئے ساتھ لے آیا تھا۔

”آئیے میجر صاحب۔ ویٹر تم ہمارے لئے چائے بھجوا دو۔“

اُسے دروازے تک چھوڑنے آئے۔

”بہت بہتر جناب۔“ ویٹر نے گردن خم کی اور واپس چلا گیا میجر اندر آ گیا اس کو دیکھا جس نے اب سلیپنگ گاؤن پہن لیا تھا۔

”میں آپ لوگوں کی توجہ اس شخص کی جانب مبذول کرانا چاہتا ہوں، جس کا نام اس کی اس ملاقات میں کوئی گہرائی پوشیدہ ہو۔“

سنگھ ہے اور جس نے اپنی ساتھی عورت کے ساتھ آپ سے ملاقات کی تھی۔“

”ساتھی عورت۔ اس نے اس کا نام کرن کور بتایا تھا اور اسے اپنی بیوی کہا تھا۔“ نہیں رکھتیں؟

”ایک بات میں آپ سے عرض کر دوں کرن کور سب کچھ ہو سکتی ہے اس کی بیوی۔“ بالکل نہیں منصور۔ یہ بہتر ہے کہ جس قدر جلد ممکن ہو سکے ہم یہاں سے نکل

ہے۔ یہ بات آپ جہاں سے چاہیں تصدیق کر لیں۔ وہ ایک ٹرانسپورٹر ہے۔ لیکن اجائیل۔ نجانے کیوں میں ذہنی طور پر ایک خلش سی محسوس کرنے لگی ہوں۔ ایسا لگ رہا ہے

کاروبار درحقیقت کچھ اور ہے۔ پولیس کے پاس ممکن ہے اس کے سلسلے میں کوئی ٹیویس دست سنگھ..... وہ ایک دم خاموش ہو گئی۔

لیکن پولیس نے اسے آج تک گرفتار نہیں کیا۔ وہ مختلف جرائم میں ملوث ہے غیر ملکیوں میں نے بھی کچھ نہیں کہا تھا۔

دوستی بڑھاتا ہے اور پھر انہیں اپنے جال میں پھانس لیتا ہے۔ ہر چند کہ آپ مقامی لوگوں کو لا کر دیئے اور بتایا کہ بارہ بج کر بیس منٹ پر ٹرین روانہ ہوگی۔ تمام انتظامات مکمل کر

معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن چونکہ باہر سے آئے ہیں اس لئے میں نے اپنا فرض سمجھا کہ آپ کو بتا دے۔

صورت حال بتاؤں۔“

”شکریہ! مسٹر میجر آپ نے ہم پر احسان کیا ہے۔“

میں نے جواب دیا۔ ”ہم جے پور جانا چاہتے تھے اور اس سلسلے میں ہماری ضرورت تھی۔“

پوری نہیں ہو سکی تھیں۔ چنانچہ ہم نے یہاں دہلی میں قیام کیا ہے آپ براہ کرم کل دہلی کے لئے روانہ ہو جائیں۔

کسی وقت ہمارے جے پور جانے کا بندوبست کر دیجئے۔“

میں نے پدما سے مشورہ کئے بغیر پروگرام بنا لیا۔ ہو سکتا ہے، دست سنگھ کے ساتھ ساتھ اس کے علاوہ بھی بہت سے افراد تھے۔ ہمیں ہر شکل پر شبہ سا ہوتا کہ

ہمارے لئے کوئی ایسی ہی بات ہو اور میں کسی بھی قسم کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔ لیکن میں نے اس سے کسی طرح کی گفتگو مناسب نہیں سمجھی تھی۔ اس کم بخت کا

وقت تک خطرات کوٹالتے رہنا زیادہ بہتر تھا جب تک صورتحال ناگزیر نہ ہو جائے۔

میجر نے گردن خم کرتے ہوئے کہا۔ ”آپ کی خواہش کی تکمیل ہو جائے گی۔“

میں نے اسے دیکھ کر مسکراتی نگاہوں سے مجھ کو دیکھنے لگی۔

”ابھی تک تمہارے ذہن پر وسنت سنگھ ہی سوار ہے؟“

”ہاں تم نے اپنی ذمہ داری مجھ پر جو چھوڑ دی ہے۔“ میں نے کہا اور وہ لگا انداز میں مجھے دیکھنے لگی پھر اُس نے آہستہ سے آنکھیں بند کر لیں۔

☆.....☆.....☆

جے پور ریلوے اسٹیشن پر اُترنے کے بعد ہوٹل چل دیئے شہر بڑا شاندار تھا۔ ماہر وہی سب کچھ تھا جس کی توقع کی جاسکتی ہے۔ ہوٹل میں مقامی اور غیر مقامی لوگ تھے۔ یہاں ہم اپنے کمرے میں بند ہو کر رہ گئے۔ اب فیصلہ یہ کرنا تھا کہ یہاں چاند نگر کی جانب روانہ ہوا جائے یا کنڈوالا کی طرف جہاں کے قصبے تنوریا میں پرورش پائی تھی اور جہاں سے ہمیں گوپال کے بارے میں معلومات حاصل ہو سکتی۔ پدما نے پہلے چاند نگر چلنے کا مشورہ دیا، جہاں لاج پال کا خاندان آباد تھا۔ ہو سکتا ایسی باتیں انہیں معلوم ہوں جو ہمارے لئے بہتر ثابت ہوں۔

دوسرے دن صبح تیار ہونے کے بعد میں پدما کے ساتھ باہر نکلا ہی تھا کہ ہمارے سامنے کی جانب اٹھ گئی۔ دل دھک سے رہ گیا۔ یہ قابل یقین بات نہیں تھی لیکن آگے جھٹلایا بھی نہیں جاسکتا تھا۔ ہمارے سامنے کچھ فاصلے پر وسنت سنگھ اپنی نام نہاد بیوی کے ساتھ موجود تھا۔ دونوں اس طرح آرہے تھے کہ اگر ہم ان کے سامنے سے چاہتے تو یہ ممکن نہ ہوتا۔ لیکن ان کا انداز ایسا تھا، جیسے انہیں ہمارے بارے میں ہو۔ ان کا اچانک یہاں پہنچ جانا قابل حیرت تھا۔ لیکن اب جو سامنے تھا وہ جھٹلایا جاسکتا تھا۔ پھر وہی ہوا، یعنی ان دونوں نے ہمیں دیکھ لیا اور ٹھٹھک کر رہ گئے۔ وسنت منہ حیرت سے پھیل گیا۔ اس نے پہلے اپنی بیوی کی طرف دیکھا اور پھر ہماری طرف۔

”بھائی جی! ذرا یہ کرپان تو میرے پیٹ میں چھو دو تا کہ مجھے اپنی آنکھوں سے جائے یا پھر بڑے آرام سے یہ کہہ دو کہ تم وہ نہیں ہو جس کی ہمیں تلاش تھی۔“

”تمہارا یہاں پہنچ جانا بھی تو اتنا ہی حیرت انگیز ہے وسنت سنگھ! تمہیں دلی چاہئے تھا۔“ میں نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

”بھائی جی! ہم ذرا دوسرے قسم کے آدمی ہیں۔ جو بات دل میں ٹھان لیتے ہیں اس کے چھوڑتے ہیں۔ تم لوگ ہوٹل چھوڑ کر چل پڑے ہمیں بتائے بغیر۔ کسی کی دعوت

نہرائی جاسکتی ہے یہ تجربہ ہمیں پہلی بار ہوا تھا۔ مگر کرن کور جانتی ہے کہ مہا گرو کی مدد سے وسنت سنگھ ہر اُس جگہ پہنچ جاتا ہے جہاں اُسے پہنچنا ہوتا ہے۔ دیکھ لو! ہم تمہیں تلاش کرتے ہوئے آہی گئے۔ اب کیا خیال ہے؟ کیسے نکلو گے ہمارے چنگل سے؟“

”عجب کی بات ہے وسنت سنگھ! تم تو واقعی الہ دین کے چراغ کے مالک معلوم ہوتے ہو۔“

”ہاں جی..... بالکل ٹھیک کہا آپ نے۔ لیکن ہم الہ دین نہیں وسنت سنگھ ہیں۔ اب تو آپ ہمارے چراغ کی بات کریں۔ یہ بتائیں چلے کہاں؟“

”کہیں نہیں۔ جے پور آ گئے تھے۔ اچانک ہی پروگرام بنا تھا۔ اور سوچا کہ وسنت سنگھ سے تو اب دوبارہ زندگی میں ملنا نہیں۔ کون معذرت کرے؟ میری بیوی جے پور آنا چاہتی تھی۔ چنانچہ فوری فیصلے کے تحت ہم یہاں آ گئے۔“

”ٹھیک ہے جی۔ اب اپنے کمرے میں چائے بھی مت پلاؤ ہمیں۔ وسنت سنگھ اتنا ہی اتنا ہی برا آدمی ہے۔“

میں اُن دونوں کو لے کر اپنے کمرے میں آ گیا اور انہیں چائے کی پیشکش کی۔

”مگر بھائی جی! تم نے کم از کم ہمیں اطلاع تو دے دی ہوتی کہ جا رہے ہیں۔ بڑے اہتمام سے پہنچے تھے تمہارے پاس کہ تمہیں ساتھ لے آئیں گے۔ مگر پتہ چلا کہ تم تو دن ہی میں وہاں سے چل پڑے ہو۔ بس! یہ تو تمہاری محبت ہی تھی کہ ہم تمہاری خوشبو سونگھتے ہوئے یہاں پہنچ گئے۔“

”تم ہوا میں اڑ کر آئے ہو گے وسنت سنگھ!“

”بالکل ٹھیک جی..... بالکل ٹھیک..... میں ریل کے سفر کا قائل نہیں ہوں۔ بس! کچھ ذرائع ہیں میرے پاس۔ مگر دیکھو! کیسا پکڑا تمہیں۔ اب اگر تم چاہو تو خاموشی سے یہاں سے بھی فرار ہو جاؤ۔ وسنت سنگھ وہیں نہ پہنچ جائے، جہاں تم جاؤ تو اُس کا نام بھی وسنت سنگھ نہیں۔“

میں ہنسنے لگا تھا۔ درحقیقت اُس شخص سے مجھے کوفت محسوس ہو رہی تھی۔ عجیب چپکوا آدمی تھا۔ جان کو لگا تھا تو چھوڑنے کا نام ہی نہ لیتا تھا۔ لیکن میں یہ بات ماننے کے لئے قطعی تیار نہیں تھا کہ اُسے میرے جے پور آنے کی خبر نہیں ہے۔ یا تو اُس کا ذریعہ مینجر ہی بنا تھا، یا ہو

میں خود کسی ایسے آدمی کو چاہتی ہوں جو ہماری طرف متوجہ ہو۔ میرا خیال ہے منصور! اسے اچھی طرح دیکھ لیا جائے۔ ہم تیاریاں کر کے چلیں گے اور اگر کوئی ایسی ویسی بات بولی تو پھر.....“

”ٹھیک ہے۔ تم اطمینان رکھو۔“ میں نے جواب دیا اور ذہن میں راعمیس کو پکارا۔
 ”میں تیرے ساتھ ہوں میری جان! جو کچھ تو سوچ رہا ہے، بالکل ٹھیک ہے۔“ اُس نے جواب دیا۔ اُس وقت پدما کی موجودگی میں، میں یہ سوال نہیں کر سکتا تھا کہ یہ وسنت سنگھ کیا چیز ہے؟ اب دل میں اس بات کی شدت سے خواہش تھی کہ پدما سے تھوڑی سی علیحدگی ہو تو میں راعمیس سے اس سلسلے میں مکمل طور پر گفتگو کروں۔ اس کا طریقہ زیادہ مشکل نہیں تھا۔ میں نے پدما سے کہا کہ میں تھوڑی دیر کے لئے نیچے جا رہا ہوں۔ جلد واپس آ جاؤں گا۔ چاندنگر کے سلسلے میں اگر ہو۔ کا تو کچھ معلومات حاصل کرتا ہوں۔ اُس نے اس بات پر کوئی اعتراض نہیں کیا تھا۔ نیچے آ کر میں نے راعمیس کو پکارا۔ وہ میرے پکارنے کا مطلب سمجھتا تھا۔ کہنے لگا.....

”وسنت سنگھ ایک پراسرار شخصیت کا مالک ہے۔ وہ ٹرین میں ہی تمہارا تعاقب کرتے ہوئے یہاں پہنچا ہے۔ یہاں اس کی رہائش گاہ موجود ہے۔ ایک قدیم حویلی کی شکل میں جو سرخ پتھروں سے بنی ہے۔ یہ حویلی وسنت سنگھ کی ہے یا کسی اور کی یہ بات میں نہیں جانتا۔ لیکن اس حویلی کے بہت بڑے ڈرائنگ روم میں ایک تصویر لٹکی ہوئی ہے۔ قد آدم تصویر..... جو درحقیقت پدما کی ہے۔ اگر کوئی اس کا جائزہ لے تو کسی طور یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ تصویر پدما کی ہے۔ سوائے اُس لباس کے جو پدما کا نہیں ہوتا۔ یہ لباس مقامی عورتوں کا ہے۔ وہ عورتیں جو بڑے گھروں سے تعلق رکھتی ہیں اور یقیناً اس تصویر کی وہاں موجودگی کوئی معنی رکھتی ہے۔ اب یہ کام صرف تمہارا ہے کہ وسنت سنگھ سے اس تصویر کے بارے میں معلومات حاصل کرو۔ جہاں تک اُس کا تعلق ہے وہ یہ تصویر تمہیں دکھانا چاہتا ہے تاکہ اس سے کوئی فائدہ اٹھا سکے۔ اُس کی گہرائی میں کیا ہے؟ یہ نہیں کہا جاسکتا۔ ہو سکتا ہے اس تصویر کا تعلق کسی طور پدما سے ہو۔ لیکن اب یہ تمہارا کام ہے کہ اپنے آپ کو چھپاؤ۔ ہو سکتا ہے وسنت سنگھ یہ تصویر دکھا کر تم لوگوں کا راز معلوم کرنا چاہتا ہو۔ ایسے حالات میں اگر تم نے اپنا راز کھول دیا تو وہ تمہارے لئے نقصان کا باعث بھی بن سکتا ہے۔ زیادہ سے

سکتا ہے کہ وسنت سنگھ کے اپنے ذرائع ہوں اور اُس نے ہم پر کڑی نگاہ رکھی ہو۔ اور بروقت ہی یہ اطلاع دے دی گئی ہو کہ ہم بذریعہ ٹرین جے پور کا سفر کر رہے ہیں اور وقت ہمارے ساتھ چل پڑا ہو۔ یہاں اس ہوٹل میں پہنچ جانا بھی معمولی بات تو نہیں تھی۔ ساری باتیں ذہن میں آرہی تھیں۔ لیکن ظاہر ہے کچھ کہا بھی نہیں جاسکتا تھا۔ وسنت سنگھ سنجیدگی سے کہنے لگا۔

”ہمارا ٹرانسپورٹ کا کاروبار ہے بھائی جی! اور ہندوستان کے مختلف صوبوں پر ہمارے ٹرک آتے جاتے رہتے ہیں۔ یہاں جے پور میں بھی میرے چھ ٹرک آتے ہیں۔ دن اور رات کا سفر ہے اُن کا۔ یہاں بھی ہم نے اپنے لئے ٹھکانہ بنا رکھا ہے۔ اور بھیار دیکھو، ایک بار ہماری دعوت ضرور قبول کرلو۔ بعد میں چاہے جیون بھر مت ملنا۔ مگر وسنت سنگھ کے دل میں یہ خلش نہیں رہنی چاہئے کہ اُس نے کسی کو مہمان بنانے کی کوشش کی اور اُس نے اُسے ٹھکرا دیا۔“

”ہم سات بجے آئیں گے۔“ میں نے کچھ سوچتے ہوئے جواب دیا۔
 ”ٹھیک ہے۔“ پدما نے بھی پرسکون انداز میں آنکھیں بند کر کے گردن ہلائی۔
 جب وہ دونوں چلے گئے تو پدما پھر مجھ سے مخاطب ہوئی۔ ”یہ سب اتفاق نہیں منصور! بلکہ سوچی سمجھی سکیم ہے۔ لیکن تم نے کچھ اور بھی تو کہا تھا۔“
 ”کیا.....؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔

”تم نے کہا تھا کہ کرنل جیمز نے کچھ ایسے لوگوں کو ہماری نگرانی کے لئے مقرر کیا ہے سادھوؤں کے بھیس میں ہوں گے اور ہرے کرشنا ہرے راما تحریک کے رکن ہوں گے ہمیں تو ابھی تک کوئی نظر نہیں آیا۔“
 ”پتہ نہیں! یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ ویسے یہ خطرناک آدمی ہے۔ یہ بات میں دعوے نہ کہتا ہوں۔“

”پھر کیا خیال ہے؟ کیا یہاں سے بھی فرار ہونے کی کوشش کی جائے؟ اگر ممکن ہو تو اب ہم چاندنگر جا کر ہی پناہ لیں۔“

”نہیں..... میرا خیال ہے اُس سے دو دو ہاتھ ہو جانے چاہئیں۔“
 ”میں نے بھی اسی لئے وعدہ کیا ہے، دیکھیں تو سہی۔ میں نے تو پہلے بھی تم سے

زیادہ تم اس تصویر کو دیکھ کر حیرت کا اظہار کرو۔ اس سلسلے میں پدما کو سنبھالنا تمہارا کام ہے۔ اُسے بتانا کہ وہ تصویر دیکھ کر صرف حیرت کا اظہار کرے۔ کوئی تعلق ظاہر نہ کرے۔“

”یہ کوئی خاص معلومات تو نہ ہونیں۔“ میں نے کہا۔

”میں تمہارے ساتھ رہوں گا اور موقع پر جو بھی بہتر صورت حال بن سکی، تمہیں سے آگاہ کر دوں گا۔“

میں واپس آ گیا۔ پدما اپنے کاموں میں مصروف تھی۔ اُس نے مجھ سے کچھ بھی نہ پوچھا تھا۔

شام چھ بجے کے قریب پدما نے کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی میں وقت دیکھا اور پھر ”تیار ہو جائیں۔ کیونکہ وقت ہونے والا ہے۔ وہ پہنچنے ہی والا ہو گا۔“

”ہاں.....“ میں نے جواب دیا۔

پدما نے ایک انتہائی حسین ساڑھی زیب تن کی۔ جس سے وہ بلاشبہ کوئی ہندوستانی کمراری ہی معلوم ہو رہی تھی۔ وقت مقررہ پر سنت سنگھ، کرن کور کے ساتھ پہنچ گیا۔

”آپ لوگ تیار ہیں؟“ وہ آتے ہی چبکا۔

”ہاں سنت جی! یہ انوکھی اور بڑی دلچسپ دعوت ہے کیونکہ زبردستی کی جا رہی ہے۔ سنت سنگھ نے ایک بلند قبہ لگایا۔“ ہاں! بعض دعوتیں ایسی بھی ہوتی ہیں۔“

میں پدما کو ساتھ لئے باہر نکل آیا۔ نیچے ایک خوبصورت کار کھڑی تھی۔ کار کا سفر طویل ثابت نہیں ہوا تھا۔ کچھ ہی دیر بعد ہم سرخ پتھروں سے بنی ہوئی اُس حویلی میں داخل ہو رہے تھے جس کا تذکرہ راعمیس مجھ سے کر چکا تھا۔ ہم نے اُس حویلی کی کافی تعریف کی۔

سنت سنگھ ہنس کر کہنے لگا۔ ”تم نے تو یہ سوچا ہو گا سند رلال جی! کہ سنت سنگھ بس یہی افنگ سا آدمی ہے۔ مگر کوئی بات نہیں۔ سنت سنگھ کی دوستی کتنی فائدہ مند رہتی ہے، جانتے ہیں جو اس کے دوست ہیں۔“ وہ ہمیں لئے ہوئے عظیم الشان ڈرائنگ روم داخل ہوا جس کا ایک حصہ مکمل تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ روشنیوں کا انتظام کچھ اس طرح کیا تھا کہ ڈرائنگ روم کے مختلف حصے تاریکی میں رہیں۔ جہاں ہم لوگوں کو بٹھایا گیا وہاں مکمل روشنی تھی۔ ہمارے سامنے چائے اور خشک میوے لاکر رکھ دیئے گئے اور

ابتدائی خاطر مدارت شروع ہو گئی۔ میں وسنت سنگھ سے مختلف باتیں کرتا رہا۔ میری نگاہیں بہت ہی احتیاط کے ساتھ ڈرائنگ روم کا جائزہ لے رہی تھیں۔ میں اُس تصویر کے بارے میں اندازہ لگانا چاہتا تھا جس کی نشاندہی راعمیس نے کی تھی۔ کافی دیر تک میں وسنت سنگھ سے باتیں کرتا رہا۔ پھر وہ بولا۔ ”میں تم لوگوں کو ایک ایسی چیز دکھانا چاہتا ہوں جسے دیکھ کر واقعی تمہیں حیرت ہوگی۔“

”ہاں ہاں..... ضرور۔ کیا ہے وہ؟“

”ایک منٹ.....“ وسنت سنگھ اپنی جگہ سے اٹھا۔ کرن کور بھی اُس کے ساتھ آگے بڑھ گئی تھی۔ تب میں نے سرگوشی کے انداز میں پدما سے کہا۔ ”پدما! جو چیز یہ شخص دکھانا چاہتا ہے، میں دیکھ چکا ہوں۔ شاید تم نے اس کا اندازہ نہ لگایا ہو۔ لیکن میری تیز آنکھیں اُس چیز کو دیکھ چکی ہیں۔ ایک تصویر جو ہو بہو تمہاری ہے۔ اس سلسلے میں ہم تنہائی میں بات کریں گے۔ میں تمہیں ایک وارننگ دینا چاہتا ہوں جس پر تمہیں پوری توجہ سے کام کرنا ہے۔“

”کیا؟“ اُس نے حیرت سے پوچھا۔

”وہ تصویر سو فیصدی تمہاری ہے۔ تم اُسے دیکھ کر حیرت کا اظہار ضرور کرو گی۔ لیکن کسی قسم کا اضطراب یا کوئی ایسی کارروائی نہیں کرو گی جس سے وسنت سنگھ کو یہ احساس ہو کہ تم اس تصویر سے کوئی وابستگی رکھتی ہو۔“

”اوہ..... اوہ.....“

”وہ واپس آ رہا ہے۔ خیال رکھنا۔“ میں نے اُس کا ہاتھ دباتے ہوئے کہا اور وہ گہری سانس لینے لگی۔ اب دیکھنا یہ تھا کہ وہ اپنے آپ پر قابو کس طرح پاتی ہے؟ وسنت سنگھ نے تیز روشنی کر دی اور پورا ڈرائنگ روم جگمگانے لگا۔ ہم حیرت و دلچسپی کا اظہار کر رہے تھے۔

سنت سنگھ نے آہستہ سے کہا۔ ”دوستو! میرے ساتھ آؤ۔“

پدما اور میں اٹھ گئے۔ وسنت سنگھ نے کرن کور کو وہیں تصویر کے قریب چھوڑ دیا تھا۔ پھر اُس نے اُس کی طرف اشارہ کیا اور ہم دونوں وہ تصویر دیکھنے لگے۔ وسنت سنگھ کی نگاہیں ہمارے چہرے کا جائزہ لے رہی تھیں۔ وہ تصویر ہو بہو پدما کی تھی۔ میں نے حیرت و دلچسپی کا اظہار کیا۔ پدما نے بھی کمال کی اداکاری کی تھی۔ اُس کے ہونٹوں پر پرتجسس مسکراہٹ

تھی۔ اور وہ دلچسپی کی نگاہوں سے تصویر کو دیکھ رہی تھی۔ میں نے وسنت سنگھ سے کہا۔
”وسنت سنگھ! کمال ہے۔ یہ تو شیتل کی تصویر ہے۔“

”ہاں..... شیتل دیوی ہمارے پاس بہت پہلے سے موجود ہے۔“ وسنت سنگھ نے بڑے ہوئے کہا۔

”تم انہیں کہاں سے چرالائے؟ یوں لگتا ہے شیتل دیوی کا یہ دوسرا جنم ہو۔ اور پہلے سے تمہارا اُن سے کوئی تعلق ہو۔“

وسنت سنگھ نے قہقہہ لگایا اور آہستہ سے بولا۔ ”ویسے سچ بتانا سندر لال جی! شیتل جی دیکھ کر کوئی یہ کہہ سکتا ہے کہ وہ اس تصویر میں نہیں ہیں؟“

”نہیں وسنت سنگھ! تم نے واقعی ہمیں حیران کر دیا ہے۔ شیتل کی یہ تصویر تو کافی پرانا معلوم ہوتی ہے۔ کیا یہ حقیقت ہے کہ وہ کبھی یہاں آ چکی ہے؟ کم از کم اس جنم میں تو یہ ممکن نہیں۔ ہاں..... پہلے جنم کی بات اور ہے۔ کیا تم بتا سکتے ہو کہ یہ شیتل کا پہلا جنم ہے؟“ میر نے پوچھا۔

اُس نے ایک گہری سانس لی اور بولا۔ ”نہیں..... لیکن اس سے تمہیں یہ اندازہ ضرور ہو گیا ہو گا کہ میری تم سے دلچسپی بے لوث نہیں تھی۔“

”کمال ہے..... واقعی کمال ہے۔ تصویر کافی پرانی معلوم ہوتی ہے اور ہم اس سے پرانا یہاں نہیں آئے۔“

”بالکل ٹھیک۔ تصویر کافی پرانی ہے۔ اس کے رنگوں سے تم اندازہ لگا سکتے ہو۔ لیکن قدیم بھی نہیں ہے کہ تم اسے سو سال پرانی کہہ سکو۔ تمہیں یہ سن کر تعجب ہو گا کہ یہ تصویر کمال کے لئے بڑی اہمیت کی حامل ہے۔“

”شیتل کو اگر یہ لباس پہنا دیا جائے تو کیا وہ اس تصویر کی طرح نہیں ہو جائے گی؟“

”ہاں! میرا بھی یہی اندازہ ہے۔“

”اور میں تم سے کہہ چکا ہوں کہ کوئی اس میں بہت دلچسپی لے رہا ہے۔ آؤ..... خیال ہے بیٹھ کر باتیں کریں گے۔“ وسنت سنگھ، کرن کور کے ساتھ واپس آ گیا اور ہم بیٹھنے پر بیٹھ گئے۔

دوں کو ذرا بھی متوقع نہیں دیا۔ اُس کی نگاہیں اب بھی پدما کا اور میرا جائزہ لے رہی تھیں۔ میں نے شدید حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

”اب اس راز پر سے پردہ اٹھا بھی دو وسنت سنگھ! یہ بات تو ثابت ہو گئی بلکہ تم نے خود اس کا اعتراف کر لیا کہ تم بلا وجہ ہماری طرف متوجہ نہیں ہوئے اور وہ کون شخص ہے جو اس تصویر میں دلچسپی لے رہا ہے؟“

”یہ ایک لمبی کہانی ہے ڈیر سندر لال! میں تمہیں مختصر الفاظ میں ایک بات بتانا چاہتا ہوں لیکن اس سے پہلے کچھ سوالات بھی ضروری ہیں۔“

”ضرور..... ضرور.....“ میں نے جواب دیا۔

”بڑی بری بات ہے۔ لیکن بعض بری باتیں جان بوجھ کر کرنا ہوتی ہیں۔ اشوکا جیسے ہوٹل میں قیام کرنے والے مالی طور پر کمزور تو نہیں ہوتے۔ لیکن میں پھر بھی یہ جاننا چاہتا ہوں کہ تمہارے مالی حالات کیسے ہیں؟“

”بہت اچھے نہیں۔ لیکن اطمینان بخش.....“ میں نے جواب دیا۔

”اگر تمہیں مزید اطمینان حاصل ہو جائے تو کیا حرج ہے؟“ وہ پراسرار انداز میں مسکراتا ہوا بولا۔

”مطلب.....؟“ میں نے پوچھا۔

”تھوڑا سا کام۔ اور اس کے عوض لاکھوں روپے۔ کیا تم پسند کرو گے؟“

”کام کی نوعیت معلوم ہو جائے تو جواب دیا جاسکتا ہے۔ تم اس سے انکار نہیں کرو گے وسنت سنگھ! کہ ایک ایسا جوڑا جو ایک دوسرے سے پوری طرح مطمئن ہو اور اپنے طور پر ایک بہتر زندگی گزار رہا ہو، کسی خطرے میں پڑنا پسند نہیں کرے گا۔ میرے اپنے جو وسائل تیر انہی کے تحت میں اپنی دھرم پتی کو خوش رکھنا چاہتا ہوں۔ لیکن اگر تمہارا کوئی کام بن جائے اور مجھے کچھ مل جائے تو میں اُسے برا بھی نہیں سمجھتا۔ بشرطیکہ اس میں کوئی خطرہ نہ ہو۔“

”خطرہ؟“ وسنت سنگھ پر جوش انداز میں بولا۔ ”تم وسنت سنگھ کو نہیں جانتے سندر لال! میرے ہاتھ بہت لمبے ہیں۔ اتنے لمبے کہ اُن کی لمبائی کا تمہیں اندازہ ہو جائے تو تم اس سے دو تہی پر ناز کرو گے میری جان! ایک ایسی پارٹی میرے چنگل میں ہے جو شیتل یا اس کی

ہے کہ یہ صرف اتفاق ہے۔ تو پھر کیوں نہ ہم اس اتفاق سے فائدہ اٹھائیں۔ سند رلال جی! میں تم سے ایک بات کا وعدہ کرتا ہوں، انہیں اُن کے حوالے کر دیں گے لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہی ہم اس بات کا بھی پورا پورا خیال رکھیں گے کہ کوئی نقصان نہ پہنچنے پائے۔ ان سے ہمارا بہترین ذریعوں سے رابطہ رہے گا اور اگر اُن لوگوں کے قبضے میں پہنچنے کے بعد شیتل جی کو کوئی خطرہ محسوس ہوا تو فوراً اور اگر نہ ہوا تو کچھ دن کے بعد شیتل جی کو وہاں سے واپس حاصل کر لیا جائے گا۔ اس دوران ہم رقم وصول کر چکے ہوں گے اور پھر اُس رقم کا آدھا آدھا ہم لوگ آپس میں تقسیم کریں گے۔ کیوں شیتل؟ تمہارا کیا فیصلہ ہے؟“ اُس نے شیتل سے پوچھا۔

”اگر میرے لئے خطرہ مول لے کر یہ رقم حاصل کرنا ہی ہے تو تم لوگ جانو۔ میں اس معاملے میں خود کوئی مداخلت نہیں کر سکتی۔ بس! میری زندگی کو کوئی خطرہ پیش نہیں آنا چاہئے۔ اور اگر سند رکو میرے ذریعے اتنی بڑی رقم حاصل ہو سکتی ہے تو میں اس سے انکار بھی نہیں کروں گی۔“ شیتل نے کہا۔

”نہیں شیتل جی! آپ کی زندگی کے لئے کوئی خطرہ مول لے کر تو ہم دس کروڑ بھی پسند نہیں کریں گے۔ میں سچے دل سے آپ سے یہ بات کہہ رہا ہوں کہ مجھے آپ سے کوئی دشمنی نہیں ہے۔ جو کچھ ہم کر رہے ہیں اس میں ایک مفاد ضرور ہے۔ مگر ایسے نہیں کہ اس مفاد پر آپ کو بھینٹ چڑھا دیا جائے۔ جہاں تک آپ کی کسی تکلیف کا معاملہ ہے تو آپ اس کی ذمہ داری مجھ پر چھوڑ دیجئے۔ ایک ایک لمحہ آپ کی نگرانی کی جائے گی اور ہم زندگی کی قیمت پر یہ کام کریں گے۔ اگر آپ کو اطمینان ہو تو ٹھیک ہے۔ یہ ایک تجویز تھی جو پیش کر دی گئی۔ اور اگر آپ یہ محسوس کرتی ہیں کہ اس میں زندگی کو خطرہ ہے تو پھر مجبور نہیں کیا جائے گا۔ دولت تو کمائی جا رہی ہے اور کمائی جاتی رہے گی۔ ہم آپ کی زندگی کی قیمت پر کوئی دولت نہیں چاہتے۔“

”مجھے منظور ہے۔“ شیتل نے جواب دیا۔ ویسے ہم دونوں ہی سنسنی محسوس کر رہے تھے۔

میں نے وسنت سنگھ سے پوچھا۔ ”اب جب کہ ہمارے درمیان یہ معاہدہ ہو چکا ہے کہ کام اتنی انداز میں کریں گے جس میں تم چاہتے ہو تو کم از کم یہ تو بتا دو کہ وہ پارٹی کون ہے

ہم شکل کو حاصل کرنا چاہتی ہے۔ ہم اگر ایک پروگرام بنا کر اُس پارٹی کو مطمئن کر دیں تو یقینی طور پر ہمارے قبضے میں اتنی بڑی رقم آجائے گی کہ تم تصور بھی نہیں کر سکتے۔ میں تمہیں دس لاکھ روپے کی پیشکش کرتا ہوں اگر تم میرے ساتھ کام کرنے پر آمادہ ہو جاؤ۔“

”یہ بہت بڑی رقم ہے اور اس کے لئے خطرہ بھی مول لیا جاسکتا ہے۔ لیکن تم بغیر کسی پریشانی کے اس کام کی تفصیل بتا دو۔ ایک بات کا تم سے وعدہ کیا جاسکتا ہے وہ یہ کہ اگر یہ کام ہمیں اتنا ہی خطرناک لگا کہ ہم اُسے کرنے سے گھبرائے تو تمہیں انکار ضرور کر دینا گے۔ لیکن تمہارا یہ راز کبھی ہمارے سینوں سے باہر نہیں جائے گا۔“

”مجھے اطمینان ہے۔ اور میں خود بھی انہی شرائط پر تم سے سودا کرنا چاہتا ہوں۔ جس پارٹی کو اس تصویر کی ہم شکل لڑکی کی ضرورت ہے، وہ بہت بڑی پارٹی ہے اور نیک نام تصور کی جاتی ہے۔ بہت پہلے کی بات ہے کہ مجھ سے اس سلسلے میں اُن کی گفتگو ہوئی تھی اور یہ تصویر اسی وقت میرے حوالے کی گئی تھی۔ میں نے ان سے معلوم کرنے کی کوشش بھی کی کہ انہیں اس کی ضرورت کیوں پیش آگئی ہے تو مجھے اس سلسلے میں کچھ نہیں بتایا گیا۔ بس! یہ کہ گیا کہ میں اگر اُسے تلاش کر کے اُن کے حوالے کر دوں تو وہ اس کے لئے مجھے بہت بڑی رقم پیش کر سکتے ہیں۔ میں نے ابتداء میں بہت کوشش کی لیکن اس میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ مجھے کوئی تفصیل نہیں بتائی گئی تھی۔ پھر میں نے یہ تصور چھوڑ دیا اور اُس دن تم لوگ اتفاق ہی سے مجھے نظر آ گئے تھے۔ میں نے کرن کور سے کہا کہ کیا یہ لڑکی اس تصویر کی ہم شکل نہیں ہے تو کرن کور نے بھی اس کی تصدیق کر دی۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ ہم کسی بھی طرح تم لوگوں کو اُس بات پر مجبور کرنا چاہتے تھے کہ تم ہماری یہ پیشکش قبول کر لو لیکن اگر یہ کام دوستانہ بنیاد پر ہو جائے تو اس سے اچھی اور کوئی بات نہیں ہے۔ میں نے بعد میں یہی فیصلہ کیا کہ خود تمہیں بھی اس راز میں شریک کر لیا جائے۔ لیکن اس کے لئے میرے اور میری بیٹی کے درمیان اور تجویز طے پائی تھی۔ ہم نے یہ سوچا تھا کہ پہلے تمہیں یہ تصویر دکھا دی جائے اور یہ اندازہ لگانے کی کوشش کی جائے کہ کیا شیتل جی وہی لڑکی ہیں جس کی تلاش تھی یا پھر صرف یہ اتفاق ہے؟ اگر شیتل جی وہی ہوتیں تو یقیناً تم لوگ اس تصویر کو دیکھ کر حیران ہوتے۔ ہمارے بارے میں سوچتے۔ لیکن یہ اندازہ با آسانی ہو گیا کہ تم نے اس تصویر کو دیکھ کر حیرت کا اظہار ضرور کیا لیکن اس سے اپنی کوئی شناسائی ظاہر نہیں کی۔ جس کا مطلب

اور شیتل کو کہاں لے جانا ہوگا؟ یہ معلوم ہو جائے تو ہم اپنے طور پر بھی سوچ سمجھ سکیں۔“
 وسنت سنگھ نے کرن کور کی طرف دیکھا اور کرن کور نے آنکھیں بند کر کے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ”ہاں! اب اس میں کوئی حرج تو نہیں۔ ویسے بھی میرا خیال ہے سندر لال نے کسی بھی قیمت پر ہم سے بد عہدی نہیں کریں گے۔“
 ”نہیں اس کا کوئی چانس نہیں ہے۔ تم لوگ اطمینان رکھو۔“ میں نے انہیں دلا سادیے ہوئے کہا۔

”ہمیں ایک قدیم ریاست گنڈاپور جانا ہوگا۔ گنڈاپور کے دیوان ہریش چندر جی نے یہ پیشکش کی ہے۔“
 میں نے اور شیتل نے بیک وقت ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ شیتل گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ ”تعب کی بات ہے۔ مگر جیسا آپ لوگ فیصلہ کریں۔“ وسنت سنگھ ہمیں ہل چھوڑنے آیا۔ میں نے سب سے پہلے راعمیس سے رابطہ قائم کیا اور کہا۔
 ”کہو راعمیس! اس نئے ہنگامے کے بارے میں کیا کہتے ہو؟“

”جاری رکھو۔ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ وسنت سنگھ اس وقت جو کچھ کہہ رہا ہے، اس میں کوئی جھوٹ نہیں ہے۔ اس نے تمہارے سامنے بالکل سچ بولا ہے۔ جہاں تک پدا کی حفاظت کا معاملہ ہے اس کے لئے بھی اطمینان رکھو۔ اس کی ذمہ داری تم مجھ پر چھوڑ دو۔“

”اگر یہ بات ہے تو میں مطمئن ہوں۔“ میں نے جواب دیا۔
 پدما مجھ سے کہنے لگی۔ ”یہ نیا نام سامنے آیا ہے منصور! گنڈاپور۔ میں اس سے پہلے اس نام سے واقف نہیں تھی۔ یہ دیوان ہریش چندر جی کون ہو سکتے ہیں اور انہیں میری ضرورت کیوں پیش آگئی؟“

”یہ تو بعد میں ہی معلوم ہو سکتا ہے۔ لیکن تم یہ خطرہ مول لینے کے لئے تیار ہو؟“
 ”اسے خطرہ نہ کہو منصور! میں اپنی شناخت ہی تو چاہتی ہوں۔ پہنچ جانے دو مجھے گنڈاپور۔ یہ معلوم تو ہو کہ آخر کسی کو میری کیا ضرورت پیش آ سکتی ہے؟ اور اس کی وجہ کیا ہے؟“
 میں پدما کے الفاظ کی گہرائی پر غور کرنے لگا تھا۔

پدما مجھ پر مکمل اعتبار کر چکی تھی۔ ہم دونوں نے ایک دوسرے کو شوہر اور بیوی کی حیثیت سے لوگوں کو متعارف کرایا تھا۔ یہ ایک عارضی ضرورت تو تھی۔ لیکن میں نے بارہا پدما کے چہرے پر ایسے تاثرات دیکھے تھے، جیسے یہ الفاظ سن کر اُسے برا نہ لگتا ہو۔ عورت خواہ کچھ بھی ہو، بعض چیزوں سے بہت متاثر ہوتی ہے۔ پدما بھی اس وقت اپنے آپ کو اس احساس سے باز نہیں رکھ پاتی تھی۔ جب اُس کا تعارف میری بیوی کی حیثیت سے کسی سے ہوتا، اُس کے چہرے پر ایسا حجاب پھیل جاتا جس میں ناگواری کے تاثرات نہیں ہوتے تھے۔ اُس کے چہرے کا گلابی پن اس کیفیت کا مظہر ہوتا تھا کہ وہ ان الفاظ سے لطف اندوز ہو رہی ہے۔

آج بھی پدما پر کچھ ایسی ہی کیفیت طاری تھی۔ وسنت سنگھ سے ملاقات کے بعد اُس کے اندر ایک عجیب سا اضطراب نمودار ہو گیا تھا۔ بہر طور! میں نے ایک گہری سانس لے کر پاؤں پھیلا دیئے تھے۔ راعمیس نے مجھے کہیں کا نہیں چھوڑا تھا۔ مگر غور کرتا تو قصور راعمیس کا نہیں تھا۔ یہ تو سب تقدیر کے کھیل تھے۔ کیسی انوکھی اور دلچسپ بات تھی۔ اب تو اُس کے بارے میں سوچتے ہوئے یا اُس کا تذکرہ کرتے ہوئے بھی عجیب لگتا ہے۔ میرا خیال ہے دنیا میں شاید ہی کوئی مجھ جیسا ہوگا جس نے اپنی مختصر زندگی میں اتنے الٹ پھیر دیکھے ہوں۔ ماضی کو یاد کرتا تو صرف وہ حصہ جب تک میں اپنے وطن میں بے کسی کی زندگی گزار رہا تھا اور خالہ شہادت کے رحم و کرم پر پڑا ہوا تھا۔ مجھے یاد تھا اور اُس کے بعد کی کہانی یاد کرتا تو ساری کہانیاں ایک دوسرے میں گڈمڈ ہو جاتی تھیں۔

پدما لباس تبدیل کر کے آئی تو میری کھوپڑی ہوا میں اڑ گئی..... یہ لباس یقیناً اُس نے جان بوجھ کر پہنا تھا۔ وہ ایسی لڑکی نہیں تھی کہ دلی کیفیات کو لباس کے ذریعے مشتہر کرتی۔ اُس کے لہجے میں بھی کبھی ایسی کیفیت نمودار نہیں ہوتی تھی۔ جانے کہاں کہاں پرورش پائی

تھی اور کیسے کیسے لوگوں کے ساتھ رہی تھی۔ لیکن شخصیت کا وہ حجاب جو مشرق کی دین کے آس کے جوہر میں موجود تھا۔ میں نے اُس کی آنکھوں میں ہلکی سی گلابی کیفیت اور ہونٹوں میں معمولی سی لرزش کے علاوہ کبھی کوئی چمک نہیں دیکھی تھی۔ اس وقت جو لباس اُس نے زیب تن کیا تھا وہ اُسے ہزار گنا زیادہ حسین بنا کر پیش کر رہا تھا۔ اُس کا چہرہ اُس وقت کی ایسی کیفیت کا آئینہ دار نہیں تھا جسے لطیف جذبات سے منسوب کیا جاسکتا۔ اس کے ہونٹوں کے چہرے پر ایک مایوسی سی طاری تھی۔ آنکھوں میں یاسیت جھلک رہی تھی۔ اُس کی کیفیت دیکھ کر میں نے اپنے آپ کو سنبھالا۔ وہ ایک کرسی پر بیٹھ گئی تھی۔ اُس کی آنکھیں غور و فکر میں ڈوبی ہوئی تھیں۔

”اب کیا سوچنے لگیں؟ آرام کرو۔ ہم جو فیصلہ کر چکے ہیں، وہ غلط نہیں ہے۔ کم از کم میں اُس سے پوری طرح مطمئن ہوں۔ ہاں! اگر تمہارے ذہن میں کوئی ایسی بات ہے تو براہ کرم مجھے بتاؤ۔“

”نہیں منصور! میں اس مسئلے پر نہیں سوچ رہی۔ بلکہ میرے ذہن میں کچھ اور ہی خیالات بھٹک رہے ہیں۔“

”مجھے بتانا پسند کرو گی؟“

”تمہیں نہیں بتاؤں گی تو پتہ کیا کروں گی؟ میری زندگی میں اب تمہارے علاوہ اور کون؟“

”پدما! جواب دیا اور میں کھوپڑی پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ یہ الفاظ بڑی اہمیت کے حامل تھے۔ لیکن مجھ سے تو بہت سے لوگوں نے کہے تھے۔ جانے کس کس نے..... جانے کس کس نے مجھ سے کیا کیا امیدیں وابستہ کر رکھی تھیں۔ لیکن اب کوئی میرے نزدیک نہیں تھا۔ پدما بھی چند روز کا کھیل تھی۔ میں جانتا تھا کہ آخر وہ بھی ایک دن فضاؤں میں گم جائے گی اور شاید چند ہی روز کے بعد میں اُس کی کہانی بھول جاؤں۔ کیونکہ مجھ پر اس سے بھی بڑی افتاد پڑ چکی ہو گی۔ پدما کو خود بھی اپنے ان الفاظ کا احساس نہیں تھا۔ وہ بدستور سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی۔ پھر اُس نے آہستہ سے کہا۔“

”ہم نے ساری باتیں سوچیں منصور! لیکن ایک بات نہ سوچی۔ کیا تمہارے ذہن میں بھی وہ نہیں ہے؟“

”کی؟“

”یہ بتاؤ! وہ تصویر کس کی تھی؟“

”اوہ..... وسنت سنگھ نے بھی اس بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا ہمیں۔“

”اگر میں اُس سے پوچھتی تو وہ کیا بتا سکتا تھا؟“ پدما نے سوال کرنے والے انداز میں کہا۔

”بھلا مجھے کیا معلوم؟“

”چلو چھوڑو وسنت سنگھ کو تم بتاؤ! تمہارا کیا خیال ہے؟ وہ تصویر انتہائی قدیم تھی۔ اس میں جو لباس تھا، میں نے اُس کا کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔ لیکن کیا یہ لباس مہارانیوں کا سا نہیں تھا؟ وہ تصویر مجھ سے اتنی مل رہی تھی کہ میں خود بھی شاید اُسے دیکھتی تو یہ یقین نہ کر پاتی کہ وہ میری نہیں ہے۔ لیکن اتنی قدیم تصویر اور میری؟“

”تمہارا مطلب کیا ہے پدما؟“

”تم سوچ نہیں رہے منصور..... تم نہیں سوچ رہے۔ میں تمہیں بتا چکی ہوں کہ میں گم کردہ منزل ہوں۔ میں اپنے ماضی، خاندان اور لوگوں کے بارے میں کچھ نہیں جانتی۔ میں انہی کی تلاش میں تو سرگرداں ہوں۔ میں یہ سوچ رہی ہوں کہ کہیں اس تصویر کا تعلق مجھ سے نہ ہو۔ کہیں..... کہیں وہ میری ماں نہ ہو..... دیکھو منصور! یہ باتیں ڈرامائی حیثیت ضرور رکھتی ہیں لیکن کیا ان کی وجوہ سے انکار کیا جاسکتا ہے؟ کیا ایسا نہیں ہوتا کہ بہت سی اولادیں اپنے ماں باپ کی ہم شکل ہوتی ہیں؟ اتنی ہم شکل کہ لوگ حیرت کرتے ہیں۔“

”ہاں..... تمہارا یہ خیال درست ہے۔ میں نے تو ہم شکل کے معاملے میں بڑی چوٹیں کھائی ہیں۔ مجھ سے ایسی بات کر رہی ہو؟“

”کیا یہ ممکن نہیں ہوگا کہ اس تصویر کے بارے میں معلومات حاصل کریں؟“

”جہاں تک میرا خیال ہے پدما! وسنت سنگھ براہ راست اس مسئلے میں ملوث نہیں ہے۔ ہمیں ہوٹل کے مینجر کے الفاظ ضرور یاد ہوں گے۔ اُس نے کہا تھا کہ وہ ایک جرائم پیشہ شخص ہے۔ اور ہر طرح کی لوٹ مار کے دھندے کرتا رہتا ہے۔ ہو سکتا ہے وسنت سنگھ نے ہم سے کوئی پتہ کہا ہو، صحیح ہو اور بظاہر یہی نظر آتا ہے کہ اُس کی باتیں سچ ہیں۔ کسی نے اُس سے رابطہ قائم کر کے یہ تصویر اُس کے حوالے کی ہو اور کہا ہو کہ اس طرح اُسے ایک لڑکی کی تلاش ہے۔ وسنت سنگھ نے اپنے بطور پر ہمیں دیکھا اور پھر یہ جاننے کے لئے کہ کیا تم وہی

لڑکی ہو، ہمیں اپنی اُس حویلی میں لے گیا۔ یہ صرف اتفاق ہے کہ ہم نے دہلی سے سب سے پہلے ہی کا رخ کیا۔ میرا خیال ہے کہ وسنت سنگھ کو حقیقت نہیں معلوم ہوگی۔ اُس نے دس روپے کی پیشکش کی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس سلسلے میں اُسے پچاس لاکھ روپے تک یا اس سے کچھ زیادہ کی پیشکش ہوئی ہو۔ وسنت سنگھ یقیناً ہمیں اس بارے میں کچھ نہیں بتا سکے گا۔“

پدما نے ایک سسکی لی۔ ”نجانے کیوں میرے ذہن میں بار بار یہ تصور ابھرتا ہے کہ اس تصویر کا میرے خاندان سے کوئی نہ کوئی تعلق ضرور ہے۔“

”ہو سکتا ہے ایسی بات ہو۔“ میں نے جواب دیا۔

پدما کی آنکھیں ڈبڈبا آئی تھیں۔ اس سے پہلے وہ کبھی اس قدر متاثر نظر نہیں آتی تھی۔ لیکن اب نئی سوچ نے اُسے یقیناً اُداس کر دیا تھا۔ میں اپنی جگہ سے اُٹھ کر اُس تک پہنچا۔ ”تم تو بڑی باہمت لڑکی ہو۔ بعض لوگ تقدیر کے بیٹے ہوتے ہیں۔ انہیں زندگی میں ایسے مسائل درپیش ہوتے ہیں کہ وہ ان سے نمٹنے کی اہلیت نہیں رکھتے۔ لیکن بہر طور! جب مسئلہ وجود ہے تو اس کے ساتھ ہی ’حل‘ کا نام بھی آتا ہے۔ ہمیں دیر ضرور لگ رہی ہے لیکن ایک دن یقیناً ایسا ہوگا جب تم اپنوں کے بچ پہنچ جاؤ گی۔ یقیناً تمہیں اس بات پر بھروسہ رکھنا چاہئے۔ ویسے بھی تمہاری زندگی میں ایسی کوئی بری بات نہیں، جس کی وجہ سے تمہیں کسی گناہ کی سزا ملے۔ تم اطمینان رکھو! ایک دن ایسا ضرور ہوگا۔ ہر اسان نہ ہونا۔ تمہاری آنکھوں میں آنسو کیوں جھللا رہے ہیں؟“

پدما بے اختیار ہو گئی۔ ”میں تھک گئی ہوں منصور!“ اُس نے روتے ہوئے کہا۔ ”یقیناً کرو میں تھک گئی ہوں۔ بعض اوقات سوچتی ہوں کہ اگر میں اپنے گھر میں ہوتی، اپنے لوگوں میں ہوتی، میرے سر پر سایہ ہوتا، لوگ میری پشت پر ہوتے تو کیا اس قدر جدوجہد سکتی تھی؟ کیا کیا نہیں ہوا میرے ساتھ؟ کس طرح پارورش پائی غیروں کے درمیان؟“

اُس کے بعد کیسے کیسے لوگوں کے ہاتھوں میں بھٹکتی پھر رہی ہوں؟ یہ تقدیر کیسے تبدیل کی جاسکتی ہے منصور؟ بتاؤ! میں اپنی تقدیر کیسے بدل لوں؟ میں تو سکون کی زندگی چاہتی ہوں میں اپنا گھر چاہتی ہوں۔ اپنے لوگوں کے درمیان جینا چاہتی ہوں۔ لیکن کیا یہ جینا ہے؟ اسی کو ہی جینا کہتے ہیں؟“

وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی اور میں خالص عورتوں کی طرح اُسے تسلیاں دینے لگی۔

ن کا رونا دھونا اور بے اختیاریاں جب حد سے بڑھیں تو میں نے پیچھے ہٹنے کی کوشش کی۔ میں جتن سے گدی پر ایک تھپڑ پڑا..... میں نے چونک کر پیچھے دیکھا..... کوئی نہیں تھا۔ تب اُنہیں کی آواز سنائی دی.....

”اوگدھے..... راعمساں! عقل نہیں آئے گی تجھے.....؟ عقل نہیں آئے گی؟“

”لغت ہو تجھ پر.....“ میں نے دل ہی دل میں کہا۔

”ہاں ہاں..... مجھ پر لغت بھیجتا رہ۔ لیکن..... لیکن اس موقع کو ہاتھ سے نہ جانے دے۔ یقین کر! اگر تو نے ایسا کیا تو پھر..... تو پھر میرے غضب سے نہیں بچ سکے گا۔“

”اوگدھے..... تو یہاں مریوں رہا ہے؟ دفعتاً ہو جانا یہاں سے.....“

”میں دفعتاً ہو جاؤں گا لیکن اسی شرط پر.....“ راعمیس کی ہلکی سی ہنسی سنائی دی۔ میں نے پھر اپنا ذہن اُس کی طرف سے ہٹا لیا۔ پدما اُس معصوم بچی کی طرح ہو رہی تھی جو صدیوں سے کسی پیار بھری آغوش کی بھوک تھی۔ وہ ایسی بے قرار رُوح بن گئی تھی جس کا آنگن سالوں سے ساون کی جھڑی کا منتظر رہا ہو۔ میں نے اُسے تسلیاں دیں۔ اپنی صلاحیت اور قابلیت کے مطابق الفاظ و اظہار کے سارے طریقے استعمال کر دیئے تھے۔ میری تسلیاں اور ہمدردیاں بن بادل برسات کی طرح اُس کی سونی آنکھوں میں برسی تھیں۔ پھر دفعۃً اُس نے چونک کر دہشت زدہ نگاہوں سے مجھے دیکھا.....

”منصور.....“ لیکن میں نے اُسے کوئی جواب نہیں دیا۔ اُس نے سمٹ کر دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ لیا۔ پھر اُس نے نگاہیں اٹھا کر مجھے دیکھا اور میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھتی رہی۔ اس کے بعد اُس نے آنکھیں بند کر کے آہستہ سے گردن جھٹکی۔ ”مجھے مشورہ دو کہ میں کیا کروں؟ میری زندگی ہر لمحہ ایک نئے حادثے سے روشناس ہوتی ہے منصور! مجھے میری منزل تک پہنچا دو..... مجھے میری منزل تک پہنچا دو..... میں تمہارا یہ احسان زندگی بھر نہیں بھولوں گی۔“

”پدما! مجھے معاف کر دینا۔“

”نہیں منصور! ٹھیک ہے۔ جو کچھ ہو سکتا ہے، وہ ہوتا رہے گا۔ کوئی نہیں روک سکتا اسے۔ تم بتاؤ! میں ہوں کیا چیز؟ ایک ایسی شخصیت جس کا کوئی محور نہیں ہے۔ براہ کرم! ان احساسات کو ذہن سے نکال کر سو جاؤ۔“

میں نے اُس کی ہدایت پر عمل کیا۔ لیکن راعمیس میرے کان میں مسلسل ہنسے جا رہے تھے۔ وہ بہت مسرور تھا۔ عجیب بد بخت روح تھی یہ..... جس نے جانے مجھے کہاں کہاں گھمبیر میں اپنے ذہن کو آزاد چھوڑ کر سونے کی کوشش کرنے لگا۔ پدما بھی سونے کے لئے لیڑ تھی۔ جانے کب نیند نے ہمیں اپنی آغوش میں لے لیا..... پھر جب سورج کی کرنیں کے راستے اندر داخل ہو رہی تھیں کہ ٹیلی فون کی گھنٹی نے مجھے جگا دیا۔ میں نے چند ٹیلی فون کی گھنٹی کو نظر انداز کرنے کی کوشش کی۔ لیکن جب وہ مسلسل بجتی رہی تو میں اس سے اٹھ کر ٹیلی فون کی جانب بڑھ گیا۔ پدما بھی جاگ گئی تھی۔ میں نے ریسپور کان لیا اور آواز صاف کر کے ہیلو کہا۔ لیکن دوسری طرف سے کوئی آواز نہیں آئی۔ البتہ عجیب سی خرخراہٹ سنائی دے رہی تھی..... ”ہیلو! کون بول رہا ہے؟ کیا بات ہے؟“ نے پھر سوال کیا۔ اور مجھے یوں محسوس ہوا جیسے دوسری طرف کوئی چیز گھسیٹی جا رہی ہو۔ ایک کھرکھراتی ہوئی سی آواز سنائی دی.....

”مسٹر..... مسٹر..... سندر..... سندر.....“

میں نے حیرت سے اُس آواز کو سنا جو نسوانی تھی۔ ”ہیلو! کون بول رہا ہے؟“

”سندر لال..... سندر لال کپور.....؟“

”ہاں! میں ہی ہوں۔ مگر آپ کون ہیں؟“

”کرن..... کرن کور.....“ اُس نے جواب دیا۔

”ارے کرن جی! کیا بات ہے؟ یہ بول کیسے رہی ہیں آپ؟“ میں نے چونک کر کہا۔

”فوراً سندر لال..... فوراً..... فوراً ہوٹل مالا بار آ جاؤ..... ہوٹل مالا..... بار..... فوراً“

فائیو تھری ایٹ۔ پلیز.....“

”مگر تمہاری آواز کو کیا ہو گیا ہے کرن جی؟ یہ تم بول کیسے رہی ہو؟“

”پلیز جلدی..... جلدی.....“ اُس نے کہا اور مجھے یوں محسوس ہوا جیسے ریسپور اس باتھ سے گر پڑا ہو۔ میں نے کئی بار ہیلو، ہیلو کہا۔ لیکن پھر مجھے کوئی آواز سنائی نہیں دی۔

ریسپور کریڈل پر نہیں رکھا گیا تھا۔ میں نے پریشان نگاہوں سے پدما کی طرف دیکھا۔

اٹھ کر بیٹھ گئی تھی۔

”کیا بات ہے؟ کیا کہہ رہی تھی کرن کور؟ تم..... تم پریشان کیوں ہو گئے تھے؟“

”اوہ! پدما..... کرن کور نے مجھے ٹیلی فون کیا تھا۔ مالا بار ہوٹل کے کمرہ نمبر پانچ سو

زہیں میں اُس نے مجھے بلایا۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ کسی اذیت کا شکار ہو۔“

”کرن کور..... ہوٹل مالا بار..... کمرہ نمبر پانچ سو اڑتیس..... مگر وہ ہوٹل مالا بار میں

کیوں ہے؟ وسنت سنگھ کہاں ہے؟“ پدما نے متحیرانہ انداز میں سوال کیا۔

”میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔ بولو! کیا کرنا چاہئے؟“

”چلو چلتے ہیں۔ ان لوگوں سے تو اب ہماری بھی ضرورت اٹک گئی ہے۔ پتہ نہیں کیا

ہو؟ یہ اپنی حویلی سے اُس ہوٹل میں کیسے پہنچ گئے؟“

”میں کچھ نہیں جانتا۔ اگر چلتا ہے تو لباس تبدیل کر لو۔“ میں نے کہا۔

پدما پھرتی سے اٹھ بیٹھی۔ میں نے راعمیس کو آواز دی۔ اُس سے مشورہ کر لینا تو زیادہ

بہتر تھا۔ لیکن میرے پکارنے پر اُس کی کوئی آواز سنائی نہیں دی اور میں ایک ٹھنڈی سانس

لے کر رہ گیا۔ ایسے اہم موقعوں پر تو وہ خود بخود غائب ہو جاتا تھا۔

پدما لباس تبدیل کر کے آگئی۔ میں بھی تیار ہوا اور پھر ہم دونوں باہر نکل آئے۔ پدما

کے بدن میں ہلکی ہلکی لرزش تھی۔ نیچے اتر کر اُس نے پریشان نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھتے

ہوئے کہا۔ ”اب کیا کرنا چاہئے؟ میں تو پریشان ہو گئی ہوں۔ کہیں وہاں ہمارے لئے کوئی

خطرہ نہ ہو.....“

”اب جو کچھ ہوگا، دیکھا جائے گا۔ فی الحال یہی دونوں ہمارے پروگرام میں مرکزی

نشیت رکھتے ہیں۔ کم از کم دیکھا تو جائے چل کر کہہ ہوا کیا ہے؟“

”کسی مصیبت میں نہ پھنس جائیں۔ کوئی سازش نہ ہو ہمارے خلاف۔ تمہیں یقین ہے

کہ وہ آواز کرن کور ہی کی تھی؟“

”تقریباً اسی فیصد! اُس آواز میں ایک زخمی زخمی کیفیت تو تھی لیکن بولنے کا انداز کرن

کور ہی کا تھا۔ پھر چونکہ میں بھی نیند سے اٹھا تھا اور ذہن پوری طرح حاضر نہیں تھا اس لئے

اس پر غور نہیں کیا۔

پدما گہری گہری سانسیں لینے لگی۔ میں خود بھی فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا کہ مجھے کیا کرنا

چاہئے؟ لیکن پھر میں نے یہی سوچا کہ میری زندگی تو ہے ہی ان حالات سے منسوب۔

مالا بار میں داخل ہونے کے بعد لفٹ کے ذریعے ہم اوپر کی منزل پر پہنچ گئے جہاں کمرہ

”من.....منصور.....“

”سنہلو..... پدما! سنہلو..... خود کو سنہلو اور یہ سوچو کہ اب ہمیں کیا کرنا چاہئے؟ یہاں سے نکل چلیں یا یہ معلوم کرنے کی کوشش کریں کہ وسنت سنگھ.....؟“

”نہیں پلیز..... چلو یہاں سے..... جلدی چلو.....“ پدما رونے والے انداز میں بولی اور پھر مسہری کی طرف دیکھ کر بولی۔ ”اُس کی گردن..... اُس کی گردن.....؟“

”آؤ..... یہ منظر مت دیکھو۔ تم سے برداشت نہیں ہو سکے گا۔“ میں نے دروازے کے قریب پہنچ کر اُسے اس احتیاط سے کھولا کہ میری انگلیوں کے نشانات اس پر نہ رہیں۔ دروازے کے بیرونی ہینڈل کو بھی رومال سے صاف کیا اور پھر پدما کو ساتھ لے کر راہداری میں تیزی سے آگے بڑھنے لگا۔ مجھے خوف تھا کہ کہیں ہم دونوں کو دیکھ نہ لیا جائے۔ خوش بختی ہی تھی کہ ہماری اس تمام کارروائی کو کسی نے نہیں دیکھا۔ اب ذرا رونق ہو گئی تھی۔ لوگ باگ اور ویٹر ادھر سے ادھر جاتے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ ہم دونوں برق رفتاری سے ہوٹل ملا بار سے باہر نکل آئے۔

تھوڑی دیر کے بعد ہم اپنے ہوٹل پہنچ گئے۔ اندر آ کر پدما دھم سے مسہری پر گر پڑی۔ اُس کا بدن کانپ رہا تھا۔ ”یہ کیا ہو گیا.....؟ یہ کیا ہو گیا.....؟“

”خود کو سنہلو! بغیر چارہ نہیں ہے پدما! اگر تم نے کسی کمزوری کا اظہار کیا تو ہم پھنس جائیں گے۔ ہو سکتا ہے کسی نے ہمیں وسنت سنگھ کے ساتھ دیکھا ہو۔ ممکن ہے ہمیں اُن کے قتل کے الزام میں گرفتار کر لیا جائے۔“

”پھر کیا، کیا جائے..... کیا، کیا جائے.....؟“

”سب سے پہلا کام یہی ہے کہ خود کو سنہلو! رکھو..... جب تک ہم ذہنی طور پر معتدل نہیں ہوتے، کوئی فیصلہ نہیں کر پائیں گے۔“

”کیا جے پور چھوڑ دیا جائے؟“

”یہ بھی سوچنا پڑے گا۔ کہیں یوں نہ ہو کہ ہماری نشاندہی کی جائے اور جب ہم جے پور سے غائب پائے جائیں تو ہماری تلاش شروع کر دی جائے اور ہمیں قاتل تسلیم کر لیا جائے۔ خیر! یہ بعد کی باتیں ہیں۔ فی الحال تازہ دم ہو جاؤ۔ میں چائے وغیرہ منگواتا ہوں۔ اطمینان سے بیٹھ کر باتیں کریں گے۔ جو کچھ ہونا تھا، وہ ہو چکا۔ لیکن اب اس کا اظہار

نمبر پانچ سواڑتیں ہو سکتا تھا۔ میرا دل دھڑک رہا تھا۔ پدما کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ ہوٹل میں چہل پہل نہیں ہوئی تھی۔ ویٹر وغیرہ بھی نظر نہیں آ رہے تھے۔ راہداریاں سنہلو پڑی تھیں۔ میں نے کمرہ نمبر پانچ سواڑتیں کے سامنے رُک کر آہستہ سے دستک دی۔ اندر سے کوئی جواب نہیں ملا تو میں نے اُنکی سے دروازہ کھیل کر دیکھا۔ دروازہ اندر کھلا ہوا تھا۔ میں ایک لمحے تک سوچنے کے بعد پدما کو اشارہ کر کے اندر داخل ہو گیا۔ کمرے میں تیز روشنی کا بلب جل رہا تھا۔ میں نے جو منظر دیکھا، اُس نے ایک لمحے لئے مجھے دہلا دیا..... مسہری پر وسنت سنگھ پڑا تھا۔ لیکن اُس کی گردن مسہری کے نیچے تھی۔ بے گردن کا بدن مسہری پر چاروں شانے چپ تھا اور اتنا خون بہا تھا کہ شاید مسہری کا بھی اس خون کو جذب کرنے میں ناکام رہا تھا.....

پدما کے حلق سے چیخ نکلتی ہی والی تھی کہ میں نے اُس کا منہ بھینچ لیا۔ کمرے کے ایک گوشے میں ٹیلی فون کے بالکل نزدیک کرن کور بری طرح مڑی تڑی اوندھے منہ زمین پر پڑی تھی..... ٹیلی فون کا ریسپور کریڈل پر نہیں تھا بلکہ اُس کے نزدیک ہی لٹکا ہوا تھا۔ میں نے پھرتی سے پدما کو سنہلو! دے کر کرن کور کو سیدھا کرنے کی کوشش کی۔ لیکن یہ دیکھا کہ میرے اوسان خطا ہو گئے کہ اُس کے سینے میں کئی گہرے زخم تھے جن سے خون رس رہا تھا۔ نیچے قالین میں جذب ہو رہا تھا۔ اُس نے آنکھیں کھولیں..... یوں محسوس ہوا جیسے اُس نے بینائی رخصت ہو گئی ہو۔ پھر اُس کی کمزور آواز ابھری۔

”کون..... کون ہے.....؟“

”انہوں نے..... انہوں نے وسنت..... وسنت کو قتل کر دیا۔ وہ سادھو تھے..... اُن کے سامنے.....“ کرن کور نے بس یہ الفاظ ادا کئے اور اُس کے بعد اُس کی آواز بھنچ گئی۔

میں ایک دم کھڑا ہو گیا۔ پدما نے پھرتی سے دونوں ہاتھ منہ پر رکھ کر اپنی دوبارہ والی چیخ کو روکا تھا۔ اُس کی آنکھیں دہشت سے پھٹی ہوئی تھیں اور وہ اپنے ہاتھ کی طاقت سے منہ پر جمائے ہوئے تھی۔ کرن کور کو اسی طرح چھوڑ کر میں پیچھے آ گیا اور نے پدما کے شانے پر تھپکی دیتے ہوئے کہا۔

”نہیں پدما.....! چیخنے کی کوشش مت کرو۔ ورنہ ہم ایسے الزام میں گرفتار ہو جائیں گے جس سے نکلنا ممکن نہیں ہو گا۔“

ہمارے چہروں یا ہماری حرکات سے نہیں ہونا چاہئے۔“
پدما اب میرے احکامات کی تعمیل فوراً ہی کرتی تھی۔ چنانچہ وہ باتھ روم کی جانب بڑھ گئی اور میرے ذہن نے گھومنا شروع کر دیا.....

وسنت سنگھ کو قتل کر دیا گیا۔ کرن کور نے صاف الفاظ میں انگریز سادھوؤں کا ذکر کیا تھا اور یہ انگریز سادھو کرنل جیمز کے ہی آدمی ہو سکتے تھے۔ مجھے ان کے بارے میں اطلاع دے دی گئی تھی۔ لیکن انہوں نے وسنت سنگھ کو کیوں قتل کر دیا؟ وہ تو میرے تحفظ کے لئے مامور تھے..... کیا ہماری زندگیوں کو وسنت سنگھ اور کرن کور سے کوئی خطرہ تھا؟ اور اس خطرے کو وقت سے پہلے ٹالنے کے لئے انہوں نے ان دونوں کو ٹھکانے لگا دیا؟ یا کوئی اور بات تھی؟ یہ بات بھی حیرت انگیز تھی کہ وہ لوگ اپنی حویلی میں قیام کرنے کی بجائے ہوٹل والا بار میں کیوں مقیم تھے؟

پدما کے آنے سے پہلے میرے خیالات کا تسلسل ٹوٹ گیا۔ وہ نہا کر اور نکھر گئی تھی۔ ویٹر چائے اور ناشتے کا سامان لے آیا۔ پدما نے میرے لئے چائے بنائی اور پھر ہم بیٹھ کر باتیں کرنے لگے.....

”ہے بھگوان! کتنا وحشیانہ قتل تھا۔ انہوں نے اُس کی گردن کاٹ کر نیچے پھینک دی تھی۔“ پدما نے جھرجھری لیتے ہوئے کہا۔ چائے کا کپ اُس کے ہونٹوں پر کانپ گیا تھا۔

”تذکرہ کرتے ہوئے بھی احتیاط رکھو پدما! دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔“

پدما نے آنکھیں بند کر لیں۔ غالباً وہی منظر اُس کی نگاہوں کے سامنے گھوم رہا تھا۔ ویٹر برتن وغیرہ اٹھا کر لے گیا تو ہم نے اپنے آئندہ پروگرام پر گفتگو شروع کر دی۔

”یہ سب کچھ ہمارے لئے غیر متوقع ہوا ہے۔ پدما! یوں سمجھو کہ ہمارے پروگرام کے تمام راستے رُک گئے۔ میں یہ بات تسلیم کرتا ہوں کہ وسنت سنگھ کوئی صحیح آدمی نہیں تھا۔ لیکن کم از کم وہ ہمیں ہماری منزل کی جانب لے تو جا رہا تھا۔ اب ایک بار پھر ہم تنہا رہ گئے ہیں۔“

”میرا دماغ کام نہیں کر رہا منصور!“

”تمہیں اپنی اُنہی قوتوں سے کام لینا ہو گا پدما! جن کے سہارے تم آج تک حالات

سے نمٹتی چلی آئی ہو۔“

پدما نے عجیب سے انداز میں میری طرف دیکھ کر کہا۔ ”اب جی نہیں چاہتا۔“
”میں نہیں سمجھا؟“

”اب میری ذمہ داری تم پر ہے۔ صرف تم پر.....“

میں نے دل ہی دل میں ٹھنڈی سانس لے کر گردن ہلائی تھی۔ ہاں! میں پھنس تو گیا ہی ہوں۔ یہ ذمہ داری مجھے سنبھالنی ہی پڑے گی۔ لیکن پدما پر میں نے اپنے احساسات کا اظہار نہیں کیا تھا۔ راعمیس مسلسل غائب تھا اور اب میرا دل نہیں چاہ رہا تھا کہ میں اُسے اس مسئلے میں شریک کروں۔ خود ہی آئے گا جھک مار کر۔ اور مجھے کچھ بتائے گا تو ٹھیک ہے۔ ورنہ جو کچھ بھی ذہن میں آئے گا، کرتا رہوں گا۔

دوپہر ہو گئی۔ ہم لوگ کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکے تھے۔ بس! ہمیں ایک عجیب سے انداز میں انتظار تھا اس بات کا کہ کوئی ہم تک پہنچے۔ ہم سے کچھ کہے۔ وسنت سنگھ کی حویلی میں ملازمین بھی تھے۔ انہوں نے ہمیں دیکھا تھا۔ ہو سکتا ہے وسنت سنگھ کی موت کے بعد کوئی ہماری نشاندہی کرے۔ لیکن یہ احساس بھی احمقانہ ہی تھا۔

دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد پدما نے کہا۔ ”اب بتاؤ منصور! ہمیں کیا کرنا چاہئے؟ ہمارے سامنے چند نام ہیں۔ کیا ہم ریاست گنڈاپور چلیں اور وہاں جا کر ہریش چندر سے ملنے کی کوشش کریں؟“

”وسنت سنگھ، ہریش چندر سے یہ وعدہ کر کے آیا تھا کہ وہ اس تصویر کی ہم شکل لڑکی کو تلاش کر کے ان کے حوالے کرے گا اور اُس نے ہمیں اس کے لئے دس لاکھ روپے کی پیشکش کی تھی۔ اس بات کو ذہن میں رکھو پدما! اگر ہم براہ راست ہریش چندر تک پہنچ گئے تو ہو سکتا ہے کسی ایسی فوری مشکل میں گرفتار ہو جائیں جس سے چھٹکارہ ممکن نہ ہو۔ اس کے بعد ہمارے راستے رُک جائیں گے اور وہ کام نہیں ہو سکے گا جو ہم کر رہے ہیں۔“

”ہاں! یہ بھی ٹھیک کہہ رہے ہو تم۔ میرے ذہن میں ایک اور خیال آیا ہے۔ کیوں نہ اس کی تکمیل کی جائے؟ ہم سیدھے تنور یا جا کر گوپال سانگا کے اہل خاندان کے بارے میں معلومات حاصل کریں گے۔ اگر مجھے ہر ناوٹی اور اُس کی ماما جی مل گئیں تو پھر سمجھو کہ کافی کام ہو جائے گا۔ ہو سکتا ہے وہ لوگ میری حیثیت بتا سکیں۔ یہ بات تو پہلے ہی ہمارے پروگرام میں شامل تھی نا..... اگر وسنت سنگھ ہمیں نہ مل جاتا تو ہم تنور یا ہی جاتے۔“

چنانچہ اس سلسلے میں تم بالکل فکر مت کرو۔“

تنویرا روانہ ہونے کے لئے تھوڑی سی خریداری بھی کرنی تھی۔ چنانچہ سب سے پہلے ہم نے ہوٹل کا بل ادا کر کے ہوٹل چھوڑ دیا۔ پھر ٹہلنے کے انداز میں شہر کے بازاروں میں نکل آئے۔ جے پور کی روایتی زندگی جاری و ساری تھی۔ سڑکیں، گلیاں، بازار اب کافی ماڈرن ہو چکے تھے۔ اور یہاں کی قدیم تاریخ تبدیل ہو گئی تھی۔ ایک بازار سے ہماری ضرورت کی اشیاء ہمیں مل گئیں۔ سیاحوں کی حیثیت سے ہمیں یہ سفر کرنا تھا اور خصوصی طور پر کسی کی توجہ اپنی جانب مبذول کرانا مقصود نہیں تھا۔ چنانچہ ایک مناسب جگہ دیکھ کر پدما نے وہ معمولی سی ساڑھی زیب تن کر لی جو ہم نے اس سفر کے لئے خاص طور سے خریدی تھی۔ اور اُس کے ساتھ ہی راجپوتانہ کے وہ روایتی چاندی کے زیور بھی جنہیں کوئی ماڈرن لڑکی کسی قیمت پر پہننا پسند نہ کرتی۔ میں نے بھی اپنے لباس میں تبدیلیاں کر لیں اور اس کے بعد ہم معمولی شہریوں کی حیثیت سے بسوں کے اڈے پر پہنچ گئے۔ بس تنویرا جانے کے لئے تیار تھی۔ چنانچہ ہم اس میں بیٹھ گئے۔ بس میں طرح طرح کے مسافر بھرے ہوئے تھے جن میں زیادہ تر کا تعلق راجپوتانہ ہی سے تھا۔

سفر تقریباً پونے چار گھنٹے تک جاری رہا۔ فاصلہ بہت زیادہ نہیں تھا۔ لیکن راستہ دشوار گزار تھا۔ خاص طور سے تقریباً دس یا بارہ میل کا ایک ٹکڑا تو بڑا ہی تکلیف دہ ثابت ہوا۔ کچی سڑک اور خوفناک گھاٹیاں..... یہاں سفر کی رفتار بہت سست رہی تھی۔ اور صرف یہی ایک ٹکڑا تقریباً ایک گھنٹے بلکہ اُس سے بھی کچھ زیادہ وقت میں طے ہوا تھا۔ اس کے بعد والی سڑک بہتر حالت میں تھی۔

تنویرا چھوٹا سا پہاڑی قصبہ اپنی حسین روایات کے ساتھ مصروف زندگی تھا۔ لال پتھروں کے مکانات، لیکن کچے مکانات اور جھونپڑیاں زیادہ تھیں۔ ایک دیہاتی سے ہم نے قیام گاہ کے لئے پوچھا۔ وہ حیرت سے ہمیں دیکھنے لگا۔ پھر اُس نے ہمیں کچی سرائے کا حوالہ دیا۔ جہاں چھوٹے چھوٹے ڈربے نما خانے بنے ہوئے تھے۔ ان میں ایک ایک چارپائی پڑی ہوئی تھی۔ ہمیں اس عالی شان سرائے میں ایک رہائش گاہ حاصل ہو گئی۔ سرائے کے دیہاتی مالک نے ہمارے ڈربے میں ایک چارپائی کا اور اضافہ کر دیا لیکن اس کے بعد بس اتنی ہی گنجائش تھی کہ دونوں چارپائیوں کے درمیان سے نکل کر دروازے تک

”ٹھیک ہے۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں۔“

باقی وقت بھی ہم نے اپنے ہوٹل ہی میں گزارا۔ باہر کے حالات کا کوئی اندازہ نہیں تھا۔ رات ہو گئی اور ہم ہوٹل سے باہر نہ نکلے۔ رات کا کھانا بھی کمرے میں ہی کھایا اور پھر سونے کے لئے لیٹ گئے۔

دوسرے دن پدما کسی قدر مطمئن نظر آ رہی تھی۔ اُس کے چہرے پر بھی بے اشتیاقی گویا اُس نے مجھے اپنے آپ میں تسلیم کر لیا تھا۔ غسل وغیرہ سے فارغ ہونے کے بعد ہم نے ناشتہ کیا اور تیار ہو کر میں ہوٹل سے باہر نکل آیا تاکہ تنویرا جانے کے لئے کسی سواری کا معلوم کر سکوں۔

سیڑھیاں عبور کرنے کے بعد میں نے باہر قدم رکھا اور دل ہی دل میں لرزے ہوئے راغمیس کو آواز دی۔ ”اے بد بخت روح! کہاں مر گئی ہے تو..... کہاں گم ہو گئی ہے؟ کم از کم اب مجھے یہ تو بتا دے کہ میرے آگے کے راستے کیا ہوں گے؟“

لیکن بد بخت روح عالم برزخ میں واپس پہنچ گئی تھی۔ مسلسل غائب تھی۔ کوئی جواب نہیں ملا اور میں دل ہی دل میں اُسے کو ستا ہوا آگے بڑھ گیا۔ خوف کے احساس کو میں ذہن سے جھٹک نہیں پایا تھا۔ ہر لمحے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے عقب سے پولیس کے جوان آئیں گے اور میری گردن دبوچ کر مجھے گرفتار کر لیں گے۔ لیکن ایسا نہ ہوا۔ میں لرزے انداز میں آگے بڑھتا رہا اور اُس کے بعد جب یہ اُمید ہو گئی کہ کوئی میرے تعاقب میں نہیں ہے تو پھر میں نے اپنا کام شروع کر دیا۔ تنویرا جانے کے لئے بس مل جاتی ہے اور اس میں کوئی دقت نہیں ہوتی۔ چنانچہ میں کسی قدر مطمئن انداز میں اپنے ہوٹل آ گیا۔

پدما میرا انتظام کر رہی تھی۔ جس وقت میں کمرے میں داخل ہوا، اُس کے ہونٹوں پر ہلکی ہلکی گنگناہٹ تھی۔ گویا اپنے آپ کو اُس نے کافی حد تک سنبھال لیا تھا یا پھر مجھ پر بہت زیادہ اعتماد کرنے لگی تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ سنبھل گئی اور مسکرا کر پوچھنے لگی۔ ”کہو! کچھ کامیابی حاصل ہوئی؟“

”ناکامی کا کیا سوال ہے؟ تنویرا جانے کے بارے میں تمام معلومات حاصل کر کے آیا ہوں۔ ایک ہی ذریعہ ہے وہاں تک پہنچنے کا۔ اور وہ ہے گھٹیا قسم کی ٹوٹی پھوٹی بسیں۔“

”اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟ ہمارا سفر کتنا طویل ہوگا؟ بالآخر تنویرا پہنچ ہی جائیں گے۔“

پہنچا جاسکے۔ ہم نے اپنا سامان چار پائیوں کے نیچے ٹھونس دیا۔

چار پائی پر بیٹھ کر پدما نے ایک گہری سانس لی اور مسکراتی نگاہوں سے مجھے دیکھنے لگی۔
”ویسے یہ ایڈونچر بھی برا نہیں۔“

میں بھی مسکرا دیا تھا۔ شام جھک آئی تھی۔ سرائے میں ہمیں جو گیسوں اور چنے کی ٹیڑھیں آٹے کی روٹیاں کھانے کو ملیں، جن کے ساتھ ساگ کی ترکاری تھی۔ یہ تمام چیزیں ہر جدید زندگی میں کہاں؟ چنانچہ بے حد لذیذ محسوس ہوئیں اور ہم صبر و شکر سے انہیں کھا کر سرائے کے اُس کمرے میں پڑ رہے۔

کچی پکی سرائے میں گزرنے والی رات بھی کسی اعلیٰ پائے کے ہوٹل سے کم نہیں تھی۔ تو صرف انسان کی سوچ ہے کہ وہ اپنے آپ کو مخمل کے گدوں میں زیادہ پرسکون محسوس کرے۔ پدما کی کیفیت مجھ سے بھی بہتر تھی۔ حالانکہ یہ اضطراب اُسی کا تھا۔ میں تو بعض اوقات ایک تماش بین کی حیثیت اختیار کر جاتا تھا۔ کبھی کبھی عمل بھی کرنا پڑتا تھا۔ لیکن زیادہ تر مسائل میرے نہیں ہوتے تھے۔

ناشتے سے فارغ ہونے کے بعد پدما نے مجھ سے پوچھا کہ تنور یا میں گوپال سانگا کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لئے کیا طریقہ اختیار کیا جائے؟

میں چند لمحے سوچتا رہا۔ پھر بولا۔ ”دیکھو پدما! میں تو ان علاقوں کے بارے میں کوئی واقفیت نہیں رکھتا۔ ظاہر ہے میں اس سلسلے میں نام لے کر تو کچھ بھی نہیں کہہ سکتا۔ چلتے ہیں۔ جس طرح اور جہاں سے جو کچھ معلوم ہو سکا، کوشش کریں گے۔“

”تو پھر میں اس کے علاوہ کیا کہہ رہی ہوں تم سے۔“ اُس نے مسکراتی ہوئی نگاہوں سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا اور میں آنکھیں بند کر کے گردن جھٹکنے لگا۔

”کیوں کیا بات ہے؟ کیا رات کو پرسکون نیند نہیں آئی؟“

”نہیں نہیں..... بہت سکون سے سویا۔“ میں نے شریر لہجے میں کہا اور پدما کے چہرے

پر سرخی دوڑ گئی۔ غالباً اُس نے میرے الفاظ سے کچھ اور نتیجہ اخذ کر لیا تھا۔

اس کے بعد ہم تنور یا نکل آئے۔ خاص طرز کی بستی تھی۔ ویسے بھی راجپوتانہ کے علاقے کی آبادیوں کو میں نے بہت قریب سے دیکھ لیا تھا اور وہاں کے رہن سہن اور طرز زندگی سے واقف ہو گیا تھا۔ یہاں ذرا محتاط انداز میں چلنا ضروری تھا۔ کیونکہ لوگ کسی قدر آف

طبیعت کے مالک تھے۔

مختلف علاقوں میں گوپال سانگا کے بارے میں معلومات حاصل کی گئیں۔ کچھ ایسے لوگ ملے جنہوں نے اُس سے واقفیت کا اظہار کیا اور اُس کی درد بھری کہانی مزید درد بھرے انداز میں سنائی۔ لیکن اُن میں سے کوئی یہ نہ بتا۔ کا کہ گوپال سانگا کی بیوی اور اُس کی بیٹی ہرناوتی سے کہاں ملاقات ہو سکتی ہے۔

سارا دن اسی کاوش میں گزر گیا۔ جب تھکن سے چور ہو گئے تو سرائے میں آ کر ٹھہر گئے۔ اور اس کے بعد وہی معمولات زندگی، ساری تھکن ہمارے چند لمحات دور کر دیا کرتے تھے۔ کم از کم پدما کا یہی خیال تھا بلکہ اب تو وہ کھلے الفاظ میں یہ کہنے لگی تھی کہ اُس کی زندگی کا مقصد حاصل ہونا ہو، اُسے ایک ایسی شخصیت ضرور مل گئی جو اُس کی زندگی کا مقصد ہے اور میں ایسے لمحات میں خوفزدہ انداز میں سوچتا تھا کہ وہ خود تو میری زندگی کا مقصد نہیں ہے۔ اگر اس کا کام نہ ہو سکا تو پھر میں اسے کون سے خانے میں فٹ کروں گا؟

تنور یا کا دوسرا، تیسرا، چوتھا، پانچواں دن بھی اسی طرح گزر گیا۔ کوئی مقصد حاصل نہیں ہو سکا تھا۔ گوپال سانگا کے سلسلے میں بہت سے شناسا ملے لیکن کوئی بھی اس بات کی نشاندہی نہ کر سکا کہ اس کے اہل خاندان کہاں گم ہیں؟ اس سلسلے میں ہمیں ایک اور چھوٹی سی بستی بھی جانا پڑا۔ جہاں کے بارے میں اشارہ ملا تھا کہ ہو سکتا ہے وہاں سے اُن لوگوں کا پتہ چل جائے۔ لیکن وہاں تنور یا سے ملنے والی اطلاعات کی تصدیق نہیں ہو سکی تھی۔ اب ہمارے ذہنوں میں مایوسی پیدا ہو گئی تھی۔ وسنت سنگھ اگر زندہ ہوتا تو شاید یہ صورت حال درپیش نہ ہوتی۔ اس دوران میں نے ان بد بخت انگریز سادھوؤں کو بھی نہیں دیکھا تھا جو کرنل جیمز کے ہر کارے تھے۔ پتہ نہیں وہ کہاں غائب رہتے تھے؟

ایک روز پدما کہنے لگی کہ اب تنور یا میں پڑے رہنا بے کار ہے۔

”تو پھر کیا کرنا چاہئے؟“ میں نے پوچھا۔

”میں شرمندہ ہوں منصور! کہ تمہیں بلا وجہ اپنے ساتھ الجھائے ہوئے ہوں۔ لیکن جو کچھ تم نے اپنی زندگی کے بارے میں مجھے بتایا ہے، اُس سے اطمینان ہوتا ہے کہ کم از کم تم کسی ایسے نقصان میں نہیں ہو جو تمہارے لئے پریشان کن ثابت ہو اور اب تو میں تم پر یہ حق رکھتی ہوں کہ تمہیں اپنے مشن کے لئے محدود کردوں۔ چاہے ہمیں اس میں کتنا ہی وقت لگ

سواریاں آنا شروع ہو گئیں۔ لیکن کئی گھنٹے انتہائی بوریٹ کے عالم میں گزرے کیونکہ جب تک تمام سواریاں پوری نہ ہو جائیں، بس کی روانگی ممکن نہ تھی۔ تقریباً پونے گیارہ بجے بس نے آخری سواری بٹھائی اور چل دی۔

شام ساڑھے پانچ بجے گنڈاپور پہنچے۔ عمارتیں مخصوص انداز کی تھیں۔ اب تک کسی اور بستی میں، میں نے عمارتوں کا یہ طرز تعمیر نہیں دیکھا تھا۔ ہم بس سے اتر کر چل پڑے۔ پاؤں ٹل ہو گئے تھے۔ کچے راستوں پر لگنے والے جھٹکوں نے بدن کو چور چور کر دیا تھا۔ آبادی بس کے اڈے سے تقریباً دو فرلانگ کے فاصلے پر تھی۔ ذرا دیر بعد چند گھڑسوار ہمیں اپنی جانب آتے نظر آئے۔ پہلے تو وہ ہمارے نزدیک سے گزرتے چلے گئے۔ لیکن تھوڑے ہی فاصلے پر پہنچ کر ان کے درمیان ہلچل مچ گئی۔ وہ طوفانی انداز میں واپس پلٹے اور قریب آ کر گھوڑوں سے نیچے کود پڑے۔۔۔۔۔ ان کے ہاتھوں میں پستول تھے جن کا رخ ہماری جانب تھا۔ میں اور پدمابکا بکا رہ گئے تھے۔ دوسرے لوگوں نے لپک کر مجھے بازوؤں سے پکڑ لیا۔ ان میں سے ایک نے پدمابکا کی کینٹی سے پستول لگا دیا تھا۔ کچھ لوگوں نے یہ منظر دیکھا تو رُک گئے۔ لیکن کسی نے قریب آنے کی جرات نہیں کی۔ میں ابھی حیرت زدہ ہی تھا کہ میرے دونوں ہاتھ کس کر پشت پر باندھ دیئے گئے۔ تب میں نے غرائے ہوئے لہجے میں کہا۔

”کیا بدتمیزی ہے؟ کون ہو تم لوگ؟“

”معلوم ہو جائے گا کہ ہم لوگ کون ہیں اور یہ کیا بدتمیزی ہے۔۔۔۔۔“ ایک دراز قامت آدمی نے جس کی مونچھیں لمبی لمبی اور نوکیلی تھیں اور ٹھوڑی پر ایک بہت بڑا منہ نظر آ رہا تھا۔ نظریہ لہجے میں کہا۔ ”ہم اس کے ساتھ کوئی بدتمیزی نہیں کریں گے۔ شرط یہی ہے کہ یہ خاموشی سے ہمارے ساتھ چلے۔“

”مگر کہاں؟“ میں نے پوچھا۔

”جہاں تمہیں لے جایا جائے۔“

”تم لوگ پاگل معلوم ہوتے ہو۔ کیا تمہارے ہاں سیر و سیاحت کے لئے آنے والوں کے ساتھ یہی سلوک کیا جاتا ہے؟“ میں نے کہا۔

”بہت زیادہ چالاک بننے کی کوشش مت کرو۔ نقصان اٹھاؤ گے۔ چلو۔۔۔۔۔“ دراز قد آدمی نے کہا اور وہ ہمیں آگے دھکیلتے لگے۔ تب ان میں سے ایک بولا۔

جائے۔“

”تو ان باتوں کا تذکرہ کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ میں نے کب کہا کہ میں تم سے فرار چاہتا ہوں؟“

”نہیں منصور! اخلاق بھی کوئی چیز ہے۔ میں بہت زیادہ محسوس کر رہی ہوں کہ بجائے اس کے کہ تم سکون کے کچھ لمحات گزارو، میرے ساتھ نگر نگر سرگرداں ہو۔“

”اچھا! چھوڑو ان باتوں کو۔ اب ہمیں کیا کرنا چاہئے؟“

”ایک ہی بات ذہن میں رہ جاتی ہے۔ وہ یہ کہ گنڈاپور چلیں اور اپنے آپ کو ہریش چندر کے حوالے کر دیں۔ ہریش چندر اگر کسی کو اتنی بڑی رقم ہماری تلاش کے لئے پیش کر سکتا ہے تو یقیناً وہ ہمیں دیکھتے ہی ختم نہ کر دے گا۔“

”جیسا تم مناسب سمجھو۔“ میں نے گردن ہلا دی۔

”تو پھر کل یہاں سے گنڈاپور کے سفر کے بارے میں معلومات حاصل کئے لیتے ہیں اور اس کے بعد وہاں چلیں گے۔“

دوسرے دن ہم نے یہ معلومات حاصل کر لیں۔ بھلا اس میں کیا دقت ہو سکتی تھی؟ یہاں سے ایک بس ہمیں چک والی لے جا سکتی تھی اور چک والی سے دوسری بس گنڈاپور کے لئے مل سکتی تھی۔ چک والی کا راستہ دو گھنٹے کا ثابت ہوا۔ یہاں بھی وہی معمول کے مطابق ماحول تھا۔ گرم ریت، گرم پتھر، گرم پہاڑی علاقہ اور اس کے بعد چک والی کی شام جو اتنی گرم نہیں تھی۔

راجپوتانہ میں ایک بڑی خوبی تھی۔ دن کو شدید گرمی پڑتی تھی۔ لیکن جونہی سورج ڈھلا شروع ہوا، فضا میں خنک ہوائیں اتر آئیں اور اس کے بعد رات بے حد سرد اور انتہائی سرد ہوتی۔ چک والی ایک چھوٹی سی بستی ثابت ہوئی۔ لیکن یہاں کم بخت سرائے بھی نہیں تھے۔ البتہ یہ ہمیں معلوم ہو گیا کہ یہاں سے گنڈاپور جانے کے لئے بس مل سکتی ہے۔ صرف ایک ہی بس گنڈاپور جاتی تھی اور اسی سے ہمیں سفر کرنا تھا۔ چنانچہ بہتر یہی سمجھا گیا کہ رات بس کے اڈے پر گزاری جائے۔ یہاں ایک پیپل کے درخت کے نیچے ہم نے دھونی رمالی، کھانے پینے کے لئے حلوہ پوری اور بھاجی ترکاری مل گئی۔ جیسے تیسے رات گزری۔ صبح ہی وہ بس آ کر رُک گئی جسے گنڈاپور جانا تھا۔ ہم نے ٹکٹ خریدے اور اس میں جا بیٹھے۔ رفتہ رفتہ

ہوئے تھے چنانچہ اُس نے چند ہی لمحوں میں میرے ہاتھ کی رستی بھی کھول دی۔ وہ خاصی ذہزدہ نظر آ رہی تھی۔

”یہ سب کیا ہے؟ یہ کیا ہو گیا؟“

”جو کچھ بھی ہوا ہے، میرے خیال میں برا نہیں ہوا۔ جہاں تک میرا اندازہ ہے، ہم ہریش چندر کے پاس پہنچ چکے ہیں۔“

”اوہ..... میرا بھی یہی خیال تھا۔ لیکن.....“

”تم اُس لڑکی کی ہم شکل ہو جس کی تلاش کے لئے وسنت سنگھ کو ہریش چندر نے مامور کیا تھا اور میری صورت کے بارے میں تمہیں اندازہ ہے۔“

”رنجیت کمار۔“ پدما نے سرسراتے لہجے میں کہا۔

”میرا خیال ہے ہم دونوں کو انہی کے دھوکے میں پکڑا گیا ہے۔“

”اوہ.....“ پدما نے گہری سانس لی۔ بیٹھنے کے لئے کچھ نہیں تھا۔ نگلی زمین تھی۔ ہم اُس کھردری زمین پر بیٹھ گئے۔

تقریباً ساڑھے گیارہ بجے ہوں گے کہ اچانک تہہ خانے کا دروازہ کھلا اور کچھ روشنیاں اندر آتی محسوس ہوئیں۔ آنے والوں میں وہی دراز قد آدمی تھا جس نے ہمیں گرفتار کیا تھا۔ اُس کے ساتھ چار آدمی اور بھی تھے۔ اُس نے کڑک دار آواز میں کہا۔ ”کیا تم سو گئے؟“

”نہیں..... نہیں۔ تمہاری مہمان نوازی کے بارے میں سوچ رہے تھے۔“

”باہر آؤ! تمہاری اچھی طرح مہمان نوازی کی جائے گی۔“ اُس نے اُسی انداز میں کہا۔

میں اور پدما کھڑے ہو گئے۔ ہم دونوں اُن کے ساتھ چلتے رہے۔ اس بار ہمیں کئی راہ داریوں اور غلام گردشوں سے گزرنا پڑا۔ اور پھر ہمیں ایک اور کمرے میں لے جایا گیا جہاں فانوسوں کی تیز روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ ایک زرنگار کرسی پر دُبلے پتلے بدن کا مالک پینسٹھ ستر سالہ شخص بیٹھا ہوا تھا۔ لباس بھی شاہانہ تھا۔ کانوں میں بڑے بڑے بالے لٹک رہے تھے۔ اُس نے گھورتی ہوئی نگاہوں سے ہمیں دیکھا اور اُس کے بعد اپنی جگہ سے اُٹھ کر ہمارے قریب آ گیا۔ دیر تک وہ مجھے اور پدما کو دیکھتا رہا۔ پھر بڑبڑانے والے انداز میں بولا۔

”یہ کیا چکر ہے؟ تم ٹھا کر رنجیت کمار ہونا؟“ اُس نے میری طرف رخ کر کے کہا۔

”انہیں گھوڑوں پر بٹھا دیں مہاراج؟“

”بھہ، دو۔“ ہم دونوں کو دو گھوڑوں پر سوار کرا دیا گیا میرے ہاتھ پشت پر بند ہوئے تھے۔ پدما کو رسیوں سے نہیں کسا گیا تھا بلکہ گھوڑوں پر بیٹھے ہوئے آدمی ہتھ سے اُس کا نشانہ لئے ہوئے تھے۔ صورت حال چند لمحوں تو سمجھ ہی میں نہیں آئی تھی۔ بہرہم آگے بڑھتے رہے۔ گنڈاپور میں ہمارا استقبال کافی دلچسپ ہوا تھا۔ بالآخر ہم ہمارے حصے میں داخل ہو گئے۔ یہاں زندگی مصروف تھی۔ لوگ اپنے اپنے کاموں میں مشغول ہوئے تھے۔ لیکن ہمیں دیکھ کر سب کا روبرو چھوڑ کر کھڑے ہو گئے۔ مگر کسی نے اس میں کوئی مداخلت نہیں کی تھی۔

مختلف سڑکوں، گلیوں سے گزر کر ہمیں ایک پتھروں سے بنی ہوئی عظیم الشان عمارت لے جایا گیا جسے حویلی کا نام دیا جاسکتا تھا۔ نوکیلے گنبد اُس کے آخری سرے پر نظر آ رہے تھے۔ درمیانی دروازہ بے پناہ لمبا چوڑا تھا اور اُس سے گزرنے کے بعد پتھر کی سلوں بنائی ہوئی سڑک تھی، جس کے دونوں اطراف نہایت خوبصورت انداز میں گھاس لگا رہی تھی۔ ایک لمبی روش طے کر کے ہمیں صدر دروازے تک پہنچا دیا گیا۔ جہاں سے جانے کے لئے تقریباً چوبیس سیڑھیاں تھیں۔ اس کے بعد ایک اور چوٹی دروازہ نظر آ رہی جس میں پیتل کی کیلیں جڑی ہوئی تھیں۔ دروازے کے دونوں طرف دو دربان کھڑے ہوئے تھے جن کے جسموں پر مخصوص طرز کے رنگین لباس تھے۔ انہوں نے دروازہ کھولا۔ ہم لوگ اندر داخل ہو گئے۔ اندر ایک لمبی راہ داری تھی جس کے ذریعے ہمیں ایک ہال میں پہنچا دیا گیا۔

”مل گئے..... مل گئے یہ دونوں۔“ اُن میں سے ایک شخص نے کہا۔

”ہاں مہاراج! پاپی دھوکہ دے رہے تھے ہمیں۔“ اُسی دراز قامت شخص نے ہماری گرفتاری کا سبب بنا تھا۔

”بند کر دو انہیں۔ لے جاؤ.....“ وہ شخص دانت پیس کر بولا۔ اور وہ لوگ ہمیں لے گئے۔

ہمیں ایک مخصوص کمرے میں پہنچ کر چند سیڑھیاں نیچے اترنا پڑا۔ یہ غالباً بڑا بڑا خانہ تھا۔ ہمیں اس میں بند کر کے وہ خاموشی سے واپس چلے گئے۔ پدما کے ہاتھ چن

”تمہارا کیا خیال ہے؟“

”تم سے جو کچھ پوچھ رہا ہوں، اُس کا جواب دو۔ میں جواب نہ دینے والے کی نہیں کھینچ کر اُس کے ہاتھ پر رکھ دیا کرتا ہوں۔“

”تمہارا اپنا نام کیا ہے؟“ میں نے بھی غرائے ہوئے انداز میں پوچھا۔

”تم مجھے نہیں جانتے؟“

”نہیں.....“

”بکواس کرتے ہو۔“

”جو کچھ بھی کہہ رہا ہوں، اُس کا وہی مقصد ہے۔ اگر تم زیادہ تیس مار خان ہو تو اطمینان رکھو۔ آسانی سے مجھ پر قابو نہیں پاسکو گے۔“ مجھے بھی غصہ آ گیا تھا۔

وہ خونی نگاہوں سے مجھے گھورتا رہا۔ پھر پدما کی طرف متوجہ ہو گیا۔ ”اور کماری؟“

آپ.....؟ آپ اپنے بارے میں کیا کہتی ہیں؟“

پدما خاموش رہی۔ اُس کے چہرے پر کوئی تاثر نہیں اُبھرا تھا۔ پھر اُس نے طمّ القامت آدمی کی طرف رخ کر کے کہا۔ ”جاؤ..... اُن دونوں کو بھی لے آؤ۔“

دو آدمیوں نے ہمیں ایک دیوار کے ساتھ کھڑا ہونے کے لئے کہا تھا۔ زیادہ دیر نہ گزری تھی کہ چند اور افراد اندر داخل ہوئے۔ اُن میں دو چہرے دیکھ کر میں اور ہر

ششدر رہ گئے۔ اُن میں ایک میرا ہم شکل تھا اور دوسری بالکل پدما تھی۔ میرا ہم شکل ہر ٹوٹا پھوٹا نظر آ رہا تھا۔ اُس کی پیشانی پر زخم کا نشان تھا۔ لباس بوسیدہ اور میلا کچلا تھا۔

پر جا بجا خون کے دھبے نظر آ رہے تھے۔ مجھے یہ جاننے میں دقت نہیں ہوئی کہ وہ اصل رنجیت کمار ہے۔ اُن دونوں کو بھی ہمارے برابر کھڑا کر دیا گیا۔ لیکن میری شکل دیکھنے

ٹھا کر رنجیت کمار بری طرح اُچھل پڑا۔ پھر اُس نے پدما کی طرف دیکھا اور دیکھائی دیا۔ اُس کے انداز میں بڑی عجیب سی کیفیت نظر آ رہی تھی۔ لیکن زبان سے اُس نے

کہا۔ زر نگار کرسی پر بیٹھا ہوا شخص جس کے بارے میں اب میں نے اندازہ لگا لیا تھا

ہریش چندر کے علاوہ کوئی نہیں ہے، اپنی جگہ سے اُٹھ کر ہمارے سامنے آ گیا۔ پھر چاروں کے سامنے ایک ایک منٹ تک رُک کر ہماری صورتیں دیکھتا رہا۔

”حیرت انگیز..... بہت عجیب.....“ وہ قبضہ مار کر ہنس پڑا۔ پھر میری طرف رخ کر کے

کہا۔ ”جانتے ہو، کون ہو تم ٹھا کر رنجیت کمار! اور تم..... تم بھی ٹھا کر رنجیت کمار ہو۔ اور لڑکی!

نہیں!“ اُس نے پدما کی ہم شکل لڑکی کی طرف رخ کر کے کہا۔ ”تم پدما ہو۔ اور تم بھی پدما

ہیں۔ یہی عجیب بات ہے۔ سنسار میں دو کردار ایک شکل کے، ایک نام کے یکجا ہو گئے ہیں۔

اور میرا نام سنو! میں ہریش چندر ہوں۔ دیوان ہریش چندر..... سمجھے تم لوگ۔ لوگوں کا خیال ہے کہ مجھے دھوکہ دینے والے کسی دوسرے کو دھوکہ دینے کے لئے زندہ نہیں رہتے۔ تم

میں سے کون زندگی چاہتا ہے اور کون موت؟“

”ہم چاروں ہی خاموش رہے۔ دیوان ہریش چندر میرے سامنے رُکا اور اُس نے

ابتداء سے کہا۔ ”تم بتاؤ..... تم..... تم کون ہو؟“

”میرا نام سندر لال کپور ہے۔“

”اور یہ لڑکی؟“

”اس کا نام شیتل ہے۔“

”ہوں.....“ وہ چند لمحے مجھے دیکھتا رہا اور اُس کے بعد وہ ٹھا کر رنجیت کمار کے پاس پہنچ

یا۔ ”اور تم..... تم کون ہو؟“

”میں سندر لال کپور ہوں اور میری ساتھی لڑکی شیتل۔“ ٹھا کر رنجیت کمار نے کہا اور ہم

نوں چونک پڑے۔

دیوان ہریش چندر چند قدم پیچھے ہٹا اور پھر طویل القامت آدمی کی طرف رخ کر کے

کہا۔ ”ٹھیک ہے۔ ان چاروں کو ایک جگہ بند کر دو۔ کل صبح کے بعد انہیں میرے سامنے

پیش کرو۔ میں دیکھوں گا کہ یہ کتنے پکے لوگ ہیں۔ اگر یہ اپنا اپنا نام اپنے منہ سے نہ

پاریں تو دیوان ہریش چندر اپنی ناک کاٹ کر ان کے سامنے پھینک دے گا۔“

ہمیں اُسی قید خانے میں لایا گیا تھا جہاں سے انہوں نے ابھی تھوڑی دیر پہلے نکالا تھا۔

قید خانے کا دروازہ بند ہوا تو ٹھا کر رنجیت کمار نے اپنی جگہ سے اُٹھ کر قید خانے کے ایک در

وازے میں اُسے معلومات حاصل تھیں۔ مشعل کی ملبگی روشنی پورے قید خانے میں پھیل گئی۔

ٹھا کر، پدما کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔ ”کماری پدما؟“ اُس نے سرسراتی آواز میں

”مجھے آپ میرے سوال کا جواب دیجئے۔ آپ یورپ سے یہاں کب پہنچیں؟“
”میں تمہارے کسی سوال کا جواب دینا پسند نہیں کرتی ٹھاکر! تم دھوکے باز ہو۔ مکار

”گدا! میں یہ تمام باتیں تسلیم کرتا ہوں مہارانی جی! مگر آپ کو چند باتیں تو بتانا ہی ہوں
نہ۔ یہ بتائیے کہ کس منصوبے کے تحت آپ اس شخص کو میرا ہم شکل بنا کر یہاں لائی ہیں؟“
”میں نے کہہ دیا کہ میں تمہارے کسی سوال کا جواب نہیں دوں گی۔“

”میں آپ کو مجبور کرنے کی جرات کر بھی نہیں سکتا۔ جو کام میں کر رہا ہوں، وہ کرتا
ہوں گا۔ ایک بات آپ کان کھول کر سن لیجئے! ہریش چندر آپ کو زندگی دینے کے لئے
نہ بلکہ موت دینے کے لئے گرفتار کر کے لایا ہے۔ جلد یا دیر سے وہ بالآخر ہم سب کو مار
لے گا۔ کیا یہ بہتر نہیں ہو گا کہ ہم اُس وقت تک ایک دوسرے سے تعاون کریں جب تک
ان ہریش چندر کی قید میں ہیں؟“

”پدما کی بجائے میں نے جواب دیا۔“ میں تمہاری اس تجویز سے متفق ہوں۔ بہتر ہے،
اتنا ماحول میں بات کریں۔“

”تم مجھے صورت ہی سے سلیقے کے آدمی معلوم ہوتے ہو۔ کماری پدما کا معاملہ دوسرا
ہے۔ ان کے اور میرے درمیان ایک ایسا چکر چل گیا تھا جس میں قصور میرا تھا نہ ان کا۔
میں کچھ مجبوریاں تھیں جن کی وجہ سے انہیں یہ احساس ہوا کہ میں نے انہیں دھوکہ دیا
ہے۔“

پدما نے اب بھی کوئی جواب نہیں دیا۔ میں نے ایک نظر اُسے دیکھا اور پھر بولا۔ ”تم
ہاں سے گرفتار ہوئے؟“

”بھائی! بڑی دلچسپ کہانی ہے۔ سونیا کے بارے میں، میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ یہ
میں دوست ہے اور مجھ سے پریم کرتی ہے۔ ہم دونوں ساتھ جیون گزارنے کا وعدہ کر چکے
ہیں۔ لیکن میں ابھی زندگی کے اس مسئلے سے گزر رہا ہوں، جس کی تکمیل کے بعد کچھ کر سکتا
ہوں۔ کوئی ڈیڑھ مہینہ پہلے ہریش چندر نے مجھے گرفتار کیا تھا اور میں اسی قید خانے میں اُس
کا قیدی تھا۔ تین چار دن پہلے میں نے ایک ترکیب لڑائی اور اُس کے چنگل سے نکل بھاگا۔
پہاں سے زیادہ دُور نکلنے کا موقع نہیں مل سکا۔ ہم لوگ گولہ پور کے پہاڑوں میں چھپے

کہا۔ لیکن پدما خاموش رہی۔ وہ جاننا چاہتی تھی کہ میرا اس معاملے میں کیا رد عمل ہوگا
ہے۔ میری اجازت کے بغیر وہ کچھ نہیں بول سکتی تھی۔

”تم خاموش کیوں ہو کماری پدما؟ میں رنجیت کمار.....“
”بہتر ہے کہ اسے خاموش رہنے دو اور مجھ سے گفتگو کرو۔“ میں نے بھرائے ہوئے
لہجے میں کہا اور ٹھاکر رنجیت کمار میری جانب متوجہ ہو گیا۔

”یہ بات تو میں مان سکتا ہوں دوست! کہ یہ راج کماری پدما ہیں۔ لیکن تم کون ہو؟ اور
تم ٹھاکر رنجیت کمار کیسے بن گئے؟ یہ میرے پلے نہیں پڑا۔“ وہ آہستہ سے ہنسا اور بولا۔
”بڑی دلچسپ بات ہے۔ ہم دونوں میں سے ایک اصلی ہے اور ایک نقلی۔ یعنی میں اصل
اور تم نقل۔ اور تمہاری ساتھی کماری پدما اصل اور میری ساتھی یہ لڑکی نقل..... بڑا دلچسپ
اتفاق ہے۔ کیا تم اس اتفاق پر مسکراؤ گے بھی نہیں؟“

”اطمینان سے مسکراؤں گا ٹھاکر! پہلے تم سے سوالات کرنے ہیں۔ اُن کے جواب دو۔
دو تو میرا خیال ہے ہمارا وقت مسکراہٹوں ہی میں گزرے گا۔“

”ہوں..... بیٹھ جاؤ۔“ ٹھاکر رنجیت کمار نے کہا۔ میں اور پدما بیٹھ گئے۔ وہ بھی ہمارے
سامنے بیٹھ گئے تھے۔ رنجیت کمار کی ساتھی لڑکی بیزار بیزار سی نظر آ رہی تھی۔ ویسے وہ
حیرت انگیز طور پر پدما کی ہم شکل تھی۔

ٹھاکر چند لمحے خاموش رہا۔ پھر بولا۔ ”میں تو یہ بات تسلیم کرتا ہوں کہ میں ٹھاکر رنجیت
کمار ہوں اور کماری پدما مجھے اچھی طرح جانتی ہیں۔ یہ لڑکی جو میرے ساتھ ہے، اُس
اصل نام سونیا ہے اور یہ میری دوست ہے۔ بلکہ میں نے انتہائی مہارت سے اس کا
بدلا ہے۔ تم یہ بتاؤ کہ کیا تمہارے چہرے پر بھی میک اپ ہے؟“

”نہیں..... یہ میری اصل شکل ہے۔“
”اور تمہارا نام؟“

”بتا چکا ہوں، سندر لال کپور۔“
”میرے اتنے ہم شکل کیوں ہیں؟“
”یہ نہیں معلوم۔“ میں نے بے اختیار مسکرا کر کہا۔
”دیکھو دوست! بہتر یہ ہے کہ ہم دوستانہ ماحول ہی میں گفتگو کریں۔ کماری پدما

ہوئے تھے کہ کم بخت کے آدمی ہم تک پہنچ گئے اور ہمیں گرفتار کر لیا گیا۔ اگر مجھے ایک بھی اور مل جاتا تو ہریش چندر کے فرشتے بھی مجھے تلاش نہیں کر سکتے تھے۔ لیکن میرے ہوں کہ میری یہ گرفتاری میرے لئے بڑی کارآمد ہے۔ کیونکہ میری ملاقات کماری پدما ہو گئی۔“

”اور زخموں کے یہ نشانات؟“

”انہی کم بختوں کے لگائے ہوئے ہیں۔“

”کیوں؟“

”کچھ معلومات حاصل کر رہے تھے مجھ سے۔“

”کیا معلومات؟“

”کماری پدما! آپ بالکل خاموش ہیں۔ کیا آپ نے رنجیت کمار کو ساری صورت

نہیں بتائی؟“

”ٹھا کر! میں تم سے بات کرنا بھی پسند نہیں کرتی۔ تم دغا باز، دھوکے باز اور کمینے والا

ہو۔“

”کماری جی! جو کچھ بھی کہہ لیں، میں سننے کو تیار ہوں۔ لیکن حقیقی بات یہ ہے کہ اگر

جنم کنڈلی لے کر وہاں سے فرار نہ ہو جاتا تو مجھے اور آپ کو قتل کر دیا جاتا۔ ہم پرانے

میں تھے۔ میں اُن لوگوں کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ مجبوراً مجھے وہاں سے بھاگنا پڑا۔ اور

یقین کریں کہ اس جنم کنڈلی ہی کی وجہ سے آپ بھی زندہ ہیں۔ اگر وہ جنم کنڈلی

انگریزوں کے ہاتھ لگ جاتی تو آپ کی ضرورت انہیں باقی نہ رہتی۔ ایک طرح سے

نے آپ سے برائی مول لے کر آپ کا جیون بچایا ہے۔“

”تم اتنے دغا باز ہو کہ میں تمہاری کسی بات کا یقین نہیں کر سکتی۔“

”آنے والا ہے آپ کو اس بات کا پورا پورا یقین دلادے گا۔ ویسے سندر لال

میں آپ سے ایک بات کہوں، ہریش چندر بڑا ہی کینہ پرور انسان ہے۔ یہ جو کچھ کہتا

اُس کے بارے میں آپ یا کماری پدما نہیں جانتے۔ اگر ہم اس کے قیدی رہے تو

لیں کہ نہ تو ہم زندہ رہیں گے اور نہ کماری پدما اپنا مقصد پاسکیں گی۔“

”تم مجھے ساری تفصیلات بتاؤ تو میں اس سلسلے میں اپنی رائے کا اظہار کروں۔“

”ایک ایک بات بتا دوں گا آپ کو۔ لیکن شرط یہ ہے کہ پہلے ہم یہاں سے نکل جائیں۔ آپ کیا سمجھتے ہیں؟ کیا ہماری زندگی طویل ہے؟ میں دعوے سے کہہ سکتا کہ اب چونکہ کماری پدما اُس کے ہاتھ لگ گئی ہیں اس لئے وہ ہم میں سے کسی کو زندہ نہیں چھوڑے گا۔“

”تم یہاں سے کیسے نکل بھاگے تھے؟“

”میں نے ایک آدمی کو پھانس لیا ہے۔ اور مجھے یقین ہے کہ میرے اس فرار کے سلسلے

میں اُس کا نام کبھی نہیں آیا ہوگا۔ البتہ اب یہ لوگ مجھ سے پوچھیں گے کہ میں یہاں سے

کیسے بھاگا؟ میں اُس کا نام نہیں بتاؤں گا اور کوشش کروں گا کہ دوبارہ اُسے اپنے لئے تیار

کر لوں۔ اس بار ہم ذرا مختلف انداز میں کام کریں گے۔ آپ سے ایک بات میں صاف

صاف کہے دیتا ہوں کہ آپ نے اگر میری بات نہ مانی اور یہاں رُکے رہنے پر ضد کی تو نہ

صرف اپنے دشمن بنیں گے بلکہ کماری پدما کے بھی۔ اس لئے بہتر یہ ہے کہ آپ مجھ سے

تعاون کریں اور یہاں سے فرار ہو جائیں۔“

میں نے پدما کی طرف دیکھا۔ وہ سپاٹ نگاہوں سے سامنے دیکھ رہی تھی۔ گویا اُس نے

فیصلہ مجھ پر ہی چھوڑ دیا تھا۔ رنجیت کمار کی بات میری سمجھ میں تو نہیں آئی۔ لیکن ہو سکتا ہے وہ

جو کچھ کہہ رہا ہو، سچ کہہ رہا ہو۔ ہریش چندر اگر ہماری جان کا دشمن ہے تو پھر مسئلہ گڑبڑ ہو

جائے گا۔ بہر طور! میں نے اس سلسلے میں پدما سے مشورہ کرنے کا فیصلہ کر لیا اور ٹھا کر سے

کہا۔

”میں پدما کی مرضی کے بغیر کچھ کرنے کو تیار نہیں ہوں۔ تم وہ گوشہ اپنا لو اور اس گوشے

میں ہمیں رہنے دو۔ ہم لوگ آپس میں صلاح مشورہ کریں گے اور اس کے بعد فیصلہ کر سکیں

گے۔“

”مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں۔“ ٹھا کر نے جواب دیا اور میں پدما کے ساتھ تہہ خانے

کے دوسرے گوشے میں چلا گیا۔ پدما دیوار سے ٹیک لگا کر نیم دراز ہو گئی۔ میں اُس کے

نزدیک ہی بیٹھ گیا تھا جبکہ اصل ٹھا کر رنجیت کمار، پدما کی ہم شکل لڑکی سونیا کے ساتھ

”دوسرے گوشے میں بیٹھا ہماری طرف دیکھ رہا تھا۔“

”کیا خیال ہے؟ کیا کہتی ہو تم اس شرط کے بارے میں؟“ میں نے پدما سے پوچھا۔

”میرا تو دماغ ماؤف ہو گیا ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں؟“
 ”اگر ہریش چندر ہمیں قتل کرنا چاہتا ہے تو میرا خیال ہے پدما! ہمارے پاس پتہ ہے۔
 کوئی ذریعہ نہیں ہے۔“
 ”میں بھی یہی سوچ رہی ہوں کہ ہریش چندر سے بات کر کے یہ کیسے پتہ لگایا جائے۔
 وہ ہم سے کیا چاہتا ہے؟“

”واقعی معاملہ بے حد الجھا ہوا ہے۔ بہر طور! دیکھ لیتے ہیں۔ ابھی جلدی کیا ہے؟ جبر
 بھی صورت حال ہوئی، اُس کے مطابق کریں گے۔“
 میں نے ٹھا کر کو اس وقت کچھ نہیں بتایا۔ وہ بھی غالباً سونے کے لئے لیٹ گیا تھا۔ پدما
 میرے قریب ہی دراز ہو گئی تھی۔ تھوڑی دیر بعد وہ بھی گہری نیند سو گئی۔ البتہ میں جاگ رہا
 تھا اور دل ہی دل میں راعمیس کو کوس رہا تھا۔ میں نے اُسے بارہا پکارا لیکن اُس کی آواز
 میرے کانوں میں نہ گونجی۔ اس وقت مجھے اُس کی شدید ضرورت تھی۔ تاکہ اور کچھ نہیں تو
 از کم کوئی صحیح فیصلہ ہی اُس کے مشورے سے کر سکوں۔

☆.....☆.....☆

دوسری صبح ہم جاگے تو ہمارے بدن بھوک سے نڈھال تھے۔ لیکن اس وقت ہمارے
 ساتھ مہربانی کی گئی۔ صبح کا ناشتہ بہت شاندار تھا۔ تمام کسر پوری کر دی گئی تھی۔ ہم چاروں
 ہی آمنے سامنے بیٹھ گئے۔
 ”ٹھا کر ناشتے کے بعد بولا۔“ کوئی نہ کوئی فیصلہ کر لیا ہو گا تم نے.....“
 ”کماری پدما کا کہنا ہے کہ وہ تم پر بالکل بھروسہ نہیں کر سکتیں۔“
 ”تو ٹھیک ہے۔ ہمارا تو جو کچھ ہو گا، لیکن میں ایک بات صاف کہے دے رہا ہوں۔
 اب اگر میری ملاقات ہریش چندر سے ہوئی تو میں صاف کہہ دوں گا کہ یہ کماری پدما ہیں۔
 سونیا کی اصل شکل انہیں دکھا دوں گا تو صورت حال واضح ہو جائے گی۔ تم مجھے اس سے نہیں
 روک سکتے۔“

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ناشتے سے فارغ ہوئے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ بہت
 سے سپاہی اندر داخل ہو گئے اور انہوں نے ہم سے چلنے کے لئے کہا۔ تھوڑی دیر بعد ہم پھر
 کل والے کمرے میں موجود تھے۔

دیوان ہریش ہمیں دیکھ کر مسکرایا۔ اور پھر رنجیت کمار کی طرف رخ کر کے بولا۔
 ”ٹھا کر! یہ بات تو میری سمجھ میں آ گئی ہے کہ اصل ٹھا کر رنجیت کمار تم ہو۔ لیکن ان دونوں
 کے درمیان فیصلہ کرنا باقی ہے۔ ان میں سے اصل کماری پدما کون ہے؟“
 ”تم یہ کیسے کہہ سکتے ہو کہ اصل ٹھا کر میں ہوں؟“

”بڑی معمولی بات ہے۔ تمہارے جسم پر زخموں کے نشانات ہیں جو ہمارے لگائے
 ہوئے ہیں اور اس آدمی کے بدن یا چہرے پر ایک بھی زخم نہیں ہے۔ اس سے بڑا ثبوت اور
 کیا ہو سکتا ہے؟“

رنجیت کمار دانت پیس کر خاموش ہو گیا۔ تب ہریش چندر نے پدما اور سونیا کو اپنے

ہریش چندر نے پدما کے حصول کے لئے وسنت سنگھ کو جتنی بڑی رقم کی پیشکش کی تھی، اُس کے بعد ہماری دستیابی اُس کے لئے بڑی اہم ثابت ہوگی۔ لیکن یوں لگتا ہے کہ رنجیت کمار نے یہاں آکر سارا کھیل خراب کر دیا ہے۔ ویسے یہ بھی سوچنا ہے کہ رنجیت کمار اُس لڑکی کو پدما بنا کر یہاں کیوں لایا ہے؟“

”وہ بہت گہرا آدمی ہے۔ میں خود اُس سے دھوکہ کھا چکی ہوں۔ میں نے تمہیں بتایا تھا کہ وہ میری جنم کنڈلی لے کر فرار ہو گیا تھا اور اُس کے بعد مجھے اُس کا پتہ نہیں چل سکا۔ جب کہ اس سے پہلے نہ جانے اُس نے مجھے کیسی کیسی باتیں کہی تھیں۔ بیچارہ ہیل کیر و سا اور اُس کی بہن بھی اسی چکر میں ماری گئی۔“

”خیر! پرانی باتیں دہرانے سے کچھ نہیں حاصل ہوگا۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اب کیا، کیا جائے؟“

”فی الحال تو ہم قیدی ہیں۔ ہریش چندر سے اگر براہ راست بات چیت کی جائے اور یہ تمام باتیں اُس پر ظاہر کر دی جائیں تو اُس کے نتائج کیا ہوں گے؟ اس کا بھی کوئی اندازہ نہیں لگایا جاسکتا۔ مجھے تو یوں لگتا ہے منصور! جیسے میں تمام زندگی ایسے ہی رہوں گی اور اپنے بارے میں کبھی نہیں جان سکوں گی۔ پتہ نہیں دل میں کیسے کیسے خیالات آتے ہیں۔ کبھی کبھی سوچتی ہوں کہ..... کہ.....“

پدما جملہ ادھورا چھوڑ کر خاموش ہو گئی۔ اس کے بعد اُس نے کوئی بات نہیں کی تھی۔ میں بھی خیالات میں ڈوب گیا تھا۔ رہ رہ کر راعمیس کا خیال آ جاتا تھا اور میں سوچتا تھا کہ اگر وہ ہوتا تو ممکن ہے اس سلسلے میں کوئی مدد کر سکتا۔ بہر طور! جو نہیں تھا اُس کے بارے میں سوچ کر خواہ مخواہ اپنے ذہن کو تھکانے سے کیا فائدہ؟“

صبح ہو گئی اور پھر پورا دن گزر گیا۔ اس دوران کوئی خاص بات نہیں ہوئی تھی۔ ہمارے لئے کھانا برابر آتا رہا۔ رات ایک بار پھر دیوان ہریش چندر کی طرف سے بلاوا آیا۔ لیکن اس بار ہم دونوں کو بلایا گیا تھا۔ ہم دیوان ہریش چندر کے پاس پہنچ گئے۔ وہ اس بار ایک اور نشست گاہ میں بیٹھا تھا اور اُس کے چہرے پر شدید جھنجھلاہٹ کے آثار تھے۔

”تم لوگوں نے آپس میں کوئی فیصلہ کر لیا ہوگا۔ میں کب تک تمہارا انتظار کروں؟ بالآخر مجبور ہو جاؤں گا تو تم سب کو قتل کر دوں گا۔ تاکہ نہ رہے بانس نہ بجے بانسری۔“

سامنے بلایا اور پھر آہستہ سے بولا۔ ”بہتر یہ ہے کہ تم لوگ مجھے خود ہی بتا دو کہ اصل کمار کون ہے؟ تاکہ میں کام کی بات کر سکوں۔“

پدما نے کہا۔ ”اصل پدما میں ہوں۔“

اس کے ساتھ ہی سونیا بول پڑی۔ ”نہیں! یہ جھوٹ کہتی ہے۔ اصل پدما میں ہوں۔“

ٹھا کر رنجیت کمار کے چہرے پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ حالانکہ اُس نے مجھے دھمکی دی تھی کہ وہ اصل کمار پدما کا حوالہ دے دے گا۔ لیکن اُس وقت اُس کی ساتھی سونیا نے اُس کی یہ بات غلط ثابت کر دی تھی۔ اُس کے چہرے کی مسکراہٹ یہ بتاتی تھی کہ یہ تمام منصوبہ اسی کا ہے۔

”دیکھو! تم دونوں سن لو کہ تم میں سے جو کمار پدما ہے، اُس کی زندگی ممکن نہیں ہے۔ اگر میں چاہوں تو تم دونوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے بھوکے کتوں کے سامنے ڈال دوں۔ اگر یہ مجھے پتہ چل جائے کہ تم میں سے اصل کون ہے تو ہو سکتا ہے کہ تم سے کام کی بات کر کے تمہاری زندگی بخش دوں۔ بہتر یہی ہے کہ تم دونوں آپس میں فیصلہ کر لو اور مجھے صورت حال سے آگاہ کر دو۔“

”میں تم سے کہہ چکی ہوں کہ اصل پدما میں ہوں۔“ سونیا نے کہا۔

”نہیں..... اصل پدما میں ہوں۔“ سونیا کے بعد پدما نے کہا اور ہریش چندر پریشان نگاہوں سے ان دونوں کو دیکھنے لگا۔

”ٹھیک ہے۔ تھوڑا سا انتظار کر لو۔ میں نے تو چاہا تھا کہ تم سے سودے بازی کر لی جائے اور تمہارا کام بھی بن جائے۔ لیکن تم دونوں موت کو گلے لگانے کے لئے تیار ہو تو پھر میرا کیا دوش؟ جاؤ..... انہیں لے جاؤ اور بند کر دو۔ شام کو ہم ان کا فیصلہ کر دیں گے۔“

ہمیں دوبارہ اُسی قید خانے میں پہنچا دیا گیا۔ ماحول میں گھٹن سی تھی۔ پدما منڈھال ہو کر میرے قریب بیٹھ گئی تھی۔ ”یہ تو واقعی زندگی کا عذاب ہو گیا۔ پتہ نہیں تقدیر میں کیا لکھا ہے؟ ہریش چندر سے ملاقات کے سلسلے میں یہ سوچا تھا کہ شاید اُس کے قبضے میں جانے سے کوئی کام کی بات معلوم ہو سکے۔ لیکن اس کی زبان کچھ اور ہی ہے۔ کیا ہم نے یہاں آکر غلطی کی ہے منصور؟“

”سمجھ میں نہیں آتا پدما! اتنا فاصلہ طے کرنے کے بعد ہم یہاں پہنچے۔ خیال یہی تھا کہ

پدما نے ہریش چندر کی طرف دیکھا اور بولی۔ ”دیوان ہریش چندر! اگر تم یہ بتانا پسند کرو کہ تمہارا مقصد کیا ہے تو ہو سکتا ہے ہم تمہاری مدد کریں۔“

”پہلے تم مجھے یہ یقین دلادو کہ تم اصل پدما ہو؟“

”ہاں..... میں اصل پدما ہوں۔“ پدما نے غالباً اپنے طور پر کوئی فیصلہ کر لیا تھا۔

”تمہارے یہ الفاظ کافی نہیں ہیں۔ اگر تم اصل پدما ہو تو وہ لڑکی کون ہے؟“

”یہ جاننا تمہارا کام ہے ہریش چندر! لیکن میں تم سے دو ٹوک بات کرنا چاہتی ہوں۔

مجھے بتاؤ! میں کون ہوں؟ میرے ماتا پتا کون ہیں؟ میں نے گوپال سانگا کے ہاں پرورش

کیوں پائی؟ مجھے یہاں سے اغواء کیوں کیا گیا؟ یہ ساری باتیں اگر تم مجھے بتا سکتے ہو تو بتا

دو۔ اس کے بدلے تم جو کچھ کہو گے، میں تمہیں دینے کے لئے تیار ہوں۔“

ہریش چندر طنز یہ انداز میں ہنسنے لگا۔ ”یہ تمام باتیں تو مجھ سے وہ لڑکی بھی کر چکی ہے جو

رنجیت کمار کے ساتھ ہے۔ تم مجھ سے جنم کنڈلی کی بات کرو۔ تمہاری جنم کنڈلی کہاں ہے؟“

”وہ ٹھا کر رنجیت کمار کے پاس ہے۔“ پدما نے جواب دیا اور ہریش چندر میری طرف

متوجہ ہو گیا۔

”کیوں ٹھا کر! تم کیا کہتے ہو اس بارے میں؟“

”بھائی میں تم سے پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ میرا نام رنجیت کمار نہیں، سندر لال ہے۔ اور

میرا ان واقعات سے صرف اتنا ہی تعلق ہے کہ میں کمار پدما کے باڈی گارڈ کی حیثیت

رکھتا ہوں۔“

”تم سب فریب کر رہے ہو۔ لیکن میں تمہارے فریب کا پردہ چاک کر دوں گا۔ آخری

بار تم سے کہہ رہا ہوں کہ جنم کنڈلی میرے حوالے کر دو۔ اور ساتھ ہی اصل پدما بھی۔ ورنہ تم

لوگوں کے حق میں بہتر نہیں ہو گا۔ میں نے تمہیں اس وقت اسی لئے تکلیف دی تھی۔ میں

چاہتا ہوں کہ میرے ہاتھوں تمہارے ساتھ کوئی سخت سلوک نہ ہو۔ لیکن شرط یہی ہے کہ تم

اس سلسلے میں خود بھی مجھ سے تعاون کرو۔“

اُس نے ایک بار پھر ہمیں قید خانے بھیجنے کا حکم دے دیا۔ رنجیت کمار اور سونیا بالکل

مطمئن تھے۔ انہیں ذرا بھی تشویش نہیں تھی کہ ہمارے ہریش چندر کے پاس جانے سے اُن

پر کوئی اثر پڑ سکتا ہے۔ میں نے اس بات کو خاص طور پر نوٹ کیا تھا۔ رنجیت کمار نے مجھ سے

اب بھی سوال نہیں کیا۔

پدما کہنے لگی۔ ”یہ بہت مطمئن معلوم ہوتا ہے۔ کیا خیال ہے؟ اس سلسلے میں ہمارے

ہاتھوں میں تو کوئی بات نہیں رہی۔ غالباً اُس نے کچھ اس طرح کی کارروائیاں کی ہیں کہ

ہریش چندر بالکل بوکھلا کر رہ گیا ہے۔ میرے انکشافات بھی اُس کے لئے حیرت انگیز نہیں

تھے۔“

میں تو سوچ رہا ہوں کہ اس وقت رنجیت کمار ہی سے تعاون کیا جائے۔ ہریش چندر تو

اپنی طور پر دیوالیہ ہو چکا ہے۔ تمہاری مشکلوں کا حل اسی شخص کے پاس ہے۔“

”خود میرا بھی یہی خیال ہے۔“ پدما نے جواب دیا۔

”میں جانتا ہوں کہ ہریش چندر نے تم لوگوں سے کیا سوالات کئے ہوں گے اور تم نے

اس کا بھی اندازہ لگا لیا ہو گا کہ ہم سے الگ ہٹ کر بھی تم اُسے اپنے آپ سے متاثر نہیں کر

سکتے۔ بہتر یہ نہیں ہو گا کمار پدما! کہ آپ میرے ساتھ ہی تعاون کریں۔ اس کے باوجود

میری طرف سے اجازت ہے کہ اگر آپ اپنے طور پر کچھ کرنا چاہیں تو کر سکتی ہیں۔ لیکن اگر

مجھ سے تعاون کے بارے میں فیصلہ کر لیں تو پھر میرا ساتھ دیں۔“

”رنجیت کمار! جب تک تم مجھے جنم کنڈلی کے بارے میں نہیں بتاؤ گے، میں تم سے کوئی

تعاون نہیں کروں گی۔ تمہیں اندازہ ہے کہ تم نے میرے اعتماد کو دھوکہ دیا تھا۔“

”بہت سے اندازے آپ نے میرے بارے میں قائم کئے ہوں گے کمار پدما! اور

بہت سے میں نے دوسروں کے بارے میں کئے تھے۔ بد قسمتی تو یہی ہے کہ جنم کنڈلی میرے

ہاتھ سے نکل گئی۔ اگر وہ میرے پاس ہوتی تو شاید اس وقت تک میں اپنے مقصد کی تکمیل کر

چکا ہوتا۔ وہ کرنل جیمز کے ہاتھوں نے اڑالی تھی۔“

”تم بکواس کرتے ہو۔ کرنل جیمز اتنا بے وقوف نہیں معلوم ہوتا کہ جنم کنڈلی کے حصول

کے بعد بھی وہ کوئی کارروائی کرتا۔ اُس نے مجھ سے یہی کہا ہے کہ جنم کنڈلی اُس کے پاس

نہیں ہے۔“

”بکواس کرتا ہے۔ اُس کا پلان کچھ اور ہو گا۔ بہر طور! میں آپ کو کیسے اطمینان

دلاؤں؟ یہ میرے بس کی بات نہیں ہے۔“

”تم نے سونیا کو پدما کیوں بنا ڈالا؟“

”میں نہیں جانتا تھا کہ جنم کنڈلی ہریش چندر تک پہنچی ہے یا نہیں اور ہریش چندر نے آنے کے لئے پدما کا سہارا ضروری تھا۔ یہاں آکر مجھے اس بات کا یقین ہو گیا کہ جنم کنڈلی اس کے پاس بھی نہیں ہے۔ اور وہ بھی اسی لئے بھٹک رہا ہے۔“

”تو پھر اب کیا کرنا ہے؟“

”فی الحال کچھ نہیں کیا جاسکتا۔ آپ مجھ سے تعاون کریں تو میں آگے قدم بڑھاؤں۔ میرے ساتھ تو یہ مشکل ہے کہ جب جنم کنڈلی میرے پاس تھی تو آپ نہیں تھیں۔ اور اب آپ میرے پاس ہیں تو جنم کنڈلی نہیں ہے۔ تاہم! میرے پاس کچھ ایسے ثبوت موجود ہیں جن کے ذریعے میں وہ کام کر سکتا ہوں جو آپ کے بس کی بات نہیں۔“

”اس کے لئے تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟“ پدما نے پوچھا۔

”تعاون..... مکمل تعاون۔“

”لیکن اس قید خانے میں تم سے تعاون کرنا بھی تو بے معنی ہے۔“

”میں نے کہا نا، ہم انتظار کر رہے ہیں۔ اگر آپ ہمارا ساتھ دینے کے لئے تیار ہوں تو ہم لوگ ساتھ ہی یہاں سے نکل جائیں گے۔ اس بات پر آپ بھروسہ رکھیں کہ ہمارا یہاں بال بیکا بھی نہیں ہوگا۔ ہریش چندر کسی قیمت پر ہمیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ کیونکہ اس میں خود اس کا بھی نقصان ہے۔ باقی رہا یہاں سے نکلنے کا مسئلہ تو میں مطمئن ہوں۔ وہ شخص آج نہیں تو کل میرے پاس آئے گا جس نے مجھے پہلے فرار کرایا تھا۔“

پدما گردن جھکا کر کچھ سوچنے لگی۔ مجھ سے مشورہ تو ہو ہی چکا تھا اور اب اس سلسلہ میں مزید کوئی بات نہیں رہ گئی تھی۔ چنانچہ اس نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ ”ٹھیک ہے۔ میں اپنے بارے میں جاننا چاہتی ہوں۔ اس سے زیادہ میری اور کوئی خواہش نہیں ہے ٹھاکرا اس لئے اگر تم اس بات کا وعدہ کرو کہ یہاں سے نکلنے کے بعد میرے تعاون سے تم اپنے مقصد حل کر کے مجھے میری منزل تک پہنچا دو گے تو میں تمہارے ساتھ ہر طرح کا تعاون کرنے کے لئے تیار ہوں۔“

”یہ پیش کش تو میں نے پہلے ہی آپ کو کی تھی۔ اگر اس وقت آپ اس کے لئے تیار ہوتے جاتیں تو میرا خیال ہے، درمیان کے لوگ ہمارے راستے نہیں کاٹ سکتے تھے۔ اس وقت آپ نے ایک بے مقصد ضد کی تھی۔“

”ٹھیک ہے۔ اس وقت کی بات اس وقت رہی۔ اب جو کچھ میں کہہ رہی ہوں، اس بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟“

”بالکل ٹھیک ہے۔ آپ اطمینان سے ہمارے ساتھ رہیں۔ میں جب ایک بات بولے سے کہہ رہا ہوں تو آپ کو بھروسہ رکھنا چاہئے۔“

اس کے بعد ہمارے درمیان تعاون رہا تھا۔ اور ہم سب یکجا ہو گئے تھے۔ سونیا عموماً ہاموش رہتی تھی۔ کم گوڑ کی تھی۔ کسی قدر سنجیدہ بھی۔ بعض اوقات یوں محسوس ہوتا تھا جیسے ان تمام معاملات سے وہ بری طرح اکتائی ہوئی ہے۔ لیکن زبان سے کچھ نہیں کہتی تھی۔

مزید دو دن گزر گئے۔ تیسری رات ہمارے لئے جو شخص کھانا لایا، وہ اجنبی تھا اور تنہا ہی تھا۔ اندر داخل ہونے کے بعد اس نے جلدی سے کھانے کے برتن رکھے اور رنجیت کمار کے پاس پہنچ گیا۔ ”اوہ ٹھا کر..... ٹھا کر! میں یہاں موجود نہیں تھا۔ میں دیوان جی کے کام سے نہیں گیا ہوا تھا۔ یہاں آکر معلوم ہوا کہ تم دوبارہ..... دوبارہ.....“

”ہاں! بس ایسا ہی ہوا ہے۔ بد قسمتی مجھے دوبارہ ان کے چنگل میں لے آئی۔ میں زیادہ دور نہیں نکل سکا تھا اور اس کی بنیادی وجہ ایک غلطی تھی۔“

”کیا؟“ اجنبی نے پوچھا۔

”ہمارے پاس گھوڑے نہیں تھے۔ اور ہم پیدل زیادہ دور تک نہیں نکل سکے تھے۔“ پہلی بار اجنبی نے میری طرف اور پھر پدما کی طرف دیکھا اور بری طرح اُچھل پڑا۔ ”یہ..... یہ دونوں کون ہیں؟“

”ہمارے ہم شکل۔“

”یہ کہاں سے آئے؟“

”بس! یہ بھی ہماری طرح پھنس گئے ہیں بے چارے۔ اب تم یہ بتاؤ کہ ہمارے فرار کے لئے مزید کیا کر سکتے ہو؟“

”میں صبح واپس آ گیا تھا اور آتے ہی مجھے پتہ چل گیا تھا کہ آپ دوبارہ ان کے قبضے میں آ گئے ہیں۔ آپ کا یہاں سے نکل جانا بے حد ضروری ہے۔ ورنہ یہ سب میرے لئے بڑی مصیبت کا باعث بن سکتا ہے۔ چنانچہ سارا دن میں اسی کوشش میں مصروف رہا ہوں کہ آپ کو اس طرح نکالوں کہ آپ دوبارہ ان کے ہتھے نہ چڑھ سکیں۔“

نہی۔ اور یہاں سے ہمیں دیوار عبور کرنی پڑی تھی۔ ونود ہمارے ساتھ ساتھ ہی تھا۔
 دوسری جانب چار گھوڑے موجود تھے جن پر زینیں کسی ہوئی تھیں۔ ونود نے ہمیں
 ذی بار پر نام کیا اور اُس کے بعد ہم نے گھوڑوں کو ایڑ لگا دی.....

یہ کام اتنا آسان ہوگا، میرے تصور میں بھی نہیں تھا۔ لیکن بہر طور! اب اس سلسلے میں
 دشید بے معنی تھی۔ چنانچہ ہم ٹھا کر رنجیت کی رہنمائی میں آگے بڑھتے رہے۔ تاریک
 چاروں طرف مسلط تھی۔ کتے بھونک رہے تھے۔ ہم اس طرح گھوڑے آگے بڑھا
 تھے کہ گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز بھی نہ سنائی دے۔ ویسے مضبوط اور توانا گھوڑے
 تھے۔ پدما سے میں نے گھڑ سواری کے بارے میں پوچھا تو اُس نے گردن ہلاتے ہوئے

”ہاں، ہاں! میں بہترین گھڑ سوار ہوں۔“

سونیا بھی بڑے آرام سے گھوڑے کی پشت پر بیٹھی ہوئی تھی۔ ہم بے آواز چلتے ہوئے
 آخری کے آخری سرے پر آ گئے۔ اور جب بستی کا آخری مکان بھی پیچھے رہ گیا تو رنجیت
 نے ہماری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”بس! اب تیز رفتاری ہی ہماری مشکل حل کر سکتی
 ہے۔“

ہم نے گھوڑوں کو ایڑ لگا دی۔ رنجیت کمار سب سے پیچھے تھا۔ اُس نے ایک سیدھ متعین
 کی تھی۔ چنانچہ عورتوں کی دونوں طرف سے حفاظت کی جا رہی تھی۔ میں آگے آگے اپنا
 نوڈا دوڑا رہا تھا اور اس کوشش میں تھا کہ ان لوگوں سے زیادہ دُور نہ نکلنے پاؤں۔

عجیب و غریب صورت حال تھی۔ کار تو چلائی تھی لیکن گھڑ سواری کی زیادہ مشق نہیں تھی۔
 اُس نے اپنے آپ کو گھوڑے کی پشت پر جمانے کے لئے بڑی محنت کرنا پڑ رہی تھی۔ ہم
 اپنے نیچے ٹیلے عبور کرتے رہے۔ کھائیوں میں بھی اُترنا پڑا اور گڑھوں میں سے بھی گزرنا
 پڑا۔ واقعی بڑا بولناک سفر تھا..... بعض جگہیں تو ایسی تھیں کہ گردن گھما کر دیکھتا تو دل کی
 حرکت بند ہونے لگتی تھی۔ ایک طرف بلند و بالا پہاڑ، دوسری طرف اتنی گہری کھائی کہ نیچے
 زمین نظر نہیں آتی تھی۔ اور دلچسپ بات یہ ہے کہ جس راستے پر گھوڑے دوڑ رہے تھے، وہ
 زیادہ سے زیادہ تین یا چار فٹ چوڑا تھا اور اُس کے کنارے بالکل سپاٹ تھے۔ گھوڑے کا
 کوئی بھی پاؤں غلط پڑتا تو وہ اپنے آپ کو سوار سمیت گہرائیوں میں گرنے سے نہیں روک

”میں جانتا تھا کہ تم کتنے سمجھ دار آدمی ہو۔“ ٹھا کر رنجیت کمار نے فخریہ انداز میں ہر
 طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ پھر بولا۔ ”لیکن اب تم نے یہ اندازہ لگا لیا ہوگا کہ فرار ہونے
 والے دو نہیں بلکہ چار آدمی ہیں۔“

”کاش! یہ بات مجھے پہلے سے معلوم ہوتی۔ لیکن آپ چتنا نہ کریں۔ ان لوگوں کے
 لئے بھی گھوڑوں کا بندوبست کر دیا جائے گا۔“

”تو پھر ہمیں کیا کرنا ہے ونود؟“
 ”آپ کو کچھ نہیں کرنا۔ آپ آرام سے یہاں بیٹھے رہئے۔ میں آپ کو وقت مقررہ پر
 کرا اطلاع کر دوں گا۔“

”چار گھوڑے تیار رکھنا۔ میرا خیال ہے اس بار ہم کسی دوسری طرف نکل جاتے ہیں۔
 ”ہاں مہاراج! بہتر تو یہ ہے کہ آپ اس بار تلخی نگر کی طرف چلے جائیں۔ تلخی نگر
 جانے والے راستے کی طرف اُن کی توجہ نہیں جائے گی۔ کیونکہ وہ بہت دُشوار گزار ہے اور
 پہاڑوں سے گزرتا ہے۔ کوئی بھی سمجھ دار آدمی اس طرف کا رخ نہیں کر سکتا۔“
 ”ٹھیک ہے۔ میں اسی طرف جاؤں گا۔“ ٹھا کر رنجیت کمار نے کہا۔

اس کے بعد ونود چلا گیا۔ رنجیت کمار مسکراتی نگاہوں سے میری طرف دیکھنے لگا۔ پھر
 بولا۔ ”تم نے دیکھا، جو کچھ میں نے کہا تھا وہ غلط نہیں تھا؟“

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ظاہر ہے ٹھا کر کے معاملات میری سمجھ سے باہر تھے
 رات کے تقریباً گیارہ بجے ہوں گے، جب ونود واپس آ گیا۔ اُس کے پاس کچھ سامان
 جو ایک پوٹلی میں بندھا ہوا تھا۔ وہ سامان اُس نے رنجیت کمار کو دیتے ہوئے کہا۔ ”آج
 مہاراج.....! سہے ہو چکا ہے.....“

”تمام کام ٹھیک کر لئے ہیں؟“
 ”بالکل! اس بار ونود دھوکہ نہیں کھائے گا۔“

ٹھا کرنے کچھ نہ کہا۔ سونیا اور پدما کھڑی ہو گئی تھیں۔ ہم چاروں قید خانے سے باہر
 آئے۔ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ لیکن قید خانے کے اس راستے کی جانب ہم نے سفر نہ کیا جہاں
 سے گزر کر ہم ابھی تک ہریش چندر کے پاس جاتے رہے تھے۔ بلکہ ونود ہمیں ساتھ
 ہوئے ایک بغلی راہ داری کی جانب چل پڑا تھا۔ یہ راہ داری باغ کے عقبی گوشے میں

سکتا تھا۔ میں خوف کی وجہ سے آنکھیں بند کئے گھوڑا دوڑا رہا تھا۔

خدا خدا کر کے یہ راستہ ختم ہوا اور اس کے بعد سپاٹ میدان آ گیا جس کے سرے پر درخت نظر آ رہے تھے۔ گویا اب جنگل شروع ہونے جا رہا تھا۔ ہم سپاٹ میں دوڑتے رہے۔ پھر درختوں میں داخل ہو گئے۔ جنگلوں کے درمیان گھوڑوں کا حد دشوار گزار تھا۔ میں نے گھوڑے کی رفتار ست کر لی۔ وہ سب میرے نزدیک تھے۔ میں نے ٹھا کر رنجیت کمار سے پوچھا۔

”جس طرف تم جا رہے ہو، کیا وہاں جانے کے لئے کوئی باقاعدہ راستہ نہیں ہے؟“
 ”اول تو باقاعدہ راستہ نہیں ہے۔ لیکن دوسری بات یہ ہے کہ میں اس طرف جا بھی رہا۔ ونود اکھ میرا وفادار سہی۔ لیکن مار کے آگے بھوت بھاگتا ہے۔ اگر کہیں ہریش چندر شہ ہو گیا کہ ہمارے فرار میں اُس کا ہاتھ ہے تو ظاہر ہے کسی نہ کسی طرح وہ یہ بات اُن کے لئے گا کہ ہم لوگ کہاں گئے ہیں۔ میں نے اس خطرے کو مد نظر رکھا ہے اور اُس طرف جا رہا ہوں۔ لیکن رنجیت کمار زمین پر ہی پڑا رہا۔ میں نے اُس کے بازو پر ہاتھ رکھا تو جا رہا، جدھر ونود نے کہا تھا۔“

میں نے رنجیت کی بات پر غور کیا تو مجھے اُس کی یہ دانش مندی پسند آئی۔ اور اُس کے بعد ہم جنگل میں آہستہ آہستہ آگے بڑھتے رہے۔ صبح کے وقت گھوڑے بالکل ہی تھک گئے۔ اُنہوں نے گھوڑے کی پشت چھوڑ دی۔ اُس کے نیچے اترتے ہی ہم سب بھی نیچے اتر آئے۔ میں نے کہا۔ ”ٹھا کر! کیا خیال ہے؟ قیام کے لئے یہ جگہ موزوں ہوگی؟“
 ”موزوں تو نہیں ہے۔ لیکن گھوڑے بری طرح تھک گئے ہیں۔ اگر ہم ایک دو گھنٹے سفر اور کر لیں تو ان پہاڑوں کو عبور کر کے ایک ایسے حصے میں جا نکلیں گے جہاں ایک پڑتی ہے۔ ندی کے کنارے درخت بھی ہیں۔ علاقہ بالکل سناں ہے اور آس پاس کسی گزرنے کا کوئی امکان نہیں ہے۔“

”تو پھر کیوں نہ گھوڑوں کا یہ سفر بھی کر لیا جائے تاکہ ندی کے قریب پہنچ کر آرام وقت گزارا جائے۔ ورنہ یہاں تھوڑی دیر کے بعد سورج سروں پر پہنچ جائے گا تو پہاڑ کی طرح تپنے لگیں گے۔“
 ”تم بالکل ٹھیک کہتے ہو۔ تمہیں راجپوتانہ کے بارے میں کیسے معلومات حاصل ہیں؟“
 ”کچھ نہیں۔ بس! یہاں کا ماحول دیکھ چکا ہوں۔“

نئی طرح پدما کو لے کر فرار ہو جائے۔ میں نے تیزی سے گھوم کر سونیا کو دیکھا۔ وہ بھی بیڈوں ہاتھ زمین پر ٹکائے بیٹھی تھی۔ اور اُس کا منہ حیرت سے کھلا ہوا تھا۔ میں آہستہ آہستہ اُس کے قریب پہنچ گیا۔

”سونیا! رنجیت، پدما کو لے گیا.....“ اُس کے منہ سے آواز نہ نکل سکی تھی۔ میں نے پھر کہا۔ ”اور اُس نے تینوں گھوڑے ہلاک کر دیئے تاکہ ہم اُس کا تعاقب نہ کر سکیں۔“ تب سونیا کی گردن گھومی اور اُس نے گھوڑوں کی لاشوں کو دیکھا۔ دوسرے لمحے وہ منہ پر ہاتھ رکھ کر رونے لگی تھی۔

”رونے سے کام نہیں چلے گا سونیا! وہ کہاں گیا؟ اور پدما کو کیوں لے گیا؟ کیا تم مجھے کچھ بتا سکتی ہو؟“

سونیا نے اب بھی میری بات کا جواب نہیں دیا۔ بس! وہ پھوٹ پھوٹ کر روتی رہی اور میں پاگلوں کے انداز میں ادھر ادھر ناچتا رہا۔ یہ سب کچھ میری توقع کے خلاف تھا۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ٹھاکر رنجیت کمار میرے ساتھ ایسا فریب کر سکتا ہے۔

میں نے اب کسی قدر غصیلی نگاہوں سے سونیا کی طرف دیکھا اور پھر غرائے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”آواز بند کرو..... یہ کیا اداکاری شروع کر رکھی ہے تم نے؟“

سونیا نے دونوں ہاتھ منہ پر سے ہٹائے اور شعلہ باز نگاہوں سے مجھے گھورنے لگی۔ ”تم دن بوتے ہو مجھ سے بکواس کرنے والے؟“ وہ جھلائے ہوئے انداز میں بولی۔

”وہ تمہارا ساتھی تھا.....“

”میں تم پر بھی لعنت بھیجتی ہوں اور اُس پر بھی۔“

”لعنت بھیجنے سے کام نہیں چلے گا سونیا! جس طرح وہ پدما کو نکال لے گیا ہے، اُسی طرح تمہیں بھی نقصان اٹھانا پڑے گا۔“

”میں..... میں کہتی ہوں مجھ سے بکواس مت کرو۔ میں سب کچھ سمجھ چکی ہوں۔“

پھر وہ زار و قطار رونے لگی۔ اور میں پریشانی سے اُس کے نزدیک بیٹھ کر اُس کی شکل دیکھتا رہا۔ دل چاہ رہا تھا کہ اُس کے بال پکڑوں اور اُس کا سر زمین پر دے ماروں.....

نفس کے عالم میں میری حالت بری ہو رہی تھی۔ سوچنے سمجھنے کی تمام قوتیں چند لمحوں کے لئے بالکل ختم ہو گئی تھیں۔ کافی دیر اسی طرح گزر گئی۔ سونیا کی سسکیاں ابھر رہی تھیں۔ پھر میں

رنجیت کمار کو بخار نہیں تھا۔ لیکن وہ مسلسل کراہے جا رہا تھا۔ اور ہمیں اُس کی خاصی خراب محسوس ہو رہی تھی۔ طے یہ کیا گیا کہ رات یہیں گزار دی جائے۔ اس میں رنجیت کمار سفر نہیں کر سکتا تھا۔

رات کو تھوڑا بہت کھانا کھایا گیا۔ جو اب ختم ہونے کے قریب تھا۔ رنجیت کمار نے وقت کچھ نہیں کھایا تھا۔ اُس کے ہونٹ خشک تھے اور آنکھیں چڑھی جا رہی تھیں۔ اس کیفیت کو دیکھ کر ہمیں تشویش ہوتی رہی۔ بہر طور! بارہ ساڑھے بارہ تک ہم لوگ رہے اور اُس کے بعد آنکھیں جھپکنے لگیں۔ پدما تو مجھ سے پہلے ہی سو گئی تھی۔ لیکن میرا دیر تک جاگتا رہا تھا۔ پھر جانے کب نیند آ گئی.....

رات کے کسی پہر، دفعۃً میرے کانوں نے ایک چیخ سنی اور میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ دوبارہ سنائی دی۔ میں نے آنکھیں پھاڑ کر دیکھا تو مجھے احساس ہوا کہ کوئی گڑبڑ ہے۔ چیخ پر غور کیا تو وہ پدما کے علاوہ اور کسی کی آواز نہیں تھی۔ میں وحشت زدہ انداز میں گیا۔ ایک عجیب و غریب منظر میرے سامنے تھا..... پدما، رنجیت کمار کے بازوؤں پر چل رہی تھی۔ اور وہ اُسے گھوڑے پر بٹھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے؟

دیکھتے ہی دیکھتے رنجیت کمار گھوڑے پر سوار ہو گیا۔ پھر اُس نے گھوڑے کی پٹا ہاتھ مارا اور گھوڑے نے زق قد لگا دی۔ اسی وقت میں ہوش میں آ گیا۔ رنجیت کمار نے لئے جا رہا تھا..... میں نے تیزی سے پلٹ کر دوسرے گھوڑوں کی طرف نگاہ دوڑائی۔ ایک اور منظر نے میرے اوسان خطا کر دیئے۔ مجھ سے کوئی دس گز کے فاصلے پر ایک زمین پر پڑا ہوا تھا۔ اور مجھے بخوبی اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ زندہ نہیں ہے۔ میں اُس کے قریب پہنچا تو میں نے وہ وحشت ناک منظر دیکھا..... گھوڑے کی گردن پر خنجر چبھ رہا تھا۔ اُس سے تقریباً پندرہ گز کے فاصلے پر دوسرا گھوڑا بھی مُردہ حالت میں پڑا تھا۔ کے ساتھ ہی تیسرا بھی..... میرے اوسان خطا ہو گئے۔ بدن میں سنسنی دوڑ گئی.....

کچھ ٹھا کر رنجیت کمار نے کیا ہے؟

رفتہ رفتہ تمام باتیں میری سمجھ میں آ گئیں..... ٹھا کر رنجیت کمار نے بیمار ہونے کا تھا اور نڈھال ہونے کی اداکاری کی تھی۔ اُس کے ذہن میں شروع ہی سے یہ منصوبہ

”تو کرلو..... بھاڑ میں جاؤ! مجھے کیا؟“ وہ جھلائے ہوئے انداز میں بولی اور پھر گھٹنوں میں منہ دے کر بیٹھ گئی۔

عجب سی بے بسی طاری ہو گئی تھی مجھ پر۔ لیکن پھر دفعۃً ہی میرے اندر ایک اور احساس ابھرا..... ارے! یہ تو بڑا اچھا راء، پدما خود بخود میری زندگی سے نکل گئی اور یہ جھگڑا ختم گیا۔ اب مجھے کیا پڑی ہے کہ اُس کے پیچھے پیچھے چکر لگاتا پھروں؟ بہتر یہ ہے کہ یہاں سے کہیں اور نکل جاؤں..... لعنت ہے اس علاقے پر..... لعنت ہے کماری پدما پر اور لعنت ہے ان سب پر..... میں کون سا ان سب کے لئے مضطرب ہوں یا مجھے کون سی ریاست حاصل کرنی ہے جو میں پدما کے لئے پریشان رہوں..... گئی، جائے، جہنم میں جائے۔ اب دو جانے اور رنجیت کمار۔ میرا پیچھا تو چھوٹ گیا..... میں اس سلسلے میں بہت زیادہ مصیبت پانے کا قائل نہیں تھا۔ نہ ہی میرے ذہن میں پدما کے لئے کوئی ایسا خیال تھا۔ بلکہ وہ خود ہی اس بارے میں مختلف انداز میں سوچتی تھی۔ لیکن سونیا..... اس کا کیا، کیا جائے؟ وہ مجھے بھاڑ میں جانے کا مشورہ دے چکی تھی۔ لیکن بھاڑ میں جانے کے لئے بھی کوئی نہ کوئی سواری درکار ہوتی۔ جبکہ تینوں گھوڑے مر چکے تھے۔ میں ٹھنڈی سانس لے کر پھر اپنی جگہ دراز ہو گیا.....

کافی دیر تک اسی طرح لیٹا، میں آنے والے وقت کے بارے میں سوچتا رہا۔ پدما کی تلاش بے مقصد تھی میرے لئے۔ جان بوجھ کر کون مصیبت مول لے؟ راعمیس موجود نہیں تھا جو اُس کی مدد لی جاسکتی۔ اور پھر اُس جیسا مددگار تو بالکل ہی ناکارہ تھا جو کسی مصیبت میں پھنسانے کے بعد خود گم ہو جائے۔ اُس کی تاریخ ہی یہی تھی۔ چنانچہ اُسے یاد کرنے سے کیا فائدہ؟ کبھی واپس آ گیا تو ٹھیک ہے۔ لیکن نہ آیا تو جہنم میں جائے بلکہ بھاڑ میں بقول سونیا کے۔ سونیا بھی وہیں لیٹی ہوئی تھی۔ لیکن جب سورج بلند ہوا تو زمین لیٹنے کے قابل نہ رہی اور ہم دونوں اٹھ بیٹھے۔ اب وہ کسی قدر معتدل نظر آ رہی تھی۔ اُس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”سنو! کیا نام ہے تمہارا سند رلال.....“

”جی سائیے!“ میں نے کہا۔

”میں شاید غصے میں تمہیں بہت برا بھلا کہہ گئی ہوں۔“

”نے اُس سے کہا۔“ اللہ کی بندی! یہ تو سوچ لو کہ اب ہم یہاں سے کیسے آگے بڑھیں گے؟ کیا تم میری مدد نہیں کر سکتیں؟ کیا یہ نہیں بتا سکتیں کہ رنجیت کمار اُسے کہاں لے گیا ہے؟“ ”جہنم میں.....“ وہ بولی۔

”جہنم کا راستہ تو جانتی ہو گی تم.....؟“

”تم بھی اُس کے پیچھے پیچھے چلے جاؤ۔ گھوڑے کے قدموں کے نشانات تو مل رہے ہیں گے تمہیں۔“ اُس نے پھر جھلائے ہوئے انداز میں کہا اور میں نے دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ لیا۔

”او مصیبت..... میں تیرا کیا کروں؟“

”جہنم رسید ہو جاؤ۔ مجھے تمہاری ضرورت بھی نہیں ہے۔ سمجھے؟ میں اپنا بچاؤ خود کر لوں گی۔ نہ بچ سکی تو مر جاؤں گی۔“

”مگر میں تمہیں ایسے نہیں چھوڑ سکتا۔“

”کیا بگاڑ لو گے تم میرا؟“

”نکلو ے کر دوں گا تمہارے۔ کیا سمجھیں؟ یہیں گردن دبا کر ندی میں پھینک دوں گا۔ میں نے خونخوار لہجے میں کہا تو وہ کسی قدر سہمی ہوئی نظر آنے لگی۔

”میرا کیا قصور ہے؟ میں تو خود..... دھوکہ کھا گئی ہوں..... وہ پاپی..... میں سب سمجھتی ہوں۔ اچھی طرح جانتی ہوں۔ میں نے پہلے بھی محسوس کیا تھا کہ وہ مجھے دھوکہ دے رہا ہے۔ وہ مطلبی ہے..... خود غرض ہے۔“

”وہ جو کچھ بھی ہے، لیکن اُس کا پتہ بتانے کے لئے صرف تم یہاں موجود ہو۔“ ”پتہ بتانے کے لئے؟ کیا وہ مجھے اپنا پتہ بتا کر گیا ہو گا؟ اگر ایسا ہی ہے تو کیا وہ مجھے نہیں لے جاسکتا تھا؟ کماری پدما تو اُس کی ضرورت تھی۔ اور میں..... میں اُس کی مجبوریوں۔ اُس کی منگیتر ہوں..... سمجھے تم؟ لیکن میں..... میں اُسے اچھی طرح سمجھ گئی ہوں۔“ ”مجھے بھی سمجھا دو تو بہتر ہو گا۔“

”تم کیوں میرے کان کھائے جا رہے ہو؟ تمہارا جو دل چاہے، کرو..... میں مصیبت زدہ ہوں۔“

”بہتر ہے میں اس دریا میں کود کر خود کشی کر لوں.....“

”اچھا..... آپ کو یاد ہے؟“ میں نے طنز یہ لہجے میں کہا۔

”مجھ پر طنز نہ کرو۔ ذرا غور کرو! میں نے جس کے لئے اپنی ساری زندگی لٹا دی، مجھے کس طرح چھوڑ کر بھاگ گیا بے یار و مددگار۔ اُس نے گھوڑوں کو بھی مار دیا کہ ہم اس کا پیچھا نہ کر سکیں۔ لیکن یہ نہ سوچا اُس نے کہ اس بیابان میں ہمارا ہوگا کیا؟“

”ابھی زمین تپ جائے گی۔ آسمان بھی تپے گا تو ہم اطمینان سے اس میں روستہ بن جائیں گے۔ روستہ سمجھتی ہو تم؟“

”میرا مذاق مت اڑاؤ۔ میں بہت پریشان ہوں۔“

”اچھا..... چلو ٹھیک! نہیں اڑاتا۔ لیکن میں تمہاری کیا مدد کر سکتا ہوں؟“

”دیکھو! انسانیت بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔ کم از کم انسانی رشتے سے تمہیں میری مدد کرنی چاہئے۔ میں یہ بات جانتی ہوں کہ خود تمہارے ساتھ بھی دھوکہ ہوا ہے اور وہ پاپی پدما کو تمہارے پاس سے چھین کر لے گیا ہے۔ جتنے مظلوم تم ہو، اتنی ہی میں ہوں۔“

”ایک بات بتاؤں۔ میں بالکل مظلوم نہیں ہوں۔ بلکہ ٹھا کر رنجیت کمار نے میرے اوپر احسان کیا ہے کہ مجھے اس مصیبت سے نکال لیا۔ ارے واہ..... مجھے کیا پڑی ہے پدما سے اور اُس کی شناخت سے؟ اب وہ جانے اور ٹھا کر رنجیت کمار۔ میں تو ایک اجنبی ہوں۔ اپنے معاملات وہ یقیناً آپس میں طے کر سکتے ہیں۔“

”مگر تم تو اُس کے ساتھ تھے اور وہ تم سے بہت مانوس نظر آتی تھی۔“

”تم اسے ناگہانی کہہ سکتی ہو۔ جب انسان پر برا وقت آتا ہے تو وہ ایسی ہی مصیبتوں میں پھنس جاتا ہے۔ اور پھر برا وقت تو مجھ پر مرکوز ہے۔ اچھا وقت دیکھے ہوئے پتہ نہیں تھا عرصہ گزر گیا۔“

”تم بھی کافی پریشان معلوم ہوتے ہو۔“

”پہلے تھا، اب نہیں ہوں۔“

”کیوں؟“

”اُس لئے کہ پریشانی کو رنجیت کمار لے بھاگا ہے۔“

”تم اُس سے اتنے اکتائے ہوئے تھے؟“

”اُس وقت تک نہیں اکتایا تھا، جب تک وہ میرے ساتھ تھی۔ لیکن اب محسوس کرتا

ہوں کہ حماقت کر رہا تھا۔“

”تعب ہے۔ میں تو سمجھتی تھی تمہیں اُس کے چلے جانے کا بہت دکھ ہوگا۔“

”اب تم یہ سمجھ لو! کہ مجھے اُس کے چلے جانے کا دکھ نہیں ہے.....“

”تو اب کیا کرو گے؟“

”عیش.....“ میں نے جواب دیا۔

”کہاں جاؤ گے؟“

”جہاں بھی تقدیر لے جائے۔ ویسے تمہارا کیا خیال ہے؟ اُس نے مالک پورہ کے

بارے میں جو کچھ کہا تھا، وہ سچ کہا تھا؟“

”بھگوان کی سوگند! میں کچھ نہیں جانتی۔ میں بھی ان راستوں سے اتنی ہی ناواقف

ہوں، جتنے تم۔“

”تب یہ ندی کہیں نہ کہیں ضرور جاتی ہوگی۔ ہم اس کے کنارے کنارے چلتے ہیں۔

کہیں بھی پہنچ جائیں گے۔“

”دھوپ بہت تیز ہوتی جا رہی ہے۔ کیسے سفر کریں گے؟“

”جیسے بھی ممکن ہو سکا۔“ میں نے جواب دیا۔

”کھانے پینے کے لئے بھی کچھ نہیں ہے۔“

”تمہیں زیادہ بھوک لگے تو تم مجھے کھا جانا اور مجھے زیادہ بھوک لگی تو میں....“ میں نے

ہونٹوں پر زبان پھیر کر جملہ ادھورا چھوڑ دیا اور وہ آہستہ سے مسکرا دی۔

”ویسے تم دلچسپ آدمی ہو۔“

”خبردار دوبارہ یہ جملہ نہ کہنا۔ میری کھوپڑی آؤٹ ہو جائے گی.....“

”کیوں؟“ وہ بدستور مسکراتی ہوئی بولی۔

”پہلے تم لوگ دلچسپ کہتی ہو پھر پرکشش اور اس کے بعد... ارے باپ رے... نہیں

اب میں کسی مصیبت میں پڑنے کے لئے تیار نہیں ہوں۔“

”دیکھو میرا مذاق مت اڑاؤ۔ کسی بے بس لڑکی پر تمہیں رحم کھانا چاہئے۔“

آج تک اس کے علاوہ اور کیا ہی کیا ہے۔ بے بس لڑکیوں پر رحم کھاتا رہا ہوں اور

مصیبت میں پھنستا رہا ہوں۔ میری مصیبت کی وجہ لڑکیاں ہی ہیں۔“

”لیکن میں تمہارے لئے مصیبت نہیں بنوں گی، وعدہ کرتی ہوں، بس کسی آبادی کے مجھے ساتھ رکھو، جہاں انسانوں کی کوئی بستی آجائے تم مجھے چھوڑ دینا۔ دوسری بات نہیں کہوں گی، وعدہ ہے۔“

”پکا وعدہ؟“ میں نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

”ہاں پکا وعدہ، میں تو خود ہی دکھی ہوں، اپنا گھر بار، سنسار سب کچھ چھوڑ دیا تھا اس پانی کے لئے، مگر نہ جانے کیوں مجھے کچھ دنوں سے یقین ہو چلا تھا کہ وہ خود غرض ہے اور اپنا مطلب نکال رہا ہے، بس اور کچھ نہیں۔“

”تو پھر آؤ چلیں، ندی کے کنارے کنارے چلتے ہیں اس طرح پانی کے نزدیک رہے تو دھوپ کی تپش زیادہ محسوس نہیں ہوگی۔“

سونیا نے گردن ہلا دی اور ہم دونوں چل پڑے۔ دھوپ واقعی تیز تر ہوتی جا رہی تھی۔ لیکن میرا یہ فیصلہ بھی درست تھا کہ ندی کے ساتھ ساتھ چلا جائے تاکہ جب ضرورت پڑے ہم پانی میں اتر کر اپنے بدن بھگو لیں۔ دھوپ سے بچنے کے لئے ہم نے دو تین بار ایسا ہی کیا۔ جانے کتنا سفر طے ہو گیا۔ بری طرح تھک گئے تھے۔ بھوک کے مارے طبیعت نڈھال ہو رہی تھی لیکن پھر کچھ ڈھلانوں میں اترتے ہوئے، ہمیں درخت نظر آئے جو پھل دار تھے اور ہم ان کی جانب بڑھ گئے، اتنی دیر تک پیدل سفر کرتے رہے تھے، بدن پھر تھک گئے تھے چنانچہ درختوں کے نیچے نہایت سکون محسوس ہوا۔ پھل ہم نے توڑ کر کھائے اور ان سے پیٹ بھی بھر گیا۔ سونیا ایک درخت کے تنے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی تھی۔ اس کے چہرے پر مُردنی چھائی ہوئی تھی۔ مجھے اُس پر ترس آنے لگا۔ لیکن میں نے اپنے آپ کو روکا۔ یہ ترس ہی تو مصیبتوں کا باعث بن جاتا ہے۔

”سُندر لال جی، بہت تھک گئی ہوں میں، کیا ابھی آگے کا سفر کرنا ہے یا رات کو آرام کر لیا جائے۔“

”ابھی تو رات کافی دور ہے۔“

”ہاں، مگر یہ ہو سکتا ہے کہ آگے ہمیں ایسی جگہ نہ ملے۔“

میں، چند لمحے سوچتا رہا پھر ٹھنڈی سانس لے کر گردن ہلا دی۔ ”ٹھیک ہے جیسی تمہاری مرضی۔“

سونیا نے آنکھیں بند کر لیں، میں واقعی پریشان ہو گیا تھا۔ اگر یہ ندی یوں ہی سپاٹ میدانوں اور سنگلاخ چٹانوں کے درمیان سے گزری رہی تو کیا ہوگا، ہو سکتا ہے آگے چل کر کہیں راستہ رک جائے۔ کیا اسے عبور کر کے دوسرے کنارے کو دیکھا جائے لیکن اس سے بھی فائدہ نہیں تھا۔ جہاں تک نگاہ کام کر رہی تھی، ویرانہ ہی ویرانہ نظر آ رہا تھا۔ اس ویرانے میں اگر کوئی ذی روح میرے ساتھ تھا تو صرف سونیا، اگر میں تنہا ہوتا تو شاید زیادہ خوفناک بات ہوتی، اس وقت سونیا کا ساتھ غنیمت تھا۔ کم از کم بولنے بات چیت کرنے کے لئے تو کوئی تھا۔ چنانچہ اب میں نے اپنے رویے میں تبدیلی پیدا کر لی، میں نے اس سے نرم لہجے میں کہا۔ ”اگر تمہیں نیند آرہی ہو تو سو جاؤ!“

وہ اپنی آنکھیں کھول کر بولی۔ ”نیند نہیں آرہی۔ تھکن ہو گئی ہے۔ دھوپ کافی تیز تھی، انگ انگ دکھ گیا ہے۔“

”چاہو تو ندی میں نہالو۔“

”نہیں اب اس کی ضرورت محسوس نہیں ہو رہی۔“ وہ بولی اور پھر اٹھ کر بیٹھ گئی۔

شام آہستہ آہستہ جھکتی چلی آ رہی تھی اور تھوڑی دیر کے بعد فضاؤں میں اندھیرے اتر آئے۔ سونیا میرے قریب ہو کر بیٹھ گئی تھی ”دیکھو، کوئی غلط بات مت سمجھنا، بس مجھے رات کی تاریکیوں سے ڈر لگتا ہے۔“

”کوئی بات نہیں، اطمینان سے بیٹھو میں تمہارے ساتھ ہوں، ویسے ان جنگلوں میں نہ تو کیڑے مکوڑے نظر آتے ہیں اور نہ ہی دوسرے جانوروں کی آوازیں سنائی دیتی ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ یہاں پرندوں کے علاوہ اور کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو نقصان پہنچا سکے۔“

”ہاں۔“ اس نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا.....

بھوک لگی تو ہم نے پھر وہی پھل توڑ کر کھائے اور اس کے بعد ایک صاف ستھرا ٹھکانہ بنا کر وہاں بیٹھ گئے۔ میں نے سونیا سے کہا۔

”سونیا کیا تم بتانا پسند کرو گی کہ رنجیت کمار سے تمہارا واسطہ کیسے پڑا۔“

وہ چند لمحے سوچتی رہی اس نے فوری طور پر میری بات کا کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ پھر اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور آہستہ سے بولی۔

”تقدیر کی خرابی کہو سُندر لال جی، اس کے علاوہ اور کیا کہا جاسکتا ہے۔ اس پانی نے مجھ

سے محبت کا نائک رچایا تھا۔ وہ مجھ سے پریم کی بات کرتا تھا۔ کہتا تھا کہ وہ مجھ سے شادی کرے گا میں پاگل اُس کی باتوں میں آگئی۔“

”تمہارا کوئی نہیں ہے اس دنیا میں؟ گھر بار، ماں باپ، کوئی تو ہوگا تمہارا۔“ میں نے سوال کیا اور سونیا کے چہرے پر غم ناک تاثرات پھیل گئے۔

”ہیں، چاچا جی ہیں، چاچا جی ہیں، لیکن چاچا جی، چاچا جی کے ہاتھوں میں کھیلتے ہیں۔ مجھے کبھی سنسار میں وہ سکھ نہیں ملا جو اپنوں کا ہوتا ہے۔ ہمیشہ خود کو بے سہارا ہی پایا۔ کبھی کوئی ایسا نہیں ملا جس نے دل سے پیار کیا ہو۔ یہی وجہ تھی کہ جب مجھے رنجیت کمار کا سہارا ملا تو میں نے اپنا سارا سنسار اسے سمجھ لیا میں نے سوچا کہ اب میری تقدیر کھل گئی۔ اس کے روپ میں میں نے سنسار پالیا تھا۔ مگر میری کالی تقدیر..... اسے بدلنا تو میرے بس میں نہیں ہے۔“ سونیا کی سسکیاں اُبھرنے لگیں۔

”مجھے افسوس ہے سونیا! واقعی یہ سب تقدیر کے کھیل ہیں، رنجیت کمار تمہارے ساتھ مخلص نہیں تھا۔ اس نے تمہیں صرف آلہ کار بنایا تھا لیکن کیا اس نے تمہیں بتایا تھا کہ وہ تمہیں یہ روپ دے کر کیا کرنا چاہتا ہے؟

”کیا بتاؤں؟ مت ماری گئی تھی۔ میری تقدیر نے دھوکا دیا تھا اس نے میری اصل شکل بدل دی۔ ایک آدمی سے میرا چہرہ بدلوا دیا تھا۔ پاپی، ہتھیارا بھگوان اُس سے اُس کی ساری خوشیاں چھین لے۔ بھگوان کرے وہ بھی کبھی سکھی نہ رہے۔“ سونیا نے غصے میں آکر اپنے چہرے سے وہ نقلی ماسک اتار پھینکی جو یقیناً کسی ماہر فن سے بنوائی گئی تھی اس کا اصل چہرہ نمایاں ہو گیا تھا۔ اپنی اصلی شکل میں بھی وہ کافی حسین تھی۔ نازک نازک سے نقوش کی مالک، خوبصورت آنکھوں والی، اس نے روتے ہوئے کہا۔

”چاچا، چاچا جی نے اتنا تنگ کیا تھا مجھے کہ سُدھ سُدھ کھو بیٹھی اور اس پاپی کے فریب میں آگئی ورنہ.... ورنہ میں اپنا گھر کیوں چھوڑتی؟“

”بھیس بدلنے کے سلسلے میں اس نے تم سے کیا کہا تھا۔“ میں نے پھر سوال کیا۔

”گھر سے نکلنے کے بعد میں بہت خوش تھی۔ اس نے مجھے ایک مکان میں رکھا تھا اور وہاں وہ میری خوب دلجوئی کرتا تھا بہت کچھ بنا کر دیا تھا اس نے، مجھے کہتا تھا کہ سنسار کی ہر خوشی میرے قدموں میں ڈال دینا چاہتا ہے۔ مگر کچھ مجبوریاں ہیں۔ میں اگر ایک کام کر

دیں تو دن بدل جائیں گے۔ مجھ بے وقوف نے خود ہی اس سے اس کام کے بارے میں پوچھا تو اس نے مجھے ایک کہانی سنا دی۔ اور پھر کہا کہ میں اگر کماری پدما بن جاؤں اور اچھے دنوں کے لئے کچھ محنت کر لوں تو پھر عیش ہی عیش ہوں گے۔“

”ہاں! اس نے ایک آدمی کو بلا کر یہ نیا چہرہ، میرے چہرے پر چڑھوا دیا اور پھر مجھے ہاتھ لے کر گنڈا پورا گیا۔ جہاں ہم دونوں کو دیوان ہریش چندر نے گرفتار کر لیا۔ مگر وہ جو کچھ سوچ رہا تھا، وہ نہ ہوا۔ ہریش چندر اُس سے کسی جنم کنڈلی کے بارے میں پوچھتا تھا جو اس کے پاس نہیں تھی۔“

”وہ کہانی کیا تھی سونیا۔ براہ کرم مجھے سناؤ۔“ میں نے دلچسپی سے کہا اور سونیا کسی گہری سوچ میں گم ہو گئی۔ غالباً وہ کہانی یاد کر رہی تھی۔ پھر اس نے کہا۔

”اس نے مجھے کماری پدما کے بارے میں بتایا تھا۔“

”کیا سونیا؟“ میں نے دھڑکتے دل سے پوچھا۔ پدما کی کہانی میرے لئے بھی پراسرار تھی۔

☆.....☆.....☆

”راجہ ماری پدما، ریاست کنڈوالا کے جاگیردار گیان چند کی بیٹی ہے۔ گیان چند اس کے پرکھوں نے ہمیشہ انگریز راج کی وفاداری کی، جس کے نتیجے میں اسے بہت سی جاگیریں دی گئیں اور وہ بے حد دولت مند ہو گیا۔ پھر وہ کہیں کھدائی کر رہا تھا کہ اسے ایک بہت بڑا خزانہ ہاتھ لگا۔ خزانے کے بارے میں اندازہ تھا کہ اس سے چار بڑے شہر بے جا سکتے ہیں، چالاک گیان چند نے خزانہ وہاں سے نکال کر کہیں اور چھپا دیا۔ اس سلسلے میں اس نے بڑی رازداری سے کام لیا تھا۔ اور جن لوگوں کے ذریعے اس نے خزانہ چھپایا، انہیں قتل کر دیا۔ مگر ان میں سے ایک کسی طرح بچ گیا۔ گیان چند اسے مردہ سمجھ کر چھوڑ گیا تھا۔ مگر اس میں جان تھی وہ زخمی حالت میں پڑا تھا کہ کرنل جیمز نامی ایک انگریز شکار کھیلتا ہوا ادھر جا نکلا اور وہ زخمی اس کے ہاتھ لگ گیا۔ زخمی نے اسے خزانے کی کہانی سنائی لیکن اس کے چھپانے کی جگہ بتائے بغیر مر گیا۔ خزانے کی جگہ کے بارے میں تو کرنل جیمز کچھ نہ معلوم ہو سکا لیکن اسے یہ پتہ چل گیا تھا کہ خزانہ گیان چند کی تحویل میں ہے۔ کرنل جیمز کے گیان چند سے تعلقات نہیں تھے۔ لیکن ایک انگریز افسر کی حیثیت سے گیان چند سے ملا اور بالآخر اس پر ظاہر کر دیا کہ وہ خزانے کے بارے میں جانتا ہے اس لئے بہتر ہے کہ اسے خزانے کا حصہ دار بنایا جائے۔ گیان چند نے اس خزانے سے لا تعلقی کا اظہار کر دیا لیکن کرنل جیمز نے اس کا پیچھا نہیں چھوڑا۔ اس نے گیان چند کو ان لوگوں کے قتل کے الزام میں پھانس کر جیل میں ڈلوادیا جنہیں گیان چند نے خزانہ پوشیدہ رکھنے کی وجہ سے قتل کیا تھا۔ پھر جیل میں اس نے گیان چند کو دھمکیاں دیں کہ اگر اس نے خزانے کے بارے میں نہ بتایا تو اس کی بیٹی پدما کو ہلاک کر دیا جائے گا۔ گیان چند نے جیل میں ملاقات کرنے کیلئے آنے والے اپنے ایک معتمد خاص گوپال سانگا سے درخواست کی کہ وہ پدما کو لے روپوش ہو جائے اور وفادار گوپال سانگا نے ایسا ہی کیا۔ اس نے پدما کی پرورش کی، اتنا بات سے مایوس ہو کر کرنل جیمز نے گیان چند کے دوسرے دوستوں سے رابطہ قائم کیا۔“

انہیں خزانے کے بارے میں بتا کر کوشش شروع کر دی کہ خزانہ مل جائے۔ ان میں لاج پال وغیرہ تھے۔ رنجیت کمار کو بھی راج پال کے ذریعہ یہ کہانی معلوم ہوئی تھی۔ چنانچہ سب مل کر ہتھیار کر رہے۔ گیان چند نے ایک کام اور کیا، وہ یہ کہ پدما کی جنم کنڈلی میں اس خزانے کا نقشہ پوشیدہ کر دیا لیکن جنم کنڈلی کا راز، راز نہ رہ سکا۔ تاہم پدما ہی کا پتہ نہیں تھا۔ پھر انگریز راج ختم ہو گیا اور کرنل جیمز کو بھی دوسرے انگریزوں کی طرح یورپ واپس جانا پڑا لیکن خزانے کی یاد وہ اپنے ساتھ ہی لے گیا تھا اور اس کا مسلسل رابطہ ان لوگوں سے رہا اور وہ خود بھی ضرورت کے وقت یہاں آتا رہا اور راج پال اور دوسرے لوگ بھی خزانے کے چکر میں اپنے طور پر سرگرداں تھے کرنل جیمز کو یہ احساس بھی تھا کہ چونکہ اب ہندوستان میں ان کا اقتدار نہیں ہے۔ اس لئے یہ دوسرے لوگ جو اپنے طور پر کام کر رہے ہیں۔ آیا وہ باثر ہو گئے ہیں۔ کسی طرح اسے گوپال سانگا کے بارے میں معلوم ہو گیا اور اس نے گوپال کے خلاف کارروائی شروع کر دی۔ لیکن وہ وفا پرست اپنے گھر کو خاکستر کر کے خود جنگلوں میں روپوش ہو گیا۔ لیکن پھر وہ زندہ نہ بچ سکا اور پدما مختلف حالات سے گزرتی ہوئی پہلے رنجیت کمار اور پھر کرنل جیمز کے ہاتھ لگ گئی۔ رنجیت کمار نے اس کی جنم کنڈلی اڑالی۔ واپس ہندوستان کا رخ کیا اور بہت دن تک وہ جنم کنڈلی کا درز کھولنے میں لگا رہا۔ ادھر گیان چند جیل سے رہا ہو گیا اور اس نے کنڈوالا کے نواح میں اپنی ایک جاگیر سونا گڑھی میں اپنے لئے ایک کوٹھی بنوائی۔ لیکن پدما اسے نہ مل سکی۔ رنجیت کمار کو جب کنڈلی سے خزانے کا راز ملا اس نے خزانے کے حصول کے لئے کوششیں شروع کر دیں اور جب وہ خزانے کی جگہ پہنچا تو اسے معلوم ہوا کہ خزانہ وہاں سے نکالا جا چکا ہے اور ظاہر ہے خزانہ گیان چند کے علاوہ اور کون نکال سکتا تھا۔ رنجیت کمار کی ساری کوششیں بے کار ہو گئی تھیں۔ وہ پریشان ہو گیا۔ بقول اس کے اس نے اپنی ساری پونجی داؤ پر لگا دی تھی اور اس کے پاس کچھ نہیں رہا تھا جو لوگ اس چکر میں سرگرداں تھے ان میں ہریش چندر بھی تھا۔ لیکن اسے بھی اتنا بارے میں کچھ نہیں معلوم تھا۔ پھر رنجیت کمار بڑی چالاک کی سے گیان چند سے ملا اور اس نے پدما کی جنم کنڈلی اس کے حوالے کر کے اسے بتایا کہ یہ کسی نے اسے دی تھی۔ گیان چند نے اسے پیشکش کی کہ اگر وہ پدما کو تلاش کر لے تو وہ اسے اتنی دولت دے گا کہ اس کے بال بچے تک عیش کریں گے، اب رنجیت کمار سخت افسردہ تھا کہ اس نے پدما کو ایسے کیوں

”میری بات مانو گی سونیا؟“

”کہو!“

”تم اپنے چاچا چاچی کے پاس چلی جاؤ۔“

”مرتے سے تک نہیں جاؤں گی۔ میرے چلے آنے سے ان کی کم بدنامی ہوئی ہو

گی۔ وہ لوگ پہلے ہی مجھ سے جلتے تھے، اب تو مجھے بھون کر کھا جائیں گے۔“

”تو تم وہاں نہیں جاؤ گی؟“

”کہانا، کبھی نہیں۔“

”ہوں، چلو یہاں سے تو چلو۔“ تم نے تو اپنے چہرے سے پدما کا خول اتار پھینکا

ہے۔ مگر میرا یہ چہرہ میرا بدترین دشمن ہے یہ مجھے نہیں چھوڑے گا۔“

”کیا مطلب؟“ سونیا نے پوچھا۔

ہریش چندر کے آدمی ہماری تلاش ترک نہیں کریں گے۔ تم تو اس لئے بچ جاؤ گی کہ

ہم نہیں ہو، لیکن میرے چہرے پر کوئی خول نہیں ہے۔ اور میں ضرور پکڑا جاؤں گا۔“

”ہائے رام، یہ بات تو ہے۔“ سونیا نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔

”چلو، یہاں سے تو چلو۔“ میں نے کہا اور ہم وہاں سے چل پڑے۔ کوئی منزل نہیں

تھی، کسی راستے کا تعین نہیں تھا۔ پھر ایک جگہ سے ہم نے ندی پار کی۔ زیادہ گہری نہیں تھی،

مٹی پار کرنے کے بعد سیدھے سفر کرتے رہے اور پھر ایک ڈھلان پر ہمیں ایک بستی نظر آ

گئی۔ میں نے سونیا سے اس کے بارے میں مشورہ کیا تو اس نے بھی یہی خیال کیا کہ یہ بستی

مالک پورہ ہے۔ بستی مالک پورہ میں داخل ہو کر ہمیں کھانے پینے کی سہولتیں مہیا ہو گئیں اور

پانچ کے لئے ایک سرائے بھی مل گئی۔ لیکن سرائے کی پہلی رات میرے لئے تشویش کی رات

تھی۔ کھانے پینے سے فارغ ہو کر ہم آرام کرنے کے لئے لیٹ گئے۔ سونیا کسی گہری سوچ

مناؤں میں ہوئی تھی، تب اس نے کہا۔

”ایک بات پوچھوں؟“

”ہاں سونیا! پوچھو۔“

”تم کون ہو؟ کماری پدما سے تمہارا کیا تعلق تھا؟“

سونیا کے اس سوال پر میں چونک پڑا۔ میرے بارے میں اس کا اتنا تجسس خطرناک بھی

چھوڑ دیا۔ اس نے پدما کو تلاش کیا وہ تو دوبارہ اسے نہ مل سکی۔ لیکن اس نے ایک اور تریز

سوچ لی، وہ یہ کہ کسی اور کو پدما بنا کر گیان چند کے سامنے پیش کر دیا جائے۔ اور اس پل

نے مجھے اس کے لئے تیار کیا اس نے مجھے ساری پٹیاں پڑھائیں کہ کس طرح میں گیان چند

سے ملوں گی۔ گوپال سانگا کے بارے میں بتاؤں گی۔ شاید اسی لئے اس نے مجھے یہ سارا

کہانی بھی سنا دی تھی کہ میں اپنا کردار سمجھ لوں۔ ورنہ مجھے اصل کہانی کبھی نہ سناتا۔ بہر حال

اس کے بعد وہ مجھے لے کر چل پڑا مگر اس کے فرشتوں کو بھی یہ بات معلوم نہ تھی کہ ہریش

چندر بھی اس کی تلاش میں مارا مارا پھر رہا ہے۔ ہم سونا گڑھی جانے کے لئے یہاں گنڈاپور

آئے تھے کہ ہریش چندر کے آدمیوں نے ہمیں گرفتار کر لیا۔ مگر ہریش چندر کو ساری بات

معلوم نہیں تھی۔ وہ بدستور جنم کنڈلی کے چکر میں پڑا ہوا تھا اسی کے سلسلے میں اس نے رنجیت

کمار کی خوب پٹائی بھی کی اور اس سے پوچھا کہ جنم کنڈلی پدما کے گلے سے اتار کر اس نے

کہاں چھپائی ہے۔ رنجیت کمار کو افسوس تھا کہ اس نے جنم کنڈلی گیان چند کے حوالے کر دی

اگر وہ ہوتی تو اسے ہریش چندر کو دے کر وہ اپنی جان بچا لیتا۔ کیوں کہ اب جنم کنڈلی ایک

بے کار چیز تھی۔ بہر حال کوشش میں لگا رہا اور پھر اس نے ہریش چندر کے ایک ملازم کو

توڑ لیا اور پر بھووال نے ہمارے فرار کا بندوبست کر دیا ہم یہاں سے نکل آئے۔ لیکن زیادہ

دور نہیں گئے تھے کہ دوبارہ گرفتار ہو گئے۔ پھر تم سے قید خانے میں ملاقات ہوئی اور بعد کی

کہانی تمہیں خود معلوم ہے۔“

سونیا خاموش ہو گئی۔ میں نے سر پکڑ لیا تھا عجیب کہانی تھی۔ کتنی پیچیدہ، کیسی الجھی

ہوئی، بہر حال میرا اس سے کیا تعلق تھا۔ البتہ یہ سوچنا تھا کہ اب کیا کیا جائے۔ اس بات کا

اندازہ بھی ہو رہا تھا کہ رنجیت کمار کہاں گیا ہوگا اس کے علاوہ اور کچھ ہو ہی نہیں سکتا تھا کہ

سیدھا گیان چند کے پاس گیا ہوگا۔ اور اس نے پدما کو اس کے باپ کے سامنے پیش کر

ہوگا۔ بہر حال ایک بات تو سکون بخش تھی کہ پدما بالآخر اپنوں میں پہنچ گئی۔ لیکن خاتون

سونیا، ارے باپ ارے، اب یہ کہیں میرے گلے پڑنے کی کوشش نہ کرے، میں نے خوف

نگاہوں سے سونیا کی طرف دیکھا۔ وہ گردن جھکائے کسی سوچ میں گم تھی۔

”بڑی دکھ بھری کہانی ہے سونیا۔“

”اب میرا کیا ہوگا؟“ وہ روتے ہوئے بولی۔

ہو سکتا تھا۔ چنانچہ میں نے سنبھل کر کہا۔ ”میرا اُس سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ بلکہ اُس نے صرف اس مقصد کے تحت حاصل کیا تھا کہ میں اسے اس کے گھر تک پہنچا دوں، وہ اپنے بارے میں کچھ نہیں جانتی تھی۔ اور میں اُس کے لئے کام کر رہا تھا، جس کا اُس نے معقول معاوضہ دینے کے لئے کہا تھا۔“

”دیکھو! کتنی خود غرض ہے یہ دنیا۔ وہ بھی تمہیں چھوڑ کر فرار ہو گئی۔“

”ہاں! اس میں کوئی شک نہیں ہے۔ یہ سب تقدیر کی باتیں ہیں۔“

”میرا کیا ہوگا سندر لال؟ ایک انسان ہونے کے ناطے میرے بارے میں بھی سوچ ”میں بھلا کیا سوچ سکتا ہوں سونیا!“ میرے ذہن میں صرف ایک ہی بات آئی تھی وہ یہ کہ تم اپنے چاچا، چاچی کے پاس چلی جاؤ۔ لیکن تم کہتی ہو کہ تمہارا اُن کے پاس خطرناک ہوگا۔ تو اب اُس کے بعد میں کیا کہہ سکتا ہوں؟“

”میں وہاں کبھی نہیں جاؤں گی سندر..... میں وہاں کبھی نہیں جاؤں گی۔ کیا تم شادہ ہو؟“ اُس نے عجیب سی نگاہوں سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا اور میرے ذہن! ”میں نے سنبھل کر ایک سرد آہ بھری اور آہستہ سے بولا۔

”ہاں..... میری پہلی شادی میرے ماتا پتانے کی تھی۔ ایک موٹی، بھدی اور جھڑ عورت سے۔ جس کے ساتھ رہتے ہوئے میری آدمی زندگی برباد ہو گئی۔ اُس نے مجھے کے طور پر چھ بچوں کا باپ بنا دیا۔ پھر میں نے دوسری شادی اپنی مرضی سے کی اور تجربہ اس سلسلے میں بھی بہت بھیانک نکلا۔ میری اپنی پسند کی شادی بھی ناکام ہو گئی اور پانچ بچے میری تقدیر میں لکھے گئے۔ اب میں گیارہ بچوں اور دو بیویوں کا شوہر ہوں۔ دونوں ساتھ ساتھ رہتی ہیں اور میں کوشش کرتا ہوں کہ گھر سے بھاگا رہوں۔ ایسے ہی تلاش کرتا ہوں، جن میں مجھے اُن سے دُور رہنا پڑے۔ تم بتاؤ سونیا! ایک ایسے آدمی زندگی کیا حیثیت رکھتی ہے، جس کے دائیں طرف ایک موٹی بھدی، جھڑا عورت کھڑی اور دوسری طرف ایک اور خوفناک عورت۔ ایک کے ہاتھ میں بیلن ہو اور دوسری کے میں جھاڑو۔ اور دونوں کا نشانہ میں ہی ہوں۔ گیارہ بچوں کی تالیاں گھر کے چاروں سے اُبھریں..... ان حالات میں تم خود ہی سوچو! میری کیا کیفیت ہوگی؟“

میرا خیال تھا کہ سونیا ہنس پڑے گی۔ لیکن وہ رحم آمیز نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔

کوئی راستہ ذہن میں نہیں تھا۔ کوئی سمت ذہن میں نہیں تھی۔ بس! آوارہ گردوں کی اندھا دھن جا رہا تھا۔ رات کا یہ آخری حصہ بھی ختم ہو گیا۔ صبح تک تھکن سے چور ہو گیا تھا۔

”نوشہ فستق سے ایک بس آتی ہوئی نظر آئی اور میں اُسے روک کر اُس میں سوار ہو گیا۔ یہ مانہ پوچھا کہ بس کہاں جا رہی ہے؟ جب میں بس سے اتر! تو فوراً ہی مجھے یہ یقین ہو گیا یہ سونا گڑھی ہے۔ وہی بستی جس کا نام مجھ سے لیا گیا تھا اور جو گیان چند کی بستی تھی۔

گیان چند کی بستی میں آ کر خواخواہ ہی میرے ذہن میں تجسس پیدا ہو گیا تھا کہ پدما کے سے میں معلومات حاصل کی جائیں۔ ویسے بھی پدما اب میرے لئے خطرناک نہیں تھی۔ ”اپنے باپ تک پہنچ گئی تو میری ذمہ داری ختم..... ظاہر ہے اب وہ مجھے کیا خاطر میں لے گی؟ معلومات حاصل کرتا ہوا بالآخر میں گیان چند کی حویلی کے پاس پہنچ گیا۔ یہاں نے پدما کے بارے میں معلومات حاصل کیں۔ حویلی کے ایک حصے میں دیئے روشن نہیں دن کی روشنی میں بجھا دیا جاتا تھا۔ جس شخص سے میں نے معلومات حاصل کیں، نے ان دیوؤں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”یہ دیئے رات کو پھر جل اٹھیں گے۔ سات دن تک ان میں گھی کے چراغ جلیں اور آج تو صرف تیسرا ہی دن ہے۔“

”بہر؟“

”بہر یہ کہ گیان چند کی بیٹی پدما وتی بہت عرصے تک گم رہنے کے بعد اُسے ملی ہے۔“

میں نے ٹھنڈی سانس لی اور گردن ہلانے لگا۔ گویا میرا اندازہ درست تھا۔ پڑا ہوا گھر پہنچ گئی تھی۔ گویا اب سونا گڑھی بھی رُکنا بے کار تھا۔ میں دوپہر تک سونا گڑھی میں چکراتا رہا۔ دل میں بہت سے فیصلے کر رہا تھا کہ اب مجھے کیا کرنا چاہئے؟ اور پھر جب حویلی سے کافی دُور ایک باغ کے نزدیک ایک درخت کے نیچے کھڑا ہوا تھا تو چند گھنٹے میرے قریب پہنچ گئے۔ انہوں نے گھوڑے روک کر میرے نزدیک آتے ہوئے کہا ”مہاراج! آپ یہاں گھوم رہے ہیں اور وہاں پرانی حویلی میں ٹھا کر گیان چند آپ انتظار کر رہے ہیں۔“

”مم..... میرا.....؟“ میں نے گھبرائے ہوئے انداز میں کہا۔

”ہاں! اُن کے پاس زیادہ سے نہیں ہے۔ براہ کرم! ہمارے ساتھ چلئے۔“

”لیکن بھائی.....!“

”چلئے مہاراج! یہ گھوڑا حاضر ہے۔“ اُن میں سے ایک نے کہا اور کچھ اِس طرح بچہ کیا کہ اُن کے ساتھ جاتے ہی بن پڑی۔

پرانی حویلی وہ نہیں تھی جس میں، میں نے ٹھا کر گیان چند کے بارے میں معلومات حاصل کی تھیں۔ یہ ایک ٹوٹا پھوٹا کھنڈر تھا اور اس ٹوٹے پھوٹے کھنڈر کے ایک حصے میں ٹھا کر گیان چند مجھے ملا۔ ایک دراز قامت آدمی تھا۔ چہرے ہی سے سخت گیر معلوم ہوتا تھا اُس نے مجھے دیکھتے ہی سرد لہجے میں کہا۔

”رنجیت کمار! میں نہیں چاہتا کہ اب تم ایک لمحہ بھی یہاں رُکو۔ یہ سنبھالو اپنے حصے دولت اور یہاں سے فوراً روانہ ہو جاؤ۔ تمہارا گھوڑا تیار ہے۔ اور ایک بات کان کھول کر، لو! کہ اب اگر تم راجپوتانہ کے نواح میں نظر آئے تو تمہاری زندگی ممکن نہیں ہوگی۔ یہاں گیان چند کا قول ہے۔ لو..... یہ سنبھالو!“

اُس نے باقاعدہ ایک بوجھ میرے حوالے کر دیا۔ میں نے اُس بوجھ کو ٹٹول کر دیکھ کر میرے اوسان خطا ہو گئے۔ کیونکہ کپڑے سے ہیرے کی چمک صاف نظر آ رہی تھی۔ پھر میرے ہاتھ میں تھمانے کے بعد گیان چند نے اپنے آدمیوں کو حکم دیا کہ مجھے سونا گڑھی کے سرحد کے پار چھوڑ آئیں۔ اور وہ لوگ مجھے لے کر چل پڑے۔

میں اس خوفناک صورت حال پر غور کر رہا تھا۔ یقیناً مجھے یہ دولت ٹھا کر رنجیت کمار

بجے میں دی گئی تھی اور یہاں سے نکال دیا گیا تھا۔ اب تھوڑی دیر کے بعد اصل رنجیت کمار، ٹھا کر گیان چند کے پاس پہنچے گا تو سارا کچا چٹھا کھل جائے گا۔ ہاتھ آئی دولت کو بھلا کون ٹھکرائے؟ چنانچہ بہتر یہی تھا کہ گھوڑے کو ایڑ لگائی جائے اور اُس وقت تک اس کی پائی کی جاتی رہے جب تک کہ وہ مجھے یہاں سے اتنی دُور نہ پہنچا دے کہ یہ لوگ میرا نشان بھی تلاش نہ کر سکیں۔ چنانچہ میں نے گھوڑے کی بیٹھ پر ایک سانٹا جمایا اور وہ ہوا سے باتیں کرنے لگا.....

تیز ہوائیں کانوں کے پردے پھاڑے دے رہی تھیں۔ میں عمدہ گھڑ سوار بھی نہیں تھا۔ چنانچہ گھوڑے کی پشت پر جے رہنا مشکل لگ رہا تھا۔ جوش میں آ کر اور یہاں سے جلد از جلد دُور نکل جانے کے تصور سے گھوڑے کو چابک لگا تو دیا تھا مگر لینے کے دینے پڑ گئے تھے۔ گھوڑا چابک کا برا مان گیا تھا اور میری ہر خوشامد کو نظر انداز کر رہا تھا۔ غلطی میری ہی تھی۔ آخر وہ بھی جاندار تھا اور اپنی انا اور وقار رکھتا تھا۔ غالباً اُسے اعتراض تھا کہ میں نے اُس کے ساتھ یہ بدسلوکی کیوں کی؟ اب میں اُسے کیا بتاتا کہ میں نے اُسے یہ چابک اسی طرح مارا تھا جیسے کسی کار کو شارٹ کرنے کے لئے سیلف گھمایا جاتا ہے۔

جانے کتنی دیر گزر گئی؟ پھر مجھے گھوڑے کی رفتار سست ہوتی محسوس ہوئی اور وہ رُک گیا۔ میں نے ڈرتے ڈرتے گردن اٹھائی کہ کبخت کی کوئی چال نہ ہو۔ اطراف میں ہرے بھرے میدان پھیلے ہوئے تھے۔ پس منظر میں سنگلاخ پہاڑ نظر آ رہے تھے اور بائیں سمت کچھ غارتیں، کوئی چھوٹی سی بستی تھی۔ رُوح میں بالیدگی پیدا ہو گئی تھی۔

میں نے وہ گٹھری سنبھالی جس میں تاریخی خزانے کا کافی بڑا حصہ تھا۔ جس کے لئے جانے کتنے لوگ کب سے سرگرداں تھے۔ پھر میں بڑی مہارت سے گٹھری سمیت گھوڑے سے کود گیا۔ زمین پر قدم جمتے ہی میں نے اُسے کھول کر دیکھا تو میری آنکھیں چکا چوند ہو گئیں..... انتہائی قیمتی زیورات، سونے کے قدیم سکے اور جانے کیا کیا تھا..... گٹھری کو اسی طرح باندھ کر سونے کے چند سکے نکال کر جیب میں رکھے۔ پھر ایک مناسب جگہ تلاش کر کے وہاں جا بیٹھا۔ میرا جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا اور آرام کی سخت ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ مگر سر ہانے رکھ کر میں لیٹ گیا۔ دماغ میں خیالات کی یلغار ہو رہی تھی۔ تھوڑی دیر کے لئے ذہن خالی چھوڑنا چاہتا تھا۔ کیا خیالات کو دُور رکھنا میرے بس سے باہر تھا؟“

ہاتھ جہاں ساکت ہو جاؤں..... لیکن کبھی ایسا نہیں ہوا۔ میں نے اس کی خواہش کی کہ بدنگی کی لٹافتوں سے اسی طرح گزروں، جس طرح دنیا کے رہنے والے گزرتے ہیں۔ بین حالات نے اس کا موقع کہاں دیا؟ کیا کچھ نہ کر کے دیکھ لیا..... صورت بدلتی تو بھی معیت میں پڑ گیا۔ واپس اصل صورت میں آیا تب بھی مصیبتوں نے میرا ساتھ نہ چھوڑا۔ بگ کہتے ہیں کہ ہر انسان کے چند ہم شکل ہوتے ہیں۔ لیکن یہاں تو یوں محسوس ہوتا تھا جیسے ہر چوتھا آدمی میرا ہم شکل ہے۔ اس کہانی کو ناقابل یقین کہا جاتا تو بہتر ہوتا، جس پر مجھے خود بھی یقین نہیں آتا تھا۔ کبھی کبھی تو دل چاہتا کہ اپنا چہرہ تیزاب سے جھلسا لوں۔ لیکن یہ بات بنی آجھی طرح جاننا تھا کہ اس کی تکلیف الگ اٹھانی پڑے گی۔ اور پھر اس جھلسے ہوئے چہرے کا بھی کوئی نہ کوئی دعوے دار ضرور پیدا ہو جائے گا۔ گزارہ ہی کرنا تھا۔

آنکھیں بند کر کے ذہن کو زور سے جھٹکا۔ کاش ایک گھنٹے کے لئے ان خیالات سے بچکارا مل جائے اور سکون کی نیند سو جاؤں۔ جلتے ہوئے ذہن اور دُکھتے ہوئے بدن کو کچھ تو آرام ملے۔ نیند تو نہ آسکی لیکن کافی دیر تک ایک ہی انداز سے لیٹے رہنے سے جسمانی تھکن کی قدر کم ہو گئی اور دُکھتے ہوئے بدن کو کافی آرام ملا۔ میں ایک گھنٹے کے بعد اُٹھ کر بیٹھ آیا۔ بہت قیمتی چیز اپنے ساتھ لئے گھوم رہا تھا۔ پہلے اس کے تحفظ کا بندوبست کر لیا جائے پھر کچھ اور سوچا جائے۔ اپنی جگہ سے اُٹھا۔ گٹھری بہت مضبوطی سے باندھی ہوئی تھی۔ اسے ہاتھ لے کر آبادی کی طرف چل پڑا۔ لیکن آبادی میں داخل ہونے پر معلوم ہوا کہ وہ ایک بہت چھوٹی سی پسماندہ سی بستی تھی اور وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ قیام کے لئے کوئی جگہ بھی نہیں مل سکتی تھی۔ البتہ کوئی آدھے گھنٹے بستی میں گھومنے کے بعد میں جس جگہ جا کر نکلا، وہ ایک چھوٹا سا ریلوے سٹیشن تھا۔ راجپوتانہ ہی کی کوئی بستی تھی۔ لیکن ریلوے سٹیشن کی موجودگی نے شہریت بخشی۔ سیاہ پٹریاں بچھی ہوئی نظر آرہی تھیں۔ اور سٹیشن نام کی ایک چیز بھی تھی۔

قریباً ایک گھنٹے کے بعد مجھے ٹرین کی گڑ گڑاہٹ سنائی دی۔ اب یہ جستجو کرنا تو بے فائدہ تھی کہ یہ ٹرین کہاں جا رہی ہے؟ کہیں بھی نکل جاؤں..... کیا فرق پڑتا ہے؟ چنانچہ ٹرین کے جس ڈبے میں جگہ ملی، اُس میں جا بیٹھا۔ ڈبے کی تمام سیٹیں پر تھیں۔ دھوتی اور کمرے میں ملبوس ایک شخص نے ازراہ ہمدردی، مجھے اپنے پاس جگہ دے دی اور میں نے

یہ سب کچھ بھی میرے لئے انتہائی برق رفتار تھا۔ صورت حال کافی حد تک میری بوجھ میں آگئی تھی۔ میں نے اندازہ لگا لیا کہ رنجیت کمار نے گیان چند کے پاس پہنچ کر پدمار اُس کے حوالے کیا ہوگا اور گیان چند نے پدمار کی بازیابی کے بعد یقیناً رنجیت کمار سے وعدہ کیا ہوگا کہ وہ اُس کو اس روایتی خزانے کا ایک حصہ بطور معاوضہ ادا کرے گا۔ ہو سکتا ہے رنجیت کمار نے پدمار پر جال ڈالنے کی کوشش کی ہو جس کا علم گیان چند کو ہو گیا ہو۔ اُس پر یہ یہی بتاتا تھا کہ وہ رنجیت کمار کو دھمکی دے رہا ہے کہ اگر وہ خزانے کا یہ حصہ لے کر فوراً یہاں سے نہ چلا گیا تو اُس کے ساتھ برا سلوک کرے گا۔ اب یہ رنجیت کمار کی بد قسمتی تھی اور میری خوش قسمتی کہ اُس کی بجائے میں اتفاقاً طور پر گیان چند کے آدمیوں کے ہاتھ لگ گیا اور اُس کا ہم شکل ہونے کی وجہ سے یہ خزانہ مجھے مل گیا۔ اصل رنجیت کمار جب گیان چند کے پاس اپنا حصہ وصول کرنے پہنچے گا تو گیان چند اُس کے ساتھ جو بھی سلوک کرے گا، اُس کا اندازہ مجھے بخوبی ہو چکا تھا۔

میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ حقیقت تو یہی تھی کہ اس خزانے کا حقدار رنجیت کمار سے زیادہ میں تھا۔ کیونکہ پدمار کے سلسلے میں مجھے جس قدر بھاگ دوڑ کرنا پڑی تھی اُسے میرا دل ہی جانتا تھا۔ رنجیت کمار کی تقدیر میں یہ سب کچھ نہیں تھا۔ جب کہ میری تقدیر میں بہت کچھ لکھ دیا گیا تھا۔ کئی بار مجھے ایسے خزانے حاصل ہوئے تھے اور ہر بار میں ان سے استفادہ کرنے میں ناکام رہا تھا۔

کیسی عجیب بات ہے؟ ایک زمانے میں، میں ایک معمولی سی نوکری کے لئے سرگرداں تھا جو میرا تن من ڈھکنے اور میرا پیٹ بھرنے میں میری معاون ہو۔ لیکن آج قدم قدم پر مجھے خزانوں کے انبار مل رہے تھے اور میں انہیں خرچ نہیں کر پا رہا تھا۔ واقعی انسانی زندگی میں واقعات ہی سب سے بڑا درجہ رکھتے ہیں۔ انسان جو کچھ سوچتا ہے وہ اس طرح عمل میں نہیں آتا جس طرح اُس کی سوچ میں ہوتا ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ مجھے کرنا چاہئے؟

خزانے کو پوشیدہ رکھنا اور مناسب طریقے سے استعمال کرنا ایک بہت بڑا مرحلہ تھا جس سے ابھی گزرنا تھا۔ ہمیشہ کی مانند حالات نے پھر ایک امتحان گاہ تیار کر دی تھی۔ سوچیں، نئے خیالات، نئی منزلیں..... ان تمام چیزوں میں سے مجھے گزرنا تھا۔ کوئی ایک

چالاکی سے کام لیتے ہوئے گٹھری نہایت بے پروائی سے سیٹ کے نیچے اپنے پیروں کے پاس سرکالی۔ بھاری بھر کم آدمی خوش اخلاق معلوم ہوتا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد اُس نے میرے اس سفر کے بارے میں پوچھا۔ لیکن میں اس کا جواب گول کر گیا اور خود اُس سے پوچھ ڈالا کہ وہ کہاں جا رہا ہے؟

”آگرہ اُتروں گا۔ یہ گاڑی تو آگے چلی جائے گی مگر میں آگرے میں ہی رہتا ہوں۔“

”گڈ..... گڈ.....“ میں نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ”آپ آگرے میں کیا کرتے ہیں؟“

”سنار ہوں بھیا جی! یہاں جودھ پور میں اپنی بیٹی کے پاس آیا تھا۔ وہ یہیں بیاہ ہے۔“ اُس شخص نے جواب دیا۔ میں نے کافی خوش اخلاقی کا مظاہرہ کیا۔

”بڑی دلچسپ بات ہے کہ آپ جوہری ہیں۔ میں بھی آگرے جا رہا ہوں۔ کچھ کام ہیں مجھے وہاں۔ اور پھر مجھے اپنے دادا کے دیئے ہوئے سونے کے یہ چار سکے بھی فروخت کرنے ہیں۔ دادا جی نے خاص طور سے ہدایت کی تھی۔“

”سونے کے سکے؟ ذرا دکھاؤ تو....“ سنار نے کہا اور میں نے جیب سے ایک سکہ نکال کر اُس کی ہتھیلی پر رکھ دیا۔

سنار اُسے آنکھوں کے قریب کر کے دیکھنے لگا۔ پھر اُس نے اُسے ہتھیلی پر گھس کر دیکھا اور گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”کھرا سونا ہے۔ آسانی سے پک جائے گا۔ ویسے چار سکے نہیں، تم چاہو تو دو سکے میں بھی خرید سکتا ہوں۔ مجھے دے دو۔“

”کیا فرق پڑتا ہے..... آپ لے لیجئے۔ مجھے تو بیچنے ہی ہیں۔“

”باقی دو سکوں کے لئے اگر تم چاہو تو میری دکان پر آ جانا۔ اُس کے پیسے بھی میں دے دوں گا۔ دو سکوں کے پیسے یہیں لے لو۔“

اندھے کو کیا چاہئے دو آنکھیں..... بغیر ٹکٹ ریل میں سفر کر رہا تھا پیسے نہ ہونے کی وجہ سے۔ ویسے ایسے واقعات بھی دلچسپ ہوتے ہیں۔ جانے کتنی مالیت کا سونا میرے ساتھ تھا۔ لیکن ٹرین کا ٹکٹ لینے کے لئے پیسے نہیں تھے۔ یہ کام خوش قسمتی سے یہیں ہو گیا۔ جب ٹکٹ چیکر آیا تو میں نے بڑی اطمینان سے اُسے نوٹ دیتے ہوئے کہا کہ میں ٹکٹ

بنا۔ ٹکٹ چیکر نے وہیں مجھے ٹکٹ بنا کر دے دیا تھا۔ اس طرح یہ مشکل بھی حل ہو گئی اور یہ اندازہ بھی ہو گیا کہ میں کہاں جا رہا ہوں۔“

سفر ختم ہوا اور ہم آگرے کے ریلوے اسٹیشن پر اُتر گئے۔ یہاں وہ سنار تو مجھ سے رخصت ہو گیا اور میں ریلوے اسٹیشن سے باہر نکل کر سوچنے لگا کہ اب مجھے کیا کرنا چاہئے؟ آگرہ تاریخی مقام تھا۔ اور یہاں کچھ عرصہ رہا جاسکتا تھا۔ مجھے کون سی کوئی جلدی تھی کہیں جانے کی۔ بس! پاس جو کچھ تھا، اُسے محفوظ کرنا مقصود تھا۔ چنانچہ ایک سائیکل رکشہ کا انتخاب کیا اور کسی ایسے ہوٹل چلنے کے لئے کہا، جہاں قیام کیا جاسکے۔ میں نے اپنی شخصیت بالکل ہی تبدیل کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

رکشہ ڈرائیور نے مجھے ایک ہوٹل کے سامنے اتار دیا۔ میں نے ہوٹل میں کمرہ حاصل کرتے وقت، ہوٹل کے رجسٹر میں نام برج موہن لکھوایا۔ اس ہوٹل میں کوئی خوبی نہیں تھی۔ لیکن ایسی ہی جگہ میرے لئے محفوظ ہو سکتی تھی۔ میں نے اس گٹھری کو سنبھال کر ایک جگہ رکھا اور منہ ہاتھ وغیرہ دھو کر آرام کرنے لیٹ گیا۔

جاگا تو شام ہو گئی تھی۔ ایک بار پھر اُٹھ کر میں نے منہ ہاتھ وغیرہ دھویا اور آئندہ پروگرام کے بارے میں سوچنے لگا۔ زندگی کا کوئی خاص مقصد ہی نہیں تھا۔ نہ کہیں جانا تھا نہ کسی کا خیال ذہن میں تھا۔ لوگ آتے جاتے رہتے تھے۔ پدما کا کھیل ختم ہو گیا تھا۔ وہ اپنے باپ کے پاس پہنچ گئی تھی اور سارے مسائل حل ہو گئے تھے۔ ہاں! اب میرا کوئی دشمن ہو سکتا تھا تو وہ صرف رنجیت ہو سکتا تھا۔ کیونکہ اُسے میرے ہاتھوں چوٹ پہنچی تھی۔ لیکن اُس کے ذہن میں بھی یہ بات نہیں ہو گی کہ میں یہاں آ گیا ہوں۔ ہندوستان بہت بڑا ملک ہے۔ اس کے کسی گوشے میں جا کر رہ پڑوں گا اور بقیہ زندگی گزار دوں گا۔ بھلا کیا فائدہ کسی کی جستجو، کسی کی تلاش میں؟ جو گزر رہی ہے سوٹھیک ہے۔ بشرطیکہ خاموشی سے گزر جائے۔

میں نے بازار سے ایک عمدہ قسم کا سوٹ کیس خریدا اور کچھ ایسی ہی چیزیں جو میری ضرورت میں کام آ سکتی تھیں۔ یہاں رہ کر کم از کم لباس وغیرہ کی ضرورت بھی تھی۔ جس کا ہندوستان میں نے ہنگامی طور پر کیا۔ لیکن بعد میں ہوٹل کے کمرے تک ہی محدود رہا تھا۔ یہاں کوئی دقت نہیں ہوئی۔ ہوٹل بالکل محفوظ تھا۔ جو دو سکے فروخت کئے تھے اُن کی رقم ہی اتنی مل گئی تھی کہ سارے کام ہو گئے تھے۔ دوبارہ اُس سنار کی دکان کا رخ نہیں کیا کہ کہیں

کوئی گڑبڑ نہ ہو جائے۔ بعد میں جو ہو گا دیکھا جائے گا۔

لباس مل جانے کے بعد میں نے مزید چار سٹکے ایک اور جوہری کے ہاتھ فروخت کئے اور اُسے بھی ایک کہانی سنا دی۔ جوہری نے مجھ پر کوئی شبہ نہیں کیا تھا۔ اس طرح میرے پاس ایک اچھی خاصی رقم ہو گئی۔ میں نے سوٹ کیس کو احتیاط سے محفوظ جگہ رکھا اور گھومنے نکل گیا۔

آج میں نے تاج محل دیکھنے کا فیصلہ کیا۔ زمانہ قدیم کی یہ حسین یادگار، آج بھی اپنی تمام روایتوں کے ساتھ دنیا کے سامنے تھی۔ کیسے کیسے عجیب لوگ تھے۔ ایک دوسرے کی محبت میں دیوانے ہو جاتے تھے۔ شاید زندگی کے دوسرے مسائل اُن سے دور رہتے ہوں گے۔ شاہ جہان نے ممتاز محل سے عشق کیا اپنی پسند کے مطابق، تاج محل تعمیر کرا دیا۔ اگر وہ بھی ہم شکلوں کے بیچ پھنس جاتا تو تاج محل کا وجود اس کائنات میں نہ ہوتا۔ سیاحوں کی ٹولیاں ادھر ادھر گردش کر رہی تھیں۔ نوادرات کی دکانیں بھی ہوئی تھیں۔ تاج محل کے چھوٹے بڑے ماڈل برائے فروخت رکھے ہوئے تھے اور جانے کیا کیا چیزیں رکھی ہوئی تھیں۔

فوٹو گرافر تاج محل کے ہر حصے کی تصویر بنانے کے لئے مستعد تھے اور ہر شخص سے اس بارے میں سوالات کر رہے تھے۔ شاہ جہان کے مقبرے میں ایک مؤذن آواز کے کرشمے دکھانے کے لئے مستعد کھڑا ہوا تھا۔ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد وہ وہاں پر اذان دیتا جس کی آواز تاج محل کے بے شمار گوشوں میں پہنچ جاتی تھی۔ شاہ جہان اور ممتاز محل کی اصل قبریں نیچے تہہ خانے میں تھیں۔ اوپر اُن کی نقل بنائی گئی تھی۔

میں تاج محل کے اُس حصے کی جانب چل پڑا جہاں سے جمنا بہتی نظر آتی تھی۔ اُس طرف زیادہ لوگ نہیں تھے۔ نیچے گہرائیوں میں جمنا بہہ رہی تھی۔ اس عمارت کا حسن اپنی روایتوں کے ساتھ عجیب ہی کیفیت رکھتا تھا۔ دیر تک اس جگہ کھڑا جمنا کا نظارہ کرتا رہا۔ اُس پاس کوئی موجود نہیں تھا۔ یہ راہ داری آگے جا کر ختم ہو جاتی تھی اور اُس طرف کا گوشہ سناں پڑا ہوا تھا۔

اچانک ہی ایک عجیب سی روشنی کا احساس ہوا۔ یہ روشنی مجھ پر پڑی تھی اور میری نگاہیں بے اختیار اپنی داہنی سمت گھوم گئیں۔ اس جگہ جہاں تھوڑی دیر پہلے کوئی نہیں تھا، مجھے ایک

دش لباس عورت نظر آئی جو بلند قامت تھی۔ اُس کے ہاتھ میں کیمرو دبا ہوا تھا اور یقیناً یہ اس کیمرے کی روشنی ہی تھی جو دن کی وجہ سے بہت زیادہ محسوس نہیں ہوئی تھی۔ مگر یہ احساس ضرور ہو گیا تھا کہ کوئی چیز چمکی ہے۔ عورت نے کیمرو نیچے کیا اور بے پردائی سے میرے نزدیک سے گزر گئی۔ لیکن ایک عجیب سا احساس میرے ذہن میں جاگزیں ہو گیا تھا۔ مجھے یوں محسوس ہوا تھا جیسے میری تصویر لی گئی ہو۔ ویسے تو سیاح تاج محل کے گوشے گوشے کی تصاویر لے رہے تھے۔ شاید ان پر پابندی بھی عائد کر دی گئی ہے۔ لیکن یہ پابندی غیر ملکی سیاحوں پر نہیں ہے یا ہوگی، مجھے اس کا اندازہ نہیں۔ لیکن یہ تصویر تاج محل کے کسی گوشے کی نہیں لی گئی تھی۔ کیونکہ میں بھی احمق آدمی نہیں تھا۔ میں پوری طرح فلاش لائٹ میں آیا تھا۔ یہ سر پھرے لوگ ہوتے ہیں۔ ہو سکتا ہے اُس خاتون کو میرا یہ پوز پسند آ گیا ہو اور انہوں نے بہتی ہوئی جمنا کے ساتھ ساتھ میری تصویر بھی لے ڈالی ہو۔ یہ کوئی ایسی خاص بات بھی نہیں تھی۔ لیکن جانے کیوں میرے ذہن میں چبھتی رہی۔ خاتون بھی کچھ عجیب و غریب خدو خال کی مالک تھیں۔ مغربی لباس تھا لیکن چہرے کے نقوش خالص مغربی نہیں کہے جاسکتے تھے۔ رنگ انگریزوں کی مانند تھا، لیکن انگریزوں جیسی کھردراہٹ چہرے پر نہیں تھی۔ بلکہ اس میں ایک انوکھی سی ملاحظت تھی جسے کوئی تشبیہ نہیں دی جاسکتی تھی۔ خدو خال سے خاصی حسین عورت تھی۔ اور عمر کے بارے میں کوئی صحیح اندازہ نہیں لگایا جاسکتا تھا۔ تیس سے لے کر پینتالیس تک کوئی بھی عمر تعین کی جاسکتی تھی۔ وہ آگے بڑھ کر میری نگاہوں سے اوجھل ہو گئی اور میں شانے جھٹک کر پھر جمنا کی جانب متوجہ ہو گیا۔ یہ بات قابل غور نہیں تھی جس پر میں مسلسل توجہ دیتا۔

تاج محل سے نکل کر اپنے ہوٹل پہنچ گیا۔ مجھے یہ اندازہ ضرور ہو گیا تھا کہ آگرہ میری مستقل رہائش گاہ نہیں بن سکتا۔ یہاں ایسی خوبی نہیں تھی کہ قدم جمانے کے بارے میں سوچا جاسکے۔ پھر یہیں سے فتح پور سیکری کے بارے میں معلومات حاصل کیں اور فتح پور سیکری روانہ ہو گیا۔

فتح پور سیکری میں، میں نے ”بلند دروازہ“ دیکھا جو بلاشبہ عظیم تھا۔ وہ عظیم الشان مسجد دیکھی جس میں خواجہ سلیم الدین چشتی کی درگاہ مبارک تھی۔ اس کے بعد رانی جودھابائی کے محل کی جانب آ گیا۔ یہاں آکر میں مغلوں کی تاریخ میں کھو گیا اور مجھے اپنے اطراف میں

ہلکی ہلکی سرسراہٹیں سنائی دینے لگیں..... دورِ مغلیہ نگاہوں کے سامنے آ گیا تھا..... باادب! ملاحظہ کی آوازیں سرگوشیوں کے انداز میں کانوں میں ابھرنے لگی تھیں۔ ایک عجیب سا حیرت انگیز اور دل پر طاری ہو گیا۔

ایک تیز آواز سنائی دی تو میں چونک اُٹھا۔ سہمی ہوئی نگاہوں سے پلٹ کر دیکھا اور گہری سانس لے کر رہ گیا۔ آواز ایک پتھر کے لڑھکنے سے پیدا ہوئی تھی اور پتھر میرے جیسے کسی سیاح کی ٹھوکر سے اپنی جگہ سے ہٹا تھا۔ مجھے دو پاؤں نظر آئے جو سیڑھیاں اتر رہے تھے۔ یہ سیڑھیاں ایک تنگ دروازے کی شکل میں تھیں اور نیچے آنے والے کا چہرہ اسی وقت نظر آ سکتا تھا جب وہ نیچے آ جائے۔ کوئی جھک کر آخری سیڑھی اترنے کے بعد باہر نکلا اور میری آنکھیں اُسے دیکھتی رہ گئیں۔ ایک لمحے میں، میں نے اُسے پہچان لیا..... یہ وہی سیاح عورت تھی جس نے تاج محل میں میری تصویر بنائی تھی۔ اُس نے بھی ٹھٹھک کر مجھے دیکھا۔ اُس کی آنکھیں میرا جائزہ لیتی رہیں۔ پھر وہ سپاٹ چہرہ لئے آگے بڑھ گئی۔ میں سحرزدہ سا ہو گیا تھا۔ یہ سب کیا ہے؟ اُس عورت کا چہرہ بلاشبہ حسین تھا۔ لیکن اُس کے خدوخال میں ایک ایسی بات تھی جسے میں الفاظ کا جامہ نہیں پہنا سکتا تھا۔ لیکن میں نے اُسے ذہن سے نکال پھینکا اور فتح پور سیکری کے مزید علاقے دیکھنے میں مصروف ہو گیا۔ وہاں میں دو دن رکا اور پھر بمبئی روانہ ہو گیا۔

بمبئی عالمی شہر اور ہندوستان کی فلمی زندگی کا مرکز ہے۔ میرے ذہن میں بمبئی کا تصور اُس وقت بھی تھا جب میں خالہ شہادت کی کھولی میں رہتا اور ننھے منے معصوم سے خواب دیکھتا تھا۔ اب تو زندگی نے رنگ ہی کچھ اور اختیار کر لئے تھے۔ چھوٹی موٹی چیزیں ذہن میں آتی ہی نہیں تھیں۔

ریلوے سٹیشن پر ہی مجھے ہوٹلوں کے بارے میں تفصیلات معلوم ہو گئیں اور میں نے بھی ایک عمدہ سے ہوٹل کا انتخاب کر لیا۔ ہوٹل میں داخل ہونے کے بعد یہ اندازہ نہیں ہو سکا کہ ہندوستان کے کس شہر میں ہوں۔ کچھ دیر آرام کیا اور رات کو ایک انتہائی اعلیٰ درجے کے ہوٹل میں پروگرام دیکھنے گیا۔ کچھ خاص رقاصائیں اور چند مقامی فنکار سٹیج شو پیش کر رہے تھے جس کا اہتمام ایک ہوٹل نے کیا تھا اور کافی پہلے کی گئی تھی۔ ایک ایک میز پر چار چار افراد کے لئے گنجائش رکھی گئی تھی۔ میں جس میز پر بیٹھا، اُس پر صرف ایک فرد آیا ہوا تھا۔

بہت سی سیٹیں خالی تھیں۔ لیکن اُن پر ریزرویشن کے کارڈ لگے ہوئے تھے۔ سٹیج پر تیز روشنیوں میں آرکسٹرا مدھم موسیقی بکھیر رہا تھا۔

ابھی پروگرام شروع نہیں ہوا تھا۔ میری نگاہیں اطراف میں بھٹکنے لگیں۔ بمبئی سے متعلق جنی روایتیں تھیں وہ سب کی سب یہاں زندہ تھیں۔ مختلف صوبوں کے لوگ، مختلف چہرے لئے میرے سامنے تھے۔ میں اُن کا جائزہ لیتا رہا۔ اور پھر میں نے کرسی ہلکی سی گھمائی اور اپنے عقب میں دیکھنے لگا۔ میرے بالکل ہی برابر والی میز پر بھی تین سیٹیں خالی تھیں۔ اور صرف ایک خاتون اُس میز کے پیچھے بیٹھی ہوئی تھی۔ میں نے یونہی سرسری نگاہوں سے جائزہ لیا تو میرے ذہن کو ایک شدید جھٹکا لگا اور میں ایک لمحے کے لئے ساکت رہ گیا..... یہ چہرہ میرے لئے اجنبی نہیں تھا۔ یہ وہی سیاح عورت تھی، جس سے دو بار میری ملاقات ہو چکی تھی۔ وہ اس وقت بھی مجھے ہی دیکھ رہی تھی اور میں اپنے جھنجھناتے ذہن پر قابو پانے کی کوشش کرتا رہا۔ کیا یہ صرف اتفاق ہے؟ کیا اب بھی اسے اتفاق قرار دیا جاسکتا ہے؟ میں نے سوچا اور جرات سے کام لے کر اُٹھ گیا۔ میرا رخ اُسی کی میز کی جانب تھا۔ اب اس حقیقت کی نقاب کشائی ہو جانی چاہئے۔

اُس کی مدھم لیکن گونج دار آواز سنائی دی۔ ”بیٹھ جائیے پلیز.....“

میں ایک لمحے کے لئے جھجکا۔ لیکن کرسی سرکا کر بیٹھ گیا۔ اب جب یہاں تک آ ہی گیا تھا تو باقی مراحل بھی طے ہو جانے چاہئیں تھے۔

میرا خیال تھا کہ مجھے اس طرح سامنے دیکھ کر اُس کے انداز میں کوئی تبدیلی پیدا ہوگی یا دو میری آمد کو بہت اچھے انداز میں نہیں لے گی کیونکہ پہلی ملاقاتوں میں اُس نے مجھے صرف دیکھنے پر ہی اکتفا کیا تھا۔ لیکن میں نے اُس کے چہرے کی طرف دیکھا تو وہ بالکل پرسکون تھی۔ چند لمحات کے لئے میں اُس کے قریب آنے کی وجہ بھی بھول گیا۔

”کیا پیسے گے آپ؟“ اُس نے بڑی نرمی سے پوچھا۔

”شکریہ..... کچھ نہیں۔“

”کیا خدمت کر سکتی ہوں آپ کی؟“ اُس نے سوال کیا۔

اب میرے لئے خاموش رہنا ناممکن تھا۔ میں نے اپنا حلق صاف کیا اور آہستہ سے بولا۔ ”شاید آپ کو یہ احساس ہو کہ یہ ہماری پہلی ملاقات نہیں ہے۔“

”یہاں آپ نے لفظ احساس کا استعمال غلط کیا ہے۔ مجھے یقین ہے بلکہ میں اچھی طرح جانتی ہوں کہ پہلے بھی ہماری ملاقاتیں ہوتی رہی ہیں اور یقینی طور پر آپ اسے ایک دلچسپ اتفاق سمجھ رہے ہوں گے۔“

”بد قسمتی سے میرے ذہن میں تجسس کا مادہ بہت زیادہ ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ میں بے چین ہو کر آپ کے سامنے آ گیا۔“

”آپ اسے تجسس کہہ لیں۔ لیکن میں کچھ اور سمجھتی ہوں۔“ اُس نے پر اعتماد مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

زندگی میں اب اتنا کچھ حاصل ہو چکا تھا مجھے کہ میں اپنے آپ کو نا تجربہ کار شخص نہیں کہہ سکتا تھا۔ اتنی ہمت پیدا ہو گئی تھی کہ جرات سے کسی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کر سکوں۔ لیکن یہ پراسرار عورت..... یہ پراسرار وجود، اُس وقت مجھے احساس دل رہا تھا کہ میرا تجربہ غلط ہے اور کوئی شخصیت ایسی بھی میرے سامنے آ سکتی ہے جس کے نزدیک پہنچ کر زبان میرا ساتھ چھوڑ دے۔ اس وقت بھی یہی احساس ہو رہا تھا۔ میں کچھ نہ بول سکا۔ وہ خاموشی سے میری صورت دیکھتی رہی۔ پھر اُس نے کہا۔

”میں آپ کا تجزیہ کر رہی ہوں۔ آپ مجھے مسلسل اپنے ساتھ دیکھ رہے ہوں گے۔“

”ہاں! میں اسے اتفاق ہی سمجھ رہا ہوں۔“

”نہیں..... یہ اتفاق نہیں ہے۔ میں آپ کا تعاقب کر رہی ہوں۔“ اُس نے بہت صاف گوئی سے کام لے کر کہا۔

”اس کی کوئی خاص وجہ؟“

”دنیا کا کوئی بھی کام بے مقصد نہیں ہوتا۔“

”میں یہ مقصد جاننا چاہتا ہوں۔“

”بے شمار باتیں اپنے وقت پر سامنے آ جاتی ہیں۔ وقت سے پہلے انہیں نہیں جانا جا سکتا۔“

”گویا آپ یہ بتانے پر آمادہ نہیں ہیں کہ آپ میرا تعاقب کیوں کر رہی ہیں؟“ میں ہمت کر کے بولا۔

”نہیں.....“ وہ اُسی ٹھوس لہجے میں بولی۔

اب میرے پاس کوئی اور سوال نہیں تھا۔ میں احمقوں کی طرح اُس کے سامنے بیٹھا رہا۔ مسکراتی رہی۔ میرے ذہن میں اُس کے لئے حیرت پیدا ہو گئی تھی۔ چند لمحے میں نے بچتے رہنے کے بعد کہا۔

”لیکن آپ آخر مجھ سے چاہتی کیا ہیں؟ میرا مطلب ہے میں آپ کے کس کام آ سکتا ہوں؟“

”فی الحال اگر آپ چاہیں تو میرے دوست بن سکتے ہیں۔ بہت سی باتیں چند لمحات میں نہیں سمجھائی جاسکتیں۔ اتنا میں آپ کو بتا دوں کہ میرے دوست بن کر آپ فائدے میں رہیں گے۔“

”چلے ٹھیک ہے۔ میں یہ بات تسلیم بھی کر لوں کہ کسی طرح آپ میری شخصیت سے واقف ہو گئی ہیں لیکن آپ کا دوست ہو کر میں آپ کو کیا فائدہ پہنچا سکتا ہوں؟“

”دوستوں کو فائدے یا نقصان کے لئے منتخب نہیں کیا جاتا۔ بس! بعض اوقات جی چاہتا ہے کہ کسی سے دوستی کر لی جائے۔ اب اُس کے نفع اور نقصان کا مسئلہ تو بعد میں سامنے آتا ہے۔“

”بے مقصد دوستی کسی سے نہیں کی جاتی۔“

”میں نے کب کہا؟ بلکہ میں نے تو یہ اعتراف بھی کیا کہ میں جو ہر شناس ہوں اور میں نے تمہاری شخصیت میں وہ چیزیں تلاش کر لی ہیں جو میرے لئے کارآمد ہو سکتی ہیں۔“

”آپ کی دوستی قبول کر کے مجھے کیا فائدہ ہوگا؟“

”آپ بار بار یہی سوال دہرا رہے ہیں۔ میں نے کہا نا فائدہ یا نقصان تو بعد ہی میں سامنے آتا ہے۔ یہ بتائیے آپ میری دوستی قبول کرنا پسند کریں گے یا نہیں؟“

”فرض کیجئے میں ہاں کہہ دوں تو؟“

”تو پھر میں آپ سے آپ کے بارے میں بھی پوچھوں گی کہ آپ کون ہیں؟ آپ کا فون کبال سے ہے؟“

”اور اس کے جواب میں آپ مجھے اپنے بارے میں بتائیں گی؟“

”اُس حد تک جہاں تک مناسب ہو۔“

”گویا حدود کا تعین کیا جائے گا۔“ میں نے خود کو سنبھال کر کہا۔

یہ سب سے تسلیم کر لے۔ میں سوچ رہا تھا کہ آپ سے آپ کے بارے میں معلوم کروں
میں نے آپ سے پہلے ہی کہا تھا کہ میرے ذہن میں تجسس تھا لیکن آپ اپنے آپ کو
بہت زیادہ ڈرامائی بنانے کی کوشش کر رہی ہیں تو معاف کیجئے گا میرے ذہن میں آپ کا وہ
نیم نہیں رہا۔ ہاں! اگر آپ اچھے انسانوں کی طرح مجھ سے اپنا تعارف کروادیتیں تو شاید
میں آپ کی دوستی قبول کر لینے پر بھی غور کرتا۔

”جار ہے ہیں؟ ٹھیک ہے۔ ظاہر ہے میں نے آپ کو خود نہیں بلایا تھا۔ آپ آئے
نے۔ آپ کو جانے سے بھی نہیں روک سکتی۔ لیکن ایک بات ذہن نشین کر لیجئے کہ وقت ہمارا
تعارف کرائے گا اور اُس وقت، آپ کو افسوس ہو گا کہ آپ نے میری دوستی کی پہلی
پیشکش کو قبول کیوں نہیں کیا۔“
میں تلخی سے مسکرایا اور ہال سے نکل کر اپنے ہوٹل چلا آیا۔

کمرے میں آ کر میں نے لباس تبدیل کیا اور سونے کے لئے مسہری پر دراز ہو گیا۔
میں مختلف خیالات کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ دفعۃً دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی۔ میں نے
بند کر گھڑی دیکھی۔ اس وقت روم سروس کا کوئی آدمی تو نہیں ہو سکتا کیونکہ قواعد کے
مطابق مقررہ اوقات کے بعد مہمانوں کے دروازے نہیں کھٹکائے جاتے۔ پھر کون ہیں؟
میں نے دروازہ کھول کر باہر جھانکا۔ نارنجی رنگ کی خوبصورت ساڑھی میں ملبوس ایک
ایمانی جسامت کی لڑکی سامنے کھڑی تھی۔ ”جی فرمائیے.....“ میں نے پوچھا۔

”تھوڑی سی جگہ دیں گے اندر آنے کے لئے؟“ اُس نے بے باکی سے سوال کیا اور
میں نے بے اختیار پیچھے ہٹ گیا۔ وہ اندر آ گئی اور دروازہ بند کر دیا۔
”کون ہیں آپ..... اور کیا چاہتی ہیں؟“ میں نے اُس کی اس حرکت کو تعجب کی نگاہ
سے دیکھا تھا۔

”میں تنہائیوں کی ساتھی ہوں۔ بملا ہے میرا نام۔“
”کس نے آپ سے کہا کہ میں تنہا ہوں؟“
”میرے دل نے۔ میں نے محسوس کیا کہ تم یہاں اس وقت کسی کی کمی محسوس کر رہے ہو۔“
”دروازہ کھولو اور باہر نکل جاؤ۔ میں تم جیسی لڑکیوں کو اچھی طرح سمجھتی ہوں۔ سوری
ہے، تم غلط کمرے میں آ گئیں۔“

”ہاں، حدود ہر حال میں قائم رہنی چاہئیں، ورنہ نقصانات بھی ہو جاتے ہیں۔ آپ نے
بتائیے! آپ کون ہیں؟“

”میرا نام منصور ہے اور میں صرف ایک سیاح ہوں۔“

”تعلق کہاں سے ہے؟“

”آپ ساری دنیا سے میرا تعلق سمجھ سکتی ہیں کیونکہ اب تو میں اپنی اصل جگہ ذہن سے
فراموش کر چکا ہوں۔“

”کون کون سے ممالک گھومے ہیں آپ نے؟“

”بے شمار۔“ میں نے مختصر جواب دیا۔

”بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر..... اور مجھے یقین ہے کہ مستقبل میں آپ کو بھی مجھ
سے مل کر بہت خوشی ہوگی۔“ اُس نے جواب دیا۔

”اب یہی سوال میں آپ سے کرنا چاہتا ہوں میڈم!“

”بس! میں اپنی زندگی کے بارے میں خود بھی کچھ نہیں جانتی۔ کون ہوں؟ کیا ہوں؟
بہت سے سوالات میرے ذہن میں اُلجھتے رہتے ہیں۔“

”نام کیا ہے آپ کا؟“

”نام..... ہم ناموں کو تعارف کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ تعارف کے لئے بعض اوقات
صورتیں بھی کافی ہوتی ہیں۔ تم مجھے اپنی ایک صورت آشنا سمجھ لو اور بس.....“

”کیا یہ اس حقیقت سے انحراف نہیں ہے کہ آپ اپنے آپ کو برتر سمجھتی ہیں؟“

”نہیں یہ حقیقت ہے کہ میں بہت سوں سے برتر ہوں۔“ عورت نے جواب دیا۔

”اور اگر میں آپ کی برتری تسلیم نہ کروں تو؟“

”کوئی بات نہیں۔ میں برتری تسلیم کراتی ہوں اور کچھ دن کے بعد میرے شناساؤں
اپنے خیالات تبدیل کرنا پڑتے ہیں۔“ اُس کے لہجے میں ایک غرور سا شامل ہو گیا تھا۔

”مجانے کیوں مجھے اُس کے یہ الفاظ اپنی توہین محسوس ہوئے۔ میں نے آہستہ سے کمرے کی
کھدکائی اور بولا۔“

”میڈم! ہو سکتا ہے آپ ڈرامائی زندگی گزارنے کی عادی ہوں۔ آپ نے اپنے آپ
کو ایک پراسرار اور پرجہر شخصیت تسلیم کیا ہو۔ لیکن ضروری نہیں ہے کہ ہر شخص آپ کی

”میں کبھی غلط جگہ کا انتخاب نہیں کرتی۔“

”کاش! تم کوئی شریف لڑکی ہو تیں تو میں تمہیں احترام سے کہتا کہ بیٹھو یا چلی جاؤ۔“ مجھے دیکھتی رہی۔ اُس کے ہونٹوں کی مسکراہٹ آہستہ آہستہ غائب ہوتی جا رہی تھی۔ میرے اُس کے چہرے پر یہ بدلتے ہوئے تاثرات دیکھے تو آہستہ سے بولا۔ ”لڑکی! میں ان راستوں کا راہی نہیں ہوں جن کا تم نے مجھے سمجھ لیا ہے۔ لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تمہیں کیسے یہ بات معلوم ہوئی کہ میں یہاں اس کمرے میں تنہا ہوں۔“

”سوری مسٹر.... سوری! دراصل.... دراصل....“ اُس نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔ ”ہاں کہو! آگے کہو۔“

”کوئی بات نہیں۔ میں جا رہی ہوں۔“ اُس نے دروازہ کھولا اور واپسی کے لئے پلٹ۔ ”ایک منٹ.... ایک منٹ.... اندر آؤ!“ میں نے کہا۔ وہ ایک لمحے کے لئے رُک کر پھر اُس کے ہونٹوں کی مسکراہٹ واپس آ گئی۔ ”نہیں۔ تم غلط سمجھی ہو۔ میں نے تمہارے چہرے پر ایک عجیب سا تاثر دیکھا، جس نے مجھے تمہیں دوبارہ واپس بلانے پر مجبور کر دیا۔ میرا وہ مقصد نہیں ہے جو تمہارے ذہن میں آیا ہے۔“

”دراصل جناب میں.... میں اس وقت مجبور ہوں۔ انتہائی مجبور.... مجھے پیسے چاہئیں۔ میرے لئے تھوڑی سی رقم بے حد ضروری ہے۔ زرنہ بہت سے نقصانات سے دوچار ہو چکا ہوں۔ جانے کیوں آج تقدیر کچھ ساتھ نہیں دے رہی۔ کئی جگہ کوشش کی۔ لیکن کامیاب نہیں ہوئی۔ بڑی ہمت کر کے یہاں تک پہنچی تھی۔“

”ہوں.... کم از کم کتنی؟“ میں نے سوال کیا۔

”جو کچھ بھی آپ دے دیں۔“

”لو! یہ پیسے رکھ لو۔ اور جاؤ! اگر تم فریب کر رہی ہو تو بھی مجھے یہ پیسے دے کر کہاں افسوس نہیں ہوگا۔ لیکن بہتر ہے کہ آئندہ ایسا فریب کبھی کسی کے ساتھ نہ کرنا۔“

”اُس نے عجیب سی نظروں سے دیکھا۔ پیسے لئے اور آہستہ سے بولی۔ ”بھوان! سو گند! میں نے فریب نہیں کیا۔“ اُس نے یہ کہا اور پھر باہر نکل گئی۔ میں نے دروازہ بند کیا اور واپس بستر پر آ لیٹا۔

صبح تقریباً ساڑھے آٹھ بجے آنکھ کھلی تو میں نے گنگناتے ہوئے غسل خانے کا رخ کیا۔ ابھی پوری طرح نہا بھی نہ۔ کتا تھا کہ دروازے پر زور زور سے دستک سنائی دینے لگی۔ میرے غسل خانے سے ہی آواز لگائی کہ انتظار کرو، آ رہا ہوں۔ کوئی ویٹر وغیرہ ہو سکتا تھا۔ غسل کے بعد بال سنوارتا ہوا باہر نکلا۔ پہلے جس شخص پر نگاہ پڑی، وہ ہندوستانی پولیس آفیسر تھا.... اُس کی آنکھیں مجھے گھور رہی تھیں۔ پھر اُس نے مشتبہ انداز میں ادھر ادھر دیکھا اور ابی اندر گھس آیا۔ اُس کے پیچھے تین پولیس والے اور ہوٹل کے عملے کے کچھ افراد بھی بنجھیں میں نہیں پہچانتا تھا۔ ان سب کو اس جارحانہ انداز میں اندر آتے دیکھ کر میں ہٹکا مار گیا تھا۔ میری چھٹی حس نے اعلان کیا کہ کوئی لڑ بڑ ہو گئی ہے۔

”ہوں.... تو یہ تم ہو۔“ آفیسر نے مجھے گھورتے ہوئے کہا۔

”فیریت آفیسر، کیا بات ہے؟“ میں نے متحیرانہ انداز میں پوچھا۔

”اور کون رہتا ہے یہاں تمہارے ساتھ؟“

”کوئی نہیں۔ مگر تمہیں کیا تکلیف ہے؟“

”تکلیف تو تمہیں پہنچنے والی ہے دوست! کتنی معصوم صورت بنائے کھڑے ہو۔“

”آفیسر! بات بتائے بغیر فضول باتوں سے گریز کریں آپ!“ میں نے کسی قدر کراخت کا اظہار کیا جس کے اثرات کچھ بہتر نمایاں ہوئے۔ آفیسر ایک لمحے کے لئے جھجک گیا تھا۔

”تم نے لڑکی کو کیوں قتل کیا؟ کیا بات تھی؟“

”کیا....؟“ میں نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر پوچھا۔

”تمام مجرم ایسی ہی اداکاری کرتے ہیں۔“

”میں ایک بار پھر آ رہا ہوں آفیسر! کہ ذرا احتیاط سے گفتگو کریں۔ میں بھی

”جیسا نایہ سونے کے زیورات اور جواہرات وغیرہ؟“
میں کچھ نہ بولا۔

”آئیے..... بہتر ہے کہ یہ سب سامان یہاں سے نکال لیں۔ لاکرز میں بہت عرصے رہے۔ اب پولیس کی تحویل میں رہنا چاہئے۔“

میں بھلا کیا انکار کر سکتا تھا؟ ڈی ایس پی نے سامان نکلوا کر ایک تھیلے میں بھرا اور اُسے بل کر دیا۔ مجھے لاک اپ میں بھیج دیا گیا۔ ڈی ایس پی نے تھانے جا کر مجھ سے اور کوئی بات نہیں کی۔

لاک اپ میں پہنچ کر میں زمین پر لیٹ گیا۔ پھر نئی قسم کی مصیبتوں کا آغاز ہو چکا تھا اور میں پھر پولیس کی نگاہ میں تھا۔ یہ آنکھ مچولی تو میری زندگی میں بہت اہمیت رکھتی تھی۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ اس کا انجام کیا ہوگا اور اس نئے مسئلے سے میں کیسے بچ سکوں گا؟

غالباً اُس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ میں نے اُس کے ساتھیوں کے سامنے بہت تلخ اور کسی قدر بہتدہی سے گفتگو کی تھی۔ چنانچہ وہ مجھے زیادہ سے زیادہ ذلیل و خوار کرنے پر تل گیا تھا۔ لاک اپ میں پہنچنے کے بعد جب میں نے سنجیدگی سے حالات پر غور کیا تو دفعۃً ہی مجھے پُر غصہ آ گیا۔ اُن لوگوں نے جو کچھ میرے ساتھ سلوک کیا تھا، وہ یقیناً زیادتی تھی۔ بھلا کیا ثبوت ہے اُن کے پاس کہ بھلا کا قاتل میں ہوں۔ وہ تو میرے کمرے میں بھی نہیں پائی گئی۔ بے شک وہ میرے پاس آئی ضرور تھی لیکن میرے اور اُس کے درمیان جو لمحات گزرے اور جتنی گفتگو اُس نے کی، اُس بارے میں جانے بغیر ان لوگوں نے مجھے اُس کا قاتل سمجھ لیا۔ جس سے میری ملاقات لمحاتی تھی۔

پولیس سٹیشن میں تقریباً مجھے چار گھنٹے یونہی گزارنے پڑے اور ایک ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ کی موجودگی میں مجھے باہر نکال لیا گیا۔ ڈپٹی کسی قدر نرم مزاج اور سلیقے کا آدمی تھا۔ اُس نے سر سے پاؤں تک مجھے دیکھا اور پھر کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ پھر وہ مجھ سے بولا۔ ”کیا یہ سچ ہے کہ آپ نے بھلا کو ہلاک کر کے اُس کی لاش سیڑھیوں کے نیچے پھینک دی؟“

”آفیسر! بہت افسوس کی بات ہے کہ کسی بھی حقیقت کا ثبوت حاصل کئے بغیر آپ نے مجھے نقصان پہنچانے کی کوشش کی اور انتہائی غیر ذمہ دارانہ انداز میں مجھے یہاں لے آیا گیا۔“

کوئی گیارہ گز را آدمی نہیں ہوں۔ آپ کو مشکل پڑ جائے گی۔“
”مجرم کتنا ہی بڑا آدمی ہو۔ پولیس اُسے کوئی اہمیت نہیں دیتی۔“

”آپ مجھے کم از کم یہ تو بتائیے کہ مجھ پر الزام کیا ہے؟“

”تم نے بھلا نامی لڑکی کو قتل کیا ہے۔“

”کیا.....؟“ میں حیرت سے اُچھل پڑا۔ بھلا کا نام میں نہیں بھول سکا تھا۔ پھر میں نے

بے ساختہ پوچھا۔ ”کک..... کیا..... کیا اُسے قتل کر دیا گیا؟“

”کیا تم بھلا کے قتل کی وجہ بتا سکتے ہو؟“

”تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے آفیسر! کہاں ہے اُس کی لاش؟“

”جہاں تم نے اُسے پھینکا۔ سیڑھیوں کے نیچے جو خلا بنا ہوا ہے، وہاں لاش پڑی ہے۔“

پولیس وہاں متعین ہے، کیا سمجھے؟ وہاں تمہاری انگلیوں وغیرہ کے نشانات ضرور موجود ہوں گے۔ سب کچھ پتہ چل جائے گا۔ چلو..... تیاریاں کرو!“

”کک..... کہاں؟“

”پولیس سٹیشن..... ظاہر ہے تمہیں وہیں لے جانا ہے۔“ پولیس آفیسر نے کہا۔

میں بڑا پریشان ہو گیا تھا۔ بھلا بے شک میرے پاس آئی تھی۔ لیکن قتل..... کس نے قتل کر دیا اُسے؟ میں پولیس آفیسر کے ساتھ باہر نکل آیا۔ میرا تمام سامان پولیس نے اپنے

تحویل میں لے لیا اور پولیس آفیسر مجھے ساتھ لے کر باہر نکل آیا۔ یہی شکر تھا کہ اُس نے میرے ہاتھ میں ہتھکڑی لگانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ غالباً اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ اُسے شہ

ضرور ملے تھے کہ بھلا کا قاتل میں ہو سکتا ہوں، لیکن کوئی ٹھوس ثبوت اُس کے پاس موجود

نہیں تھا۔ میری درخواست پر اُس نے مجھے سیڑھیوں کے نیچے بھلا کی لاش دکھائی، جس نے

فوٹو گراف وغیرہ بنائے جا چکے تھے اور اب اُسے اُٹھانے کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ بھلا

غالباً گردن دبا کر ہلاک کیا گیا تھا۔ مجھے اس لڑکی کا مظلوم چہرہ دیکھ کر جانے کیوں

دکھ ہوا۔ اُس نے چلتے وقت قسم کھائی تھی کہ اُس نے مجھ سے فریب نہیں کیا۔ لیکن اُسے

نے قتل کیا؟ میرا ذہن چند لمحات کے لئے ماؤف ہو گیا تھا۔

پولیس آفیسر کو خواجواہ مجھ سے کد ہو گئی تھی۔ گڈ..... ویری گڈ..... آپ تو یوں لگتے

جیسے انگریزوں کا ہندوستان سے لے جایا ہوا سارا مال واپس لے آئے ہیں۔ لندن میں

”نہیں..... ایسی بات نہیں ہے۔ دراصل! آپ کے سلسلے میں چند ایسے لوگوں نے گواہیاں دی ہیں جنہوں نے بملا کو اور آپ کو ایک ساتھ دیکھا ہے۔“

”غلط..... بالکل غلط۔“

”میں آپ کا اُن سے تعارف کرائے دیتا ہوں۔ بلاؤ!“ اُس نے غالباً انسپکٹر سے کہا اور اُس نے ایک شخص کو اندر بلا لیا جو ویٹر کے لباس میں ملبوس تھا۔ میں اُسے نہیں جانتا تھا۔ اندر آنے کے بعد وہ سہا سہا سا ایک طرف کھڑا ہو گیا۔

”ہوں..... تم بتاؤ! تم نے کیا دیکھا؟“

”صاحب! میری رات کی ڈیوٹی تھی۔ اُس وقت مہمانوں کی آمد و رفت بہت کم ہو گئی تھی۔ میں گیلری میں کھڑکی کے پاس کھڑا ہوا تھا کہ میں نے اُس لڑکی کو ان کے دروازے پر دستک دیتے ہوئے دیکھا۔ پھر وہ کمرے کے اندر چلی گئی اور میں پریشانی سے یہ سوچتا رہ گیا کہ مینجر صاحب کو اس بارے میں اطلاع دوں یا نہ دوں..... صاحب! ہمارے ہوٹل میں عیاشی نہیں ہوتی۔ ہم نے اس سلسلے میں خاص طور سے نگاہ رکھی ہے۔ مگر یہ سب کچھ..... یہ سب کچھ..... میں وہاں سے ہٹ کر مینجر صاحب کے کمرے کی طرف گیا تو مینجر صاحب مجھے اپنے کمرے میں نہیں ملے۔ بہر طور! میں واپسی گیلری میں آ گیا۔ پھر میں نے سوچا کہ جب وہ واپس جائے گی تو میں اُس سے بات چیت کروں گا۔ پھر میں انتظار ہی کرتا رہا۔ لیکن وہ واپس نہیں گئی۔“

”ہوں..... کیا خیال ہے جناب؟ ویسے اتفاق سے ہم ابھی تک آپ کے بارے میں بھی نہیں جان سکے۔“

”میرا نام منصور ہے۔ سیاح ہوں اور بغرض سیاحت یہاں آیا ہوا ہوں۔ زیادہ دن نہیں گزرے، آگرہ اور دہلی دیکھ کر یہاں پہنچا ہوں۔ ویسے لندن کا باشندہ ہوں۔ مستقل وہیں قیام رکھتا ہوں۔“

”گڈ..... گڈ! بہر طور! ہم آپ کا احترام کرتے ہیں۔ لیکن قانون شکنی کو کسی صورت میں بھی معاف نہیں کیا جاسکتا۔ کیا آپ یہ بتانا پسند کریں گے کہ بملا کو آپ نے کیوں قتل کر دیا؟“

”ڈی ایس پی صاحب! میں اس بارے میں بالکل کچھ بھی نہیں جانتا۔ کیوں آپ اس

تاکو میرے نام سے منسوب کر رہے ہیں؟“

”اوہو..... اوہو..... نہیں۔ نہیں! آپ کا یہ خیال غلط ہے۔ ایک منٹ بلاؤ۔“ اُس نے پی سی کے انداز میں پھر انسپکٹر سے کہا اور انسپکٹر پھر باہر نکل گیا۔ اس بار وہ ایک ایسے شخص کے ساتھ لے کر آیا جو دھوتی اور کرتے میں ملبوس تھا۔ چہرے ہی سے بد مزاج آدمی نظر آتا تھا۔ ادھیڑ عمر تھا۔ وہ اندر آگیا اور آتے ہی بولا۔

”واہ صاحب..... یہ اچھی بات ہے، کمرے کوئی بھرے کوئی۔ یعنی نیکی کرو اور بھاڑ میں چلے جاؤ۔ ہم سے غلطی ہو گئی صاحب! معاف کر دیجئے۔ آئندہ کبھی دھرم سدھارنے کی کوشش نہیں کریں گے۔ سماجی کارکن نہیں بنیں گے۔ بس! غلطی ہو گئی ایک بار۔ آئندہ نہیں ہوگی۔“

”آپ تفصیل تو بتا دیجئے.....“ پولیس آفیسر نے پوچھا۔

”ارے بھائی! تفصیل کیا..... بگڑے ہوئے نوجوان ہیں آج کل کے۔ عیاشی کے بغیر زندگی نہیں گزرتی۔ ہم اچھے خاصے سو رہے تھے کہ دروازے پر دستک سنائی دی۔ گھر والی نے کہا کہ ہمارے کمرے کے دروازے پر کوئی ہے۔ ہم نے دروازہ کھول کر دیکھا تو وہ لڑکی جس کی لاش سیڑھیوں کے نیچے پڑی ملی ہے، ان کے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹا رہی تھی۔ پھر انہوں نے دروازہ کھولا اور وہ اندر چلی گئی۔ بس جی! یہ ہم نے دیکھا اور دروازہ رام رام کہہ کر بند کر لیا اور یہ فیصلہ کر لیا کہ آئندہ جب بھی کبھی بمبئی آئیں گے، ہوٹل میں نہیں نمبریں گے۔ اپنا ہی کوئی ٹھکانہ کرنا پڑے گا۔ ہم یہاں کاروبار کے سلسلے میں اکثر آتے رہتے ہیں۔ اس بار ہماری دھرم چنی اور بیٹی بھی ساتھ آگئی تھیں۔ اب بتائیے! وہ ہم سے بچنے لگیں کہ کون تھا؟ کیا جواب دیتے انہیں؟ رام، رام، رام.....“

”ہوں..... ٹھیک ہے۔ اب آپ اپنے ہوٹل واپس جاسکتے ہیں۔ لیکن انسپکٹر! ان کے بارے میں تمام تفصیل حاصل کر لیجئے تاکہ اگر ان کی ضرورت پیش آئے تو انہیں بلایا جاسکے۔“

”ارے بھائی! کیوں مصیبت میں پھانس رہے ہو ہمیں؟ ہم بھلا کہاں سے آتے ہیں؟ ہم کاروباری آدمی ہیں۔ ایک دن کام نہ کریں تو جانے کتنے کا نقصان ہو جاتا ہے۔“

”بہر طور! یہ آپ کو کرنا ہوگا۔ جائیے۔“ ڈی ایس پی نے کہا اور انسپکٹر اُسے ساتھ لے کر باہر نکل گیا۔ تب ڈی ایس پی میری طرف دیکھ کر بولا۔ ”ہاں جناب! کیا نام بتایا آپ نے منصور..... غالباً منصور صاحب! اب آپ یہ بتانا پسند کریں گے کہ آپ نے بملا کو کیوں قتل کیا؟“

صورت حال کا مجھے کافی حد تک اندازہ ہو گیا تھا۔ ویٹر نے بملا کو میرے دروازے پر دیکھا تھا۔ اس کے بعد اُس شخص نے جو غالباً میرے کمرے کے پڑوس ہی میں رہتا تھا۔ اب میں کیا بتاتا ان لوگوں کو کہ میرے ساتھ کیا بیتی ہے؟ میں نے مدھم لہجے میں ڈی ایس پی سے کہا۔ ”ڈی ایس پی صاحب! ظاہر ہے ان لوگوں نے جو گواہی دی ہے اس کی روشنی میں آپ مجھے ہی مجرم قرار دے سکتے ہیں۔ لیکن انسانی بنیادوں پر ایک درخواست کرنا چاہتا ہوں آپ سے۔“

”جی..... جی..... فرمائیے۔“

”آپ پوری طرح اس مسئلے کی تفتیش کیجئے۔ میں نے قتل نہیں کیا۔ بملا نامی وہ لڑکی دستک دے کر میرے کمرے میں داخل ہو گئی۔ اُس نے مجھ سے کہا کہ وہ میری تنہائی دور کرنا چاہتی ہے۔ میں نے اُس سے معذرت کرتے ہوئے کہا کہ میں اس قسم کا آدمی نہیں ہوں۔ تب اُس نے اپنی مجبوریاں بتائیں۔ کہنے لگی کہ میں پریشان حال ہوں۔ میری ماں بیمار ہے اور مجھے اُس کے لئے پیسوں کی ضرورت ہے۔ انسانی ہمدردی کی بنیاد پر ہی میں نے تھوڑی سی رقم اُسے دے دی اور اس کے بعد وہ چلی گئی۔ پھر مجھے نہیں معلوم کہ اُس نے ساتھ کیا بیتی؟ کیا ہوا؟ کیسے ہوا؟“

”بڑی ہلکی کہانی سنائی ہے منصور صاحب! ان دو آدمیوں کی گواہی کے بعد اتنی معمولی سی بات پر یقین نہیں کیا جاسکتا۔ یہ بات تو آپ تسلیم کر چکے ہیں کہ وہ آپ کے پاس آئی تھی۔“

”جس طرح آئی تھی، میں نے آپ کو بتا دیا ہے۔“

”اب اس سلسلے میں تو تحقیقات ہی ثابت کر سکتی ہیں کہ صورت حال کیا تھی؟ آپ اطمینان رکھئے۔ لاک آپ میں ضرور رہنا پڑے گا آپ کو۔ لیکن میں انسپکٹر کو ہدایت کر دوں گا کہ اُس وقت تک جب تک آپ کے خلاف کوئی جرم مکمل طور پر ثابت نہ ہو جائے، آپ

میں نے کوئی بدسلوکی یا گستاخی نہ کی جائے۔ براہ کرم! اس حد تک پولیس سے تعاون کیجئے۔ اگر آپ بے گناہ ہیں تو ہمیں آپ کو نقصان پہنچا کر کوئی خوشی نہیں ہوگی۔“ مجھے دوبارہ لاک آپ میں بند کر دیا گیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ میرے ساتھ پولیس والوں نے کوئی بدسلوکی نہیں کی تھی۔

تیسرے دن اُسی ڈی ایس پی نے مجھے اپنے آفس میں طلب کیا۔ میرا سامان اُس کے سامنے رکھا ہوا تھا۔ لیکن اس سامان کے ساتھ ایک اور شخصیت کو میں نے دیکھا اور میرے دل میں پریشانی پیدا ہو گئی۔ یہ وہی جوہری تھا، جسے میں نے سونے کے سکے فروخت کئے تھے اور ایک بالکل ہی جھوٹی کہانی سنا دی تھی۔ جوہری کو دیکھ کر میری پریشانی پر غور و فکر کی لکیریں پھیل گئیں۔ ڈی ایس پی غالباً میرے چہرے کا جائزہ لے رہا تھا اور یہ اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا تھا کہ جوہری کی یہاں موجودگی کا مجھ پر کیا اثر مرتب ہوا ہے؟ اُس نے اُسی شرافت سے مجھے بیٹھنے کی پیشکش کی اور پھر بولا۔

”منصور صاحب! یہ آپ کا سامان ہے؟“

”جی ہاں!“

”ہوٹل کے کمرے میں یہی تمام سامان موجود تھا یا اس کے علاوہ بھی اور کچھ تھا آپ کے پاس؟“

میں نے ایک نگاہ اپنے مختصر سے سامان پر ڈالی۔ ”نہیں۔ یہی سامان تھا میرا۔“ ”سوچ لیجئے۔ کچھ اور بیگ، پرس یا ایسی ہی کوئی چیز ہو جو اس وقت یہاں موجود نہ ہو؟“

”جی نہیں۔ یہی سب کچھ تھا۔“

”تو آپ کا پاسپورٹ اور دوسرے کاغذات کہاں ہیں؟ جیسا کہ آپ نے کہا کہ آپ مقامی نہیں ہیں اور لندن کے شہری ہیں، ہندوستان میں آپ بغرض سیاحت آئے ہیں۔ یقیناً آپ نے یہ سب کچھ سچ ہی کہا ہوگا۔“

میں ایک لمحے کے لئے دہشت زدہ سا ہو گیا۔ بڑی گہری گرفت تھی یہ۔ اپنے آپ کو سنبھالا اور آہستہ سے کہا۔ ”پاسپورٹ میرے اسی بیگ میں ہے۔ غالباً آپ نے اس کی تلاش نہیں کی۔“

میں پھر بھی کوئی جواب نہیں دے سکا۔

”آپ کو تھوڑی سی تکلیف دینی ہے منصور جی! آئیے، ہمارے ساتھ بینک چلیے۔ لاکرز کھولنے۔ ذرا دیکھیں بھی تو ہم، آپ نے اپنے کاغذات وغیرہ کہاں چھپا رکھے ہیں اور لاکرز میں کیوں رکھے ہیں؟“

میرے پاس اور کوئی چارہ کار نہیں تھا کہ ان کی ہدایت پر عمل کروں۔ اب تک میرے ساتھ پولیس کا رویہ برا نہیں تھا۔ لیکن اگر میں نے ان کی ہدایت پر عمل نہیں کیا تو پولیس میرے ساتھ کیا سلوک کرے گی؟ اس کا اندازہ مجھے بخوبی تھا۔ چارونا چار میں تیار ہو گیا۔ مجھے گاڑی میں بٹھا کر بینک لے جایا گیا جہاں میرے لاکرز تھے۔ اُن میں سے برآمد ہونے والا اتنا بڑا خزانہ دیکھ کر پولیس کی آنکھیں بھی حیرت سے پھیل گئیں۔

”اب یہ بھی بتا دو جان من! کہ اتنی قیمتی چیزیں تم نے کہاں سے حاصل کیں؟“ اُس نے مجھے گھورتے ہوئے کہا۔

”دوست! بتا دوں تو شاید تم یقین نہیں کرو گے۔“

”کوشش کروں گا کہ یقین کر لوں۔ تم بتانے کی کوشش تو کرو۔“ انسپکٹر نے پھر مذاق کیا۔

”لندن میں مجھے ایک ایسا نقشہ دستیاب ہو گیا تھا جو کسی سیاح ہی کا بنایا ہوا تھا۔ اور اُس نقشے میں اس خزانے کے بارے میں تفصیلات تھیں۔ میں اس کی تلاش میں چل پڑا اور یہ خزانہ مجھے فتح پور سیکری میں جو دھابائی کے محل کے ایک گوشے سے دستیاب ہو گیا۔“

”اچھا، اچھا..... گویا یہ خزانہ تم نے زمین کی گہرائیوں سے حاصل کیا ہے۔“

”ہاں!“

”بے وقوف بنانے کے لئے ہم ہی رہ گئے ہیں۔ وہ نقشہ کہاں ہے جس میں خزانہ پوشیدہ تھا؟“ انسپکٹر نے پوچھا۔

”وہ بھی پاسپورٹ کے ساتھ دوسرے کاغذات میں شامل تھا۔“

”بہت چالاک آدمی ہو۔ لیکن میں تمہاری اس بات پر یقین کرنے کے لئے تیار نہیں ہوں۔“

”تو پھر اس کے لئے مجھے کیا کرنا ہوگا؟“

”جی نہیں..... آپ کے تمام سامان کی تلاشی لی جا چکی ہے۔ پاسپورٹ یا آپ کی شہریت سے متعلق کوئی کاغذ آپ کے اس سامان میں موجود نہیں ہے۔“

”جب میں اپنے کمرے کے ہوٹل میں تھا تو یہ تمام اشیاء میرے سامان میں موجود تھیں۔ میں نے فوراً کہا۔“

”ہو سکتا ہے آپ نے سامان کسی بینک کے لاکر میں رکھ دیا ہو۔ چونکہ آپ کے اس سامان سے دو بینک کے لاکرز کی چابیاں ضرور ملی ہیں۔“

میرا رنگ فق ہو گیا..... اُن لاکرز میں کیا تھا، یہ بات میں اچھی طرح جانتا تھا۔

”یہ سب مجھے کوئی چال بازی معلوم ہوتی ہے۔ میرے سامان میں اور لاکرز کی چابیاں..... ناممکن..... ناممکن.....“

”یہ چابیاں ہیں اور آپ کی وہ تمام شناخت بھی ان بینکوں میں موجود ہے جس میں آپ نے اپنا نام منصور ہی لکھا ہے اور خود کو لندن کا باشندہ ہی ظاہر کیا ہے۔“

”میں چکرا کر رہ گیا تھا۔ بلاشبہ پولیس کی یہ گرفت مجھ پر بے حد سخت تھی۔ میری غیر موجودگی میں لاکرز تو نہیں کھولے گئے ہوں گے لیکن ان لوگوں نے بینک سے میرے بارے میں شناخت ضرور کی ہوگی۔“

”ان سے ملنے! یہ موہن لعل جی ہیں۔ جوہری ہیں اور سونے کا بیوپار کرتے ہیں۔ اور آپ کو بخوبی پہچانتے ہیں۔ آپ نے ان کے ہاتھ کچھ سونا فروخت کیا تھا۔ کیوں موہن جی؟“

”ہاں جی! یہی ہیں وہ صاحب۔ انہوں نے یہ بتایا تھا کہ یہ شاہی خاندان کے آدمی ہیں اور یہ سونے کے سکے ان کے ماتا پتانے ورثے میں ان کے لئے چھوڑے تھے۔ اب انہیں پیسے کی ضرورت ہے تو یہ سونا فروخت کر رہے ہیں۔“

میں خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر رہ گیا۔

”کیا خیال ہے منصور جی! ہمارے موہن جی جھوٹ بول رہے ہیں؟“

”نہیں..... میں نے آہستہ سے کہا۔“

”آپ چاہیں تو کہہ سکتے ہیں کہ آپ موہن جی کی صورت بھی نہیں پہچانتے۔ سبھی نہیں

دیکھا آپ نے انہیں۔“

”صحیح بات بتانی ہوگی۔“

”صحیح بات اس کے سوا کوئی نہیں ہے کہ یہ خزانہ میں نے زمین کی گہرائیوں سے حاصل کیا ہے۔“

”رہنے والے کہاں کے ہو؟“

”لندن کا۔“

”یہ تو تم پہلے بھی کہہ چکے ہو۔ اصل بات بتاؤ۔“

”اصل بات تم خود معلوم کر لو انسپکٹر! میں اس کے علاوہ اور کچھ نہیں کہنا چاہتا۔“ لیکن مجھے نہیں معلوم تھا کہ میرے ان الفاظ کا نتیجہ کیا ہوگا۔

انسپکٹر نے سامنے بیٹھے ہوئے دونوں آدمیوں سے کہا۔ ”چلو اوئے! اصل بات معلوم کرو۔۔۔۔۔“ اور اصل بات معلوم کرنے والے، اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ میں بوکھا کر دو قدم پیچھے ہٹا لیکن انہوں نے آگے بڑھ کر میرے بازو پکڑ لئے۔ پھر اُن میں سے ایک نے مجھے دیوار کے پاس لگے کندھے میں پڑی ہوئی رستی سے کس دیا اور اس کے بعد کم بختوں نے مار لگانے کے ایسے طریقے آزمائے کہ میں اُن کی اس فنکاری پر حیران رہ گیا۔

وہ میری ہڈیوں کے جوڑوں پر ضربیں لگا رہے تھے اور میرے حلق سے دلخراش چیخیں نکل رہی تھیں۔ شدت تکلیف سے دیوانہ ہو کر میں نے اُن میں سے ایک کو کسی نہ کسی طرح اپنی گرفت میں لے لیا اور پھر میرے دانت اُس کے شانوں میں گڑ گئے۔ بلاشبہ میں نے اُس کے شانے سے گوشت کا ایک ٹکڑا اُکھاڑ لیا تھا۔ وہ بری طرح بلبلانے لگا۔ لیکن دوسرے آدمی نے پوری قوت سے اپنے ہاتھ میں پکڑا ہوا ڈنڈا میرے بازو، گردن اور پھر سر پر مارا اور میرے سر سے خون بہنے لگا۔ میری آنکھوں میں ستارے ناچ گئے تھے اور چند ہی لمحوں بعد میرے ہوش و حواس جواب دے گئے۔۔۔۔۔

جانے کتنی دیر کے بعد ہوش آیا۔ حواس واپس نہیں آئے تھے۔ غالباً میں اُسی کندھے سے بندھا ہوا تھا۔ میرا پورا بدن پھوڑے کی طرح دکھ رہا تھا۔ ایک کراہ کے ساتھ میں نے اپنے آپ کو جنبش دینے کی کوشش کی۔ لیکن فوراً ہی کسی کا ہاتھ میرے سینے پر آ گیا۔

”لیٹے رہو۔۔۔۔۔ لیٹے رہو۔۔۔۔۔ ہلنے جلنے کی کوشش مت کرو۔“ میں نے چونک کر آنکھیں

کھول دیں۔ وہ نرم و لطیف ہاتھ مجھے بے حد عجیب محسوس ہوا اور آواز بھی نسوانی تھی۔ میں ہر ت سے آنکھیں پھاڑ کر دیکھنے لگا۔ مدھم سی روشنی تھی۔ اتنی مدھم کہ احساس بھی نہ ہو سکے۔ اس مدھم روشنی میں ایک ہیولا میرے نزدیک موجود تھا۔

”کیا بہت تکلیف ہو رہی ہے؟“ اُس نے سوال کیا۔ لیکن میں جواب دینے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔

”ایک منٹ۔۔۔۔۔“ وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور ایک سمت بڑھ گئی۔ کھڑکھڑاہٹوں کی آواز میں روشنی، آہستہ آہستہ تیز ہوتی گئی۔ غالباً یہ میری آنکھوں کا قصور تھا کہ میں روشنی کو پوری طرح محسوس نہیں کر پایا۔ لیکن رفتہ رفتہ میرے سامنے ماحول اُجاگر ہوتا جا رہا تھا۔ وہ تھوڑی دیر بعد واپس آئی تو اُس کے ہاتھوں میں ایک سرنج دبی ہوئی تھی جس میں ہلکے نیلے رنگ کا سیال تھا جو اُس نے میرے بازو میں انجیکٹ کر دیا۔ ناقابل یقین بات تھی۔ میں تو اُن کے اذیت خانے میں تھا جہاں وہ مجھ سے خزانے کے بارے میں معلومات حاصل کر رہے تھے۔ لیکن یہ بدلا ہوا ماحول۔۔۔۔۔ اب تو سب کچھ ہی تبدیل ہو گیا تھا۔

دو دن گزرنے کے بعد ایک دوپہر مجھے بہت عمدہ کھانا دیا گیا۔ روزانہ جو کھانا ملتا تھا وہ بس زہر مار ہی کیا جاسکتا تھا۔ لیکن آج کچھ اہتمام تھا۔ میں نے اس اہتمام کی وجہ تو کسی سے نہیں پوچھی، لیکن اُسے محسوس ضرور کیا تھا۔ یہ نہیں معلوم تھا کہ کبخت کھلا پلا کر مارنا چاہتے ہیں۔

کھانے کے تقریباً آدھے گھنٹے بعد مجھے لاک اپ سے نکال کر ایک بالکل ہی مختلف کمرے میں پہنچا دیا گیا اور اس کمرے میں، میں نے قدم رکھتے ہی محسوس کر لیا کہ اب آغاز ہو رہا ہے۔ ایک میز پر اذیت رسانی کے آلات سجے ہوئے تھے اور اندر دو خاص قسم کے پولیس والے بیٹھے ہوئے تھے جو آدمی کم اور جانور زیادہ لگ رہے تھے۔ ڈی ایس پی موجود نہیں تھا۔ بلکہ اس وقت وہ چھپھورا پولیس انسپکٹر سامنے بیٹھا ہوا تھا جو ڈی ایس پی کی غیر موجودگی میں شاید خود کو آئی جی سمجھنے لگا تھا۔

اُس نے مجھے دیکھ کر طنزیہ انداز میں مسکراتے ہوئے کہا۔ ”آئیے آئیے۔ تشریف لے آئے آپ۔۔۔۔۔؟ آج ڈی ایس پی صاحب چھٹی پر ہیں اور مجھے ہدایت کر گئے ہیں کہ میں آپ سے سوالات کروں۔“

میں نے ادھر ادھر دیکھا۔ بیٹھنے کے لئے کوئی جگہ نہیں تھی۔ گویا مجھے کمرے رہنا تھا۔ انسپکٹر کی طنزیہ آنکھیں مجھے دیکھ رہی تھیں۔ پھر اُس نے اپنے سامنے رکھا ہوا فائل کھول کر کہا۔ ”جو سوالات میں نے آپ کے لئے ترتیب دیئے ہیں اُسی ترتیب سے جواب دینے چلے جائیے۔ ورنہ یہ دونوں جو آپ کے سامنے بیٹھے ہیں، یہ انسان کی سر سے پاؤں تک ترتیب بگاڑ دیتے ہیں۔ آپ یقیناً اپنے ٹخنے، کندھوں اور اپنا سر کمر کے قریب نہیں چاہتے ہوں گے۔ کیا خیال ہے؟“

انسپکٹر اپنی دانست میں مذاق کر رہا تھا اور میرا خون کھول رہا تھا۔ لیکن دہشت کا ایک احساس بھی رگ و پے میں جاگزیں تھا۔ میں خاموشی سے انسپکٹر کی صورت دیکھتا رہا اور اُس نے مجھ سے سوال نمبر ایک کیا۔

”کہیں سے بھی یہ ثابت نہیں ہو سکا کہ آپ لندن کے باشندے ہیں اور وہاں کی شہریت رکھتے ہیں۔ پولیس نے لندن کے سفارت خانے سے بھی رابطہ قائم کیا ہے اور آپ کے بارے میں معلومات حاصل کی ہیں۔ لیکن سفارت خانے والوں کے ذریعے پتہ چلا کہ آپ کا لندن سے کوئی تعلق نہیں۔ ہمیں آپ کے بارے میں کوئی معلومات حاصل نہیں ہو سکیں۔ کیا آپ لندن میں موجود کچھ ایسے لوگوں کا پتا دینے کے لئے تیار ہیں جن کی مدد سے آپ کے بارے میں تصدیق کی جاسکے؟“

”کیا میرا یہ کہہ دینا کافی نہیں ہے کہ میں لندن کا شہری ہوں اور یہاں بغرض سیاحت آیا ہوں.....“

”میرے بھیا! یہ لندن نہیں ہے جہاں انسانوں کی باتوں پر اعتبار کر لیا جاتا ہے۔ یہ ہندوستان ہے۔ ہم اپنا اعتماد خود کرتے ہیں۔ کسی کے کہے سنے پر اعتبار نہیں کرتے۔“

”میرے ذہن میں کوئی ایسا نام نہیں ہے، جس کا میں تمہیں حوالہ دے سکوں۔“

انسپکٹر نے اس بات پر قبضہ لگایا تھا۔ پھر وہ بولا۔ ”صرف اس لئے کہ شاید تم نے اپنی زندگی میں لندن دیکھا بھی نہ ہو۔“

”کیا کہوں انسپکٹر تم سے..... تمہارے بدن پر بھی ہوئی یہ وروی مجھے خاموش رہنے؟“

مجبور کر رہی ہے۔ ورنہ میں تمہیں بتاتا کہ میں کیا کیا دیکھ چکا ہوں۔“

”دھمکی دے رہے ہو؟“ انسپکٹر نے میز پر رکھا ہوا رول اٹھا لیا اور میری روح فٹا

گئی۔ ”نہیں..... دھمکی نہیں دے رہا۔ بلکہ بتا رہا ہوں.....“ میں نے فوراً ہی لہجہ تبدیل کر لیا۔

”پاسپورٹ کہاں ہے؟“

”پولیس نے جو سامان میرے ہوٹل کے کمرے سے حاصل کیا تھا، اُس میں تمام چیزیں موجود تھیں۔ تم نے دیکھا کہ لا کر زکی وہ چابیاں بھی میرے سامان سے ہی برآمد ہوئیں جن میں وہ خزانہ رکھا ہوا تھا۔“

”ہوں، ہوں..... سمجھ رہا ہوں۔ مجھے خزانے کی طرف متوجہ کر کے کچھ لالچ دینا چاہتے ہو۔ مگر میں لالچی آدمی نہیں ہوں۔“

میرے ہونٹوں پر پھر ایک تلخ مسکراہٹ پھیل گئی۔ ”اگر یہ خزانہ ڈی ایس پی کی موجودگی میں برآمد نہ ہوتا تو پھر میں دیکھتا کہ تم لالچی آدمی ہو یا نہیں۔“

انسپکٹر اس بار رول لے کر کھڑا ہو گیا تھا۔ میں نے دل ہی دل میں اپنے آپ کو کوسا کہ یہ زبان کم بخت کیوں چل رہی ہے؟ کہیں یہ اچھی طرح مرمت نہ کرادے۔ بہر طور! جو غلطی ہو گئی تھی، اُسے نبھانا ہی تھا۔ سو میں خاموشی سے انسپکٹر کی صورت دیکھتا رہا۔ اچانک انسپکٹر نے اپنے اُنہی دو ملازموں کو اشارہ کیا، جو میری مرمت کے لئے موجود تھے۔

اشارہ ملتے ہی اُن دونوں نے مجھ پر تشدد شروع کر دیا اور میں پھر ہوش و حواس سے بیگانہ ہو گیا.....

☆.....☆.....☆

دوبارہ جب ہوش آیا تو میں نے اپنے آپ کو میں نے ایک بستر پر پایا۔ کشادہ کمرہ، جس میں آرائشی چیزیں سجی ہوئی تھیں۔ ماحول بے حد پرسکون تھا۔ جس لڑکی نے میرے بازو میں انجکشن لگایا تھا وہ صاف ستھرا مقامی لباس پہنے ہوئے تھی۔ کسی قدر خاموش طبع اور چہرے سے سنجیدہ نظر آتی تھی۔ میں حیرت سے اُسے دیکھتا رہ گیا۔ کیا یہ بھی پولیس کا کوئی ایپارٹمنٹ ہے؟ میں نے دل ہی دل میں سوچا۔ لیکن پھر اپنی زبان بند نہ رکھ۔ کا اور اس بارے میں سوال کر ڈالا۔

”کیا یہ پولیس ہیڈ کوارٹر ہے؟“

”نہیں.....“ اُس نے متحیرانہ انداز میں کہا۔

پھر اس کے لباس کو پکڑ لیا۔

”پلیز..... بیٹھ جاؤ! مجھے کسی انجکشن کی ضرورت نہیں۔ اگر تم مجھے پولیس سٹیشن سے نہیں لے کر کوئی بھی جو اس گھر کا مکین ہے، مجھے پولیس سٹیشن سے نہیں لایا تو کم از کم اتنا تو پتی ہوگی تم کہ مجھے یہاں، کہاں سے لایا گیا ہے؟“

”معاف کرنا! مجھے اس کی اجازت نہیں ہے۔ اب میں چلتی ہوں۔ تمہاری حالت کافی بہتر معلوم ہوتی ہے۔ البتہ ایک ہدایت تمہیں کئے جاتی ہوں۔ یہاں تم بے حد سکون کے دل میں ہو۔ باہر نکلنے یا بھاگنے کی کوشش کی تو بلاوجہ اُلجھنوں میں پھنس جاؤ گے۔“ وہ چلی گئی اور پھر لوٹ کر نہ آئی۔

رات کا کھانا بڑا پر تکلف تھا جو مجھے اسی کمرے میں پیش کیا گیا۔ وہی لڑکی میرے لئے کھانا لے کر آئی تھی۔ میں نے مسکراتے ہوئے اُس سے پوچھا۔

”کیا اس مکان میں تمہارے علاوہ اور کوئی موجود نہیں ہے؟“

”بہت سے لوگ ہیں۔ کیوں؟“

”میرا مطلب ہے تم ہی میری تیمارداری کر رہی ہو۔“

”یہ ڈیوٹی میرے سپرد کی گئی ہے۔“

”اس زندگی میں مجھے ایک انتہائی دلچسپ تجربہ ہوا ہے۔ مجرم ہوں یا دوسرے لوگ۔ کسی مجھ جیسے شخص کی تیمارداری کے لئے خاص طور سے لڑکیاں ہی مقرر کی جاتی ہیں۔ اس کی وجہ بتا سکتی ہو؟“

”اگر وجہ بتاؤں گی تو کھانا ٹھنڈا ہو جائے گا۔ چنانچہ بہتر ہے کہ وجہ پوچھنے کی بجائے کھانا کھاؤ۔“ لڑکی نے جواب دیا اور میں نے گردن ہلا دی۔ پھر میں کھانے میں مصروف ہو گیا..... ابھی تک بدن کی چوٹیں تازہ ہیں۔ کسی قسم کی جدوجہد بے مقصد ہوگی۔ ہر چند کہ یہ جگہ ہسپتال نہیں تھی۔ لیکن یہاں جو کچھ ہو رہا تھا وہ بے حد غنیمت تھا۔ چنانچہ میں نے بھی غصہ کر لیا کہ کتنے ہی دن گزر جائیں، میں بھی آرام ہی سے پڑا رہوں گا۔ اور میں نے اپنے اس فیصلے پر عمل درآمد کیا۔

”دوسرا دن، تیسرا دن اور چوتھا دن گزر گیا۔ ان لوگوں کی کوشش سے میری چوٹیں بھی درست ہوتی جا رہی تھیں۔ اب میں اپنے آپ کو کافی بہتر حالت میں پا رہا تھا۔ اس کی وجہ

”میرا مطلب ہے کیا پولیس نے مجھے ہسپتال بھجوا دیا ہے؟“

”نہیں..... بالکل نہیں۔“ وہ پھر اسی انداز میں بولی۔

”تو پھر یہ کون سی جگہ ہے؟“

”یہ ہمارا گھر ہے۔“

”اور آپ کون ہیں؟“

”میرا نام نینی ہے۔“ لڑکی نے جواب دیا۔

”مس نینی! نہ تو میں آپ کو جانتا ہوں اور نہ ہی آپ کے گھر والوں کے بارے میں مجھے کچھ تفصیل معلوم ہے۔ میں تو یہ جاننا چاہتا ہوں کہ پولیس سٹیشن سے مجھے کون یہاں لایا؟“

”اوہ..... آپ کے سر میں چوٹ لگی ہے۔ غالباً آپ ذہنی طور پر بھٹک گئے ہیں۔ پولیس سٹیشن کا نام بار بار لے رہے ہیں۔ کیا قصہ ہے یہ؟“

”اگر اداکاری کرنے کی کوشش کر رہی ہو تو ایک بات سن لو! میری زندگی ایسے اداکاروں کے درمیان ہی گزری ہے۔ میں تمہاری بات سے متاثر نہیں ہو سکتا۔ دوسری صورت یہ ہو سکتی ہے کہ تم مجھے یہاں کے بارے میں بتانا نہیں چاہتیں۔“

”میرا خیال ہے تمہیں ایک اور انجکشن لینا پڑے گا تاکہ تمہاری ذہنی کیفیت بھی درست ہو جائے۔“

”مطلب یہ کہ بے ہوشی کا انجکشن؟“ میں نے سوال کیا۔

”ہاں..... یقیناً! ابھی کچھ دیر اور پرسکون رہو۔“

”نہیں..... پلیز نہیں۔ سنو! میں بالکل پرسکون ہوں۔ بلاشبہ میرے بدن میں جگہ جگہ آگہائیاں ہیں۔ لیکن اس کی وجہ تم جانتی ہو۔ اچھی طرح جانتی ہو۔“

”میں کچھ نہیں جانتی۔ مجھے تو تمہاری تیمارداری کے لئے مخصوص کیا گیا ہے۔“

”کس نے کیا ہے، پولیس نے؟“

”نہیں..... پولیس کا ہم لوگوں سے کوئی تعلق نہیں ہے۔“

”تو پھر مجھے پولیس سٹیشن سے کون یہاں لایا ہے؟“

”انجکشن دیتی ہوں۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھی۔ لیکن میں نے ہاتھ

وہ غذائیں اور وہ دوائیں تھیں جو مسلسل مجھے دی جا رہی تھیں۔ میرے لئے نئے لباس لائے گئے تھے۔ پتہ نہیں یہ اہتمام کیوں ہو رہا تھا؟ بہر طور! اب اس زندگی سے اتنا واقف بھی نہیں تھا کہ لوگوں کی ان حرکتوں پر حیرت ہوتی۔ چوتھا دن گزرنے کے بعد جب پانچویں دن کی صبح کا آغاز ہوا تو کچھ نئی شکلیں میرے سامنے پہنچ گئیں.....

دو مقامی آدمی تھے جنہیں شکل و صورت سے شریف نہیں کہا جاسکتا تھا۔ البتہ اُن کے انداز میں شرافت کی جھلکیاں تھیں۔

”پرنسز آپ کو طلب کرتی ہیں۔“

”گویا میں کسی شہزادی کا مہمان ہوں۔“ میں نے کہا اور وہ دونوں مجھے دیکھنے لگے۔

بولے۔

”کچھ ہدایتیں دی جاتی ہیں آپ کو۔ ان پر عمل کرنے سے آپ کا فائدہ ہے۔“

”ارشاد..... ارشاد.....“ میں نے کہا۔

”پرنسز کا احترام کیجئے گا۔ ان کی کسی بات سے انحراف نہ کریں۔ اسی میں آپ کی بہتر

زندگی کا راز پوشیدہ ہے۔“

”کوشش کروں گا۔“

”تو پھر آئیے!“ اُن میں سے ایک نے کہا اور میں ہوش میں آنے کے بعد پہلی بار اُن کمرے سے باہر نکلا۔ مکان تھا کہ محل..... بڑا خوبصورت گھر تھا اور بڑے وسیع و عریض علاقے میں پھیلا ہوا تھا۔ پتہ نہیں بمبئی ہے یا کوئی اور جگہ..... ان چیزوں میں دماغ کھپا بے کار تھا۔ ایک طویل راہ داری سے گزرنے کے بعد بڑے ہال کے چوٹی دروازے پر لوگ رُکے اور دروازہ کھول دیا.....

اندر کی سبج دھج قابل دید تھی۔ دیواروں پر بہت ہی اعلیٰ پائے کے شیڈز لگے ہوئے تھے۔ چھت میں تقریباً چھ فٹ کے دائرے میں فانوس لٹکا ہوا تھا۔ زمین پر سرخ رنگ کا لین بچھا ہوا تھا۔ بہت ہی پراسراری خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ میں نے ہال کا جائزہ لینے کے بعد جب اُس کے اختتامی سرے کو دیکھا تو میری آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں..... ہال کی رنگ کی وسیع و عریض میز کے پیچھے ایک خوبصورت عورت بیٹھی تھی۔ اُس کے قدموں کے پاس ایک خونخوار چیتا زبان نکالے ہانپ رہا تھا..... لیکن یہ عورت..... میری آنکھیں کسی

بار دیکھنے کے بعد دھوکہ نہیں کھاتیں۔ یہ وہی عورت تھی جس نے میری تصویر بنائی تھی باطل پر مجھے ملی تھی۔ میں نے اُس سے گفتگو بھی کی تھی۔ ایک لمحے میں سینکڑوں خیالات ذہن میں آکر گزر گئے۔ عورت کا وہ عہد، مجھے یاد آیا جو اُس نے میرے سامنے کیا۔ میرا اُس سے انحراف اور اس کے بعد کے حالات بھی روشن تھے۔ بملا کا قتل بھی اب ذہن میں آ گیا تھا۔ یہ سب مجھے ہراساں کرنے کی سازش تھی۔ ایک لمحے کے لئے ذہن میں چنگاریاں سی بھر گئیں۔ ہر شخص مجھ پر تسلط قائم کرنے کے لئے، مجھے بلیک مار کرنے کی کوشش کیوں کرتا ہے.....؟

میں اپنی جگہ کھڑا اُسے دیکھتا رہا اور اُس نے اُننگی کے اشارے سے مجھے قریب آنے کے لئے کہا۔ دروازے پر وہی دونوں آدمی جم گئے تھے اور بالکل ساکت و جامد مجسمے کی شکل میں کھڑے ہوئے تھے۔ میں آگے بڑھ کر اُس کے سامنے پہنچ گیا اور پھر میں نے بڑی سادہ سادگی کے ساتھ کہا۔ ”ہیلو!“

”ہیلو..... بیٹھ جاؤ۔ وہ کرسی تمہارے ہی لئے ہے۔“ اُس نے ایک کرسی کی جانب اشارہ کر کے کہا۔

میں اطمینان سے کرسی پر جا بیٹھا۔ ایک دو بار میں نے اُس چیتے کو دیکھا تھا جو مجھے عجیب سا لگ رہا تھا۔ اُس کی گردن میں کوئی پٹا وغیرہ نہیں تھا لیکن وہ بالکل پرسکون بیٹھا ہوا عورت بھی اُس وقت خاص قسم کے لباس میں ملبوس تھی اور اُس کے بال ایک مخصوص رنگ پر بنے ہوئے تھے۔ بلاشبہ ایک نگاہ میں وہ کوئی شہزادی ہی نظر آ رہی تھی۔

”افسوس! آپ نے مجھے اپنا نام بتانے کی زحمت ہی گوارہ نہیں کی۔“ میں نے اُس سے کہا۔

”وہ ایک مخصوص وقت کے لئے تھا۔ اور شاید ابھی وہ وقت نہیں آیا ہے کہ میں تمہیں اپنا نام بتاؤں۔“

”ٹھیک ہے۔ مجھے بھی جلدی نہیں ہے۔“ میں نے جواب دیا۔

”تم بالآخر میرے پاس آ گئے منصور!“

”آیا نہیں، لایا گیا ہوں۔“

”مطلب؟“

”اگر آپ کو تفصیلات معلوم ہیں تو میرا خیال ہے یہ سوال نہیں کرنا چاہئے آپ کو۔“

”اوہ..... تمہاری مراد ہے کہ تمہیں ہوش کے عالم میں یہاں نہیں لایا گیا؟“

”آپ یہ بات اچھی طرح جانتی ہیں۔“

”لیکن کیا تمہارا یہاں آنا تمہارے حق میں بہتر ثابت نہیں ہوا؟“

”اس سے مجھے کب انکار ہے؟ ظاہر ہے جس عذاب میں مجھے گرفتار کرایا گیا ہے میرے لئے زیادہ تکلیف دہ تھا۔ یہاں آپ نے عارضی طور پر ہی سہی! لیکن مجھے پرسکون ماحول دیا ہے۔“

”تم چاہو تو یہ پرسکون ماحول دائمی بھی ہو سکتا ہے۔“

”کیوں کیا آپ مجھے قتل کر کے یہاں میری قبر بنا دیں گی؟“

”نہیں.... یہاں سے تمہیں ایک نئی زندگی مل سکتی ہے۔“

”کیا حساب کتاب ہوگا اُس نئی زندگی کا؟“

”بہت جلد کر ڈالا یہ سوال تم نے۔ پہلے مجھے کچھ سوال کرنے کی اجازت دو۔“

”اجازت کی کیا ضرورت ہے؟ ظاہر ہے آپ کا نمک خوار ہوں۔ چار دن سے آپ کے مہمان کی حیثیت سے رہ رہا ہوں۔ آپ میزبان کی حیثیت سے جو سوال چاہیں کر سکتے ہیں۔“

”تمہاری شخصیت کیا ہے؟ میں نہیں جانتی تھی کہ تمہاری شخصیت میں کچھ پراسرار پہلو بھی ہیں۔ لیکن اب حالات مجھے معلوم ہو چکے ہیں۔ یعنی تمہارے پاس سے ایک اچھا خاصا قیمتی خزانہ دستیاب ہوا ہے جس کے بارے میں تم نے بیان دیا ہے کہ وہ تمہیں فتح پور سیکریٹ میں ملا تھا۔ میں اس بیان پر یقین نہیں کرتی۔ حالانکہ یہ حقیقت ہے کہ تم فتح پور سیکریٹ گئے تھے۔ اس کے علاوہ تمہارے پاس پاسپورٹ بھی نہیں ہے۔ تم نے اپنے آپ کو لندن کا باشندہ ظاہر کیا ہے۔ لیکن اس کا کوئی ثبوت نہیں مل سکا۔ پولیس تم سے یہی سوال کر رہی تھی۔ لیکن اس کے یہ سوالات قانون کے لئے تھے۔ میں قانون کے لئے نہیں بلکہ اپنے لئے؟ سوالات کرنا چاہتی ہوں کہ تمہاری اصل شخصیت کیا ہے؟“

”بتاؤں گا تو کبھی یقین نہیں کرو گی۔ اس لئے جانے دو۔“

”نہیں، نہیں..... ہو سکتا ہے ایسا ہو۔ لیکن میں حالات کا تجزیہ تو کر سکتی ہوں؟“

”میں اپنے آپ کو کسی تجزیے کے لئے پیش نہیں کر سکتا۔“ میں نے جواب دیا۔

”ایک بات خاص طور سے محسوس کر رہی ہوں منصور! کہ تم بہت ضدی ہو۔ اور ضد میں تصانیات بھی اٹھاتے رہتے ہو۔ میں نے تمہیں پیش کش تھی کہ میرے دائرہ اختیار میں آ جاؤ اور تم نے اس سے انحراف کر ڈالا تھا جس کے نتیجے میں آج تم ایک مصیبت میں گرفتار ہو۔ لیکن ایک بات ذہن نشین کر لو! مصیبت بھی میری بھیجی ہوئی تھی اور اس کے بعد تمہیں مصیبت سے نکالنا بھی میرا ہی کام ہے۔“

”کیا تم اس بات کا اعتراف کرتی ہو کہ بملا کو تم نے یا تمہارے آدمیوں نے قتل کیا تھا؟“

”آپ سے تم پر آگئے۔ اس کی وجہ؟“

”نہیں، نہیں..... کوئی وجہ نہیں۔ بس! ایسے ہی بے اختیارانہ انداز میں یہ الفاظ منہ سے نکل گئے ہیں۔“

”ٹھیک ہے۔ مجھے آپ کہہ کر مخاطب کرو۔ میں بہت زیادہ بے تکلفی پسند نہیں کرتی۔“

”جی..... میرا سوال برقرار ہے۔“ میں نے خشک لہجے میں کہا۔ وہ میری اس حالت سے فائدہ اٹھا رہی تھی اور اپنے آپ کو برتر سمجھ رہی تھی۔

”تمہارا خیال غلط نہیں ہے۔“ اُس نے کہا۔

”خوب..... گویا آپ مجرمانہ ذہنیت رکھتی ہیں۔ خاص مجرمانہ ذہنیت..... اور آپ کے پاس ایسے لوگ موجود ہیں جو کسی کو ہلاک بھی کر سکتے ہیں۔“ میں نے اُسے گھورتے ہوئے کہا۔ جواب میں اُس نے ایک ہلکا سا قہقہہ لگایا تھا۔

”مائی ڈیئر مسٹر منصور! میں کیا کیا کر سکتی ہوں؟ اس کا اندازہ تو تمہیں آہستہ آہستہ ہوتا ہے گا۔ مجھے اب اس سوال کا جواب دو کہ خزانہ تم نے کہاں سے حاصل کیا تھا؟“

”اور اگر جواب نہ دوں تو؟“

”تو کوئی بات نہیں۔ ظاہر ہے وہ خزانہ اب میں اپنی تحویل میں تو نہیں لے سکتی۔ نہ ہی اسے ایسے خزانوں سے کوئی دلچسپی ہے۔ تمہاری اصل شخصیت جاننا چاہتی ہوں۔“

”میری اصل شخصیت جو بھی ہے آپ کے سامنے ہے۔ آپ یہ بتائیں کہ آپ کا مقصد کیا ہے؟“

رات کو مجھے اسی طرح کھانا پیش کیا گیا جس طرح روزانہ دیا جاتا تھا۔ انسان خواہ کسی بھی حالت میں ہو، پیٹ کو تکلیف دینا پسند نہیں کرتا۔ میں بھی بہر طور! کسی حد تک انسانوں ہی میں شمار ہوتا ہوں۔ چنانچہ کھانا وغیرہ کھایا اور آرام کرنے کے لئے لیٹ گیا۔ جانے کتنی دیر تک میں خیالات میں کھویا رہا۔ اور پھر اچانک ہی نیند آ گئی۔ میں اسے اچانک ہی کہوں گا۔ اس لئے کہ سونے سے پہلے یہ احساس ہوتا ہے کہ نیند آرہی ہے۔ بہر طور! سوتا رہا اور صبح اُس وقت آنکھ کھلی جب کسی نے میری پسلیوں میں ٹھوکر مار دی تھی۔ میں نے چونک کر ٹھوکر مارنے والے شخص کو دیکھا۔ وہ کوئی جمعدار تھا جو صفائی کرنے میں مصروف تھا۔ میں نے حیرت سے پلکیں جھپکائیں۔

جمعدار کی آواز اُبھری۔ ”اُٹھ جاوے..... صبح ہوئے دیر ہو چکی ہے۔ کب تک سوتا رہے گا لاٹ صاحب! صفائی کرنے دے۔“

میں نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے اپنے ارد گرد کا ماحول دیکھا..... وہی لاک آپ تھا جہاں میں قید ہوا تھا۔ میں زمین پر پڑا تھا۔ سامنے سنتری دروازہ کھولے مستعد کھڑا ہوا تھا کہ اگر میری طرف سے کوئی حرکت ہو تو جوابی کارروائی کرے۔ لاک آپ میں جمعدار صفائی کر رہا تھا۔ میں پاگلوں کی طرح اُٹھ کر بیٹھ گیا تو جمعدار پھر بولا۔

”اوئے..... اُدھر سرک جا! اُدھر.....“

میں نے اُس کی ہدایت پر عمل کیا۔ لیکن یہ سب کچھ..... یہ سب کچھ میرے لئے ناقابلِ فہم تھا۔ جو واقعات اس دوران پیش آئے تھے، وہ کیا حیثیت رکھتے تھے؟ کیا وہ صرف ایک خواب تھا؟ کیا..... کیا..... میں نے زور سے اپنے بدن میں کئی جگہ چٹکیاں کاٹیں اور تسکین تکلیف ہونے لگی۔ ایک ہی بات سوچی جا سکتی تھی۔ صرف ایک بات..... کسی طرح پلٹنے والوں کا اُس پر اسرار عورت سے کوئی گٹھ جوڑ ہے۔ مجھے یہاں سے نکالنے میں بھی

”نہیں..... میں کبھی کسی ایسے شخص پر اعتماد نہیں کرتی جو مجھ سے منحرف ہو۔“

”آپ کا ساتھی ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ میں تو آپ کو اپنے دشمنوں میں تصور کرتا ہوں۔ آپ نے مجھ پر تسلط جمانے کے لئے مجھے قاتل بنا دیا ہے اور اب چاہتی ہیں کہ میں تعاون کروں۔“

”اوہ..... اس کا مطلب ہے کہ جہاں سے چلے تھے، وہیں ہو۔ یہ تعاون تو تمہیں کرنا پڑے گا مائی ڈیئر! اور اگر تعاون نہیں کرو گے تو ابھی ایسے بہت سے حالات تمہارے سامنے آئیں گے جو تمہاری زندگی کو جہنم بنا دیں گے۔“

”ہو سکتا ہے ایسا ہو۔ میں اپنے آپ کو آزمانے کی کوشش بھی کرنا چاہتا ہوں۔“

اُس کے ہونٹوں پر ایک تلخ سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ پھر اُس نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ”ٹھیک ہے۔ میں جو چاہتی ہوں وہ تمہیں بتائے دیتی ہوں۔ کچھ وقت تمہیں فیصلہ کرنے کے لئے دیا جائے گا۔ میں چاہتی ہوں کہ تم بھی دوسرے لوگوں کی طرح میرے غلاموں میں شامل ہو جاؤ۔ میرے غلام کیا حیثیت رکھتے ہیں؟ اندازہ تمہیں بعد میں ہی ہو گا۔ اتنا کہہ سکتی ہوں تم سے کہ بڑے بڑے لوگ میری غلامی کے خواہاں ہوتے ہیں، لیکن ایسے بہت کم ہوتے ہیں جن پر میری نگاہ التفات ہو اور جو میرے غلاموں میں شامل ہو جاتا ہے پھر وہ بہت کچھ ہوتا ہے۔ جاؤ! غور کرنا۔ اگر میرے تلوے چاٹنے پر آمادہ ہو تو میرے پاس واپس آ جانا۔ میں تمہاری پذیرائی کروں گی۔“

میرے ہونٹوں پر ایک نفرت بھری مسکراہٹ پھیل گئی۔ لیکن میں نے خاموش رہنا ہی مناسب سمجھا تھا۔ اُس نے اشارہ کیا اور مجھے واپس اسی جگہ لے آیا گیا جہاں میں تھوڑی دیر پہلے موجود تھا۔ وہ لوگ مجھے بند کر کے چلے گئے۔ میں خاموشی سے اپنے قید خانے میں وقت گزارتا رہا۔ معمولات زندگی ہمیشہ کے مطابق تھے۔

☆.....☆.....☆

”یہ کام قانون کے رکھوالے زیادہ بہتر طور پر کر سکتے ہیں۔ تمہیں ہدایت دینے کی ضرورت نہیں ہے۔“

”انسپکٹر! پرنس کون ہے؟ مجھے بتاؤ!“ میں نے کہا اور انسپکٹر تعجب سے مجھے دیکھنے لگا۔

پھر بولا۔

”کون پرنس؟“

”تمہارا کیا خیال ہے کیا عدالت اس بات کو دلچسپی سے نہیں سنے گی کہ مجھے کئی دن تک لاک آپ سے باہر ایک پرنس کی قید میں رکھا گیا ہے۔ وہ مجھ سے کچھ معلومات حاصل کرنا چاہتی تھی۔“

”اب پاگل پن کی اداکاری کرو گے..... کیوں؟“

”نہیں انسپکٹر! سوچا تھا میں نے اس بارے میں بھی کہ کہیں واقعی میرا دماغ تو نہیں چل گیا ہے۔ لیکن یہ پتہ چلا کہ تمہارے اور پرنس کے گٹھ جوڑ سے یہ سارا کھیل عمل میں آیا ہے۔ ظاہر ہے اس کے بعد بملا کا قاتل میں ہی ہو سکتا ہوں۔ اور کون ہو سکتا ہے؟“

”تمہاری اُلٹی سیدھی باتیں میری سمجھ میں بالکل نہیں آرہیں۔ میں تو تم سے صرف یہی معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ تمہارا پاسپورٹ اور دوسرے کاغذات کہاں ہیں؟ مجھے تو یوں لگتا ہے جیسے تم غیر قانونی طور پر اس ملک میں داخل ہوئے ہو۔ ہو سکتا ہے غیر ملکی جاسوس ہو۔ پڑوسی ملک سے ہمارے ویسے ہی اچھے تعلقات نہیں ہیں۔ یہ بات ثابت ہو گئی دوست! تو سوچ لو کہ تمہارا کیا حشر ہوگا.....“

”کیا کہنا چاہتے ہو؟“ میں نے طنزیہ انداز میں مسکراتے ہوئے کہا۔

”مسکرا کیوں رہے ہو؟ یہ نہیں جانتے کہ سارے دانت حلق میں گرا دوں گا؟“

”جانتا ہوں۔ تم ایسا کر سکتے ہو۔ لیکن درپردہ کیا تم مجھ سے یہ نہیں کہنا چاہتے کہ پرنس کی غلامی قبول کر لوں؟“

”اگر پاگل پن کی اداکاری کرو گے تو یہ جان لو کہ ہم نے اچھے اچھے پاگلوں کو درست کر دیا ہے۔“

”ٹھیک ہے۔ تو پھر تم مجھے بھی درست کر دو۔“ میں نے کہا اور انسپکٹر مجھے گھورنے لگا۔

”ٹھیک ہے۔ جاؤ..... چلو! اسے اندر لے جاؤ۔ تھوڑی دیر کے بعد میں اس کے ٹخنے

پولیس ہی نے اُس کی مدد کی تھی اور دوبارہ یہاں پہنچانے میں بھی پولیس ہی کا ہاتھ کار فرما تھا۔ چنانچہ چند لمحوں بعد میں دروازے کے پاس آکھڑا ہوا۔ پہرہ دینے والے سنتریوں نے چونک کر مجھے دیکھا اور پھر اُن میں سے ایک بولا۔

”کیا بات ہے؟“

”سنتری صاحب! مجھے پچھلی رات اس لاک آپ میں کب لایا گیا؟“

”او بھائی! پچھلی رات ہماری ڈیوٹی نہیں تھی۔ رات کو ڈیوٹی والا آئے گا تو پوچھ لینا۔“

دوسرے سنتری نے گہڑے ہوئے لہجے میں کہا اور میں گردن ہلانے لگا۔

اب مجھے اس بات کا یقین ہو گیا تھا کہ کوئی بڑی پوسٹ کا آفیسر اُس عورت کا آلہ کار ہے۔ یہ تو بڑی خوفناک بات تھی۔ میرے حق میں قطعی بہتر نہیں تھی۔ کافی دیر گزر گئی۔ اس کے بعد سنتریوں نے لاک آپ کا دروازہ کھولا اور مجھے باہر آنے کے لئے کہا۔ میری روح فنا ہو رہی تھی اور مجھے یقین تھا کہ وہ لوگ مجھے اُس اذیت خانے میں لے جائیں گے۔ لیکن مجھے انسپکٹر کے کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ انسپکٹر نے طنزیہ نگاہوں سے مجھے دیکھا اور سنتریوں کو واپس جانے کا اشارہ کیا اور بولا۔

”کہو..... دماغ ٹھکانے آیا کچھ؟“

”انسپکٹر! جو کھیل تم کھیل رہے ہو، تمہارے حق میں بھی بہتر ثابت نہیں ہوگا۔“

”دھمکیاں دے رہے ہو مجھے؟“ انسپکٹر گر جا۔

”نہیں..... حقیقت بتا رہا ہوں۔ تم نے آخر مجھے کیوں گرفتار کیا ہے؟“

”بملا کے قتل کے سلسلے میں۔ تم نے اُسے قتل کیا اور اس کے دو گواہ موجود ہیں۔“

”گواہ صرف یہ کہتے ہیں کہ بملا میرے کمرے میں داخل ہوئی تھی۔“

”ہاں! اور اس کے بعد کسی نے اُسے تمہارے کمرے سے باہر نکلتے ہوئے نہیں دیکھا۔“

البتہ ہوٹل ہی کی سیڑھیوں کے نیچے اُس کی لاش پائی گئی تھی۔

”تو کیا اس بات سے میں قاتل ثابت ہو گیا؟“

”ہوئے نہیں ہو تو ہو جاؤ گے۔“

”تو ٹھیک ہے۔ تم میرا مقدمہ عدالت میں پیش کر دو، مجھے اعتراض نہیں ہے۔ لیکن اب

مجھے لاک آپ میں رکھنا کیا معنی رکھتا ہے؟“

نام اعترافات کر لئے اور تمہاری گرفتاری کا کوئی جواز نہیں رہا ہے کم از کم بملا کے حل کے لئے میں۔ لیکن پاسپورٹ کا نہ ہونا اور تمہاری اپنی شخصیت کا جاننا ہمیں اس بات کا حق دیتا ہے کہ ہم تمہیں ابھی لاک آپ میں رکھ سکیں۔ لیکن ہم ایسا نہیں کر رہے۔ جاؤ! تمہاری پھٹی۔“

”اور میرا وہ خزانہ؟“

”کون سا خزانہ؟ دماغ خراب ہوا ہے کیا؟ پاگل پن کی باتیں کر رہے تھے اور ابھی تک بہتور کئے جا رہے ہو۔“

”اوہ! تو یہ مسئلہ ہے۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”کیا مسئلہ ہے؟ خبردار! اگر کسی کے سامنے خزانے کا نام بھی لیا۔ سونے کے وہ سیکے جن کی تعداد ساٹھ ستر کے قریب ہے تمہارے پاس سے مشتبہ طور پر برآمد ہوئے تھے۔ وہ پولیس نے اپنی تحویل میں لے لئے ہیں اور اس کے علاوہ اور کیا تھا تمہارے پاس؟“

”ٹھیک ہے ڈی ایس پی صاحب..... ٹھیک ہے! ظاہر ہے میرے پاس یہ سب کچھ ثابت کرنے کے لئے کوئی ثبوت نہیں ہے۔ اگر آپ اس پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں تو ظاہر ہے یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ تو میں جاؤں؟“

”ہاں! جاؤ.....“

”کچھ تو دے دیجئے مجھے اس میں سے۔ زندگی گزارنے کے لئے کچھ نہ کچھ کرنا ضروری ہے۔“

”تمہارے پاس سے جو کرنسی ملی ہے ہمیں وہ تمہاری ملکیت ہے۔ تم اسے واپس لے جا سکتے ہو۔“ ڈی ایس پی صاحب نے ازراہ کرم کہا۔ میں نے اسی کو غنیمت جانا اور کرنسی جیب میں ڈالنے کے بعد دروازے کی جانب چل پڑا۔ تب عقب سے ڈی ایس پی صاحب کی آواز ابھری۔ ”بہتر ہے کسی دماغی ہسپتال میں جا کر اپنا علاج کرا لو۔ خواہ مخواہ اول فول بکتے پھرو گے تو لوگ پٹائی بھی کریں گے تمہاری اور دوبارہ تھانے میں بند کر دیئے جاؤ گے۔“

میں درپردہ اس دھمکی کو اچھی طرح سمجھ رہا تھا۔ ڈی ایس پی نے کہا تھا کہ باہر جا کر میں کچھ بھی کہوں لیکن کم از کم خزانے کا نام نہ لوں۔ اور سچی بات ہے کہ میں لینا بھی نہیں چاہتا

پھر توڑ دوں گا تاکہ اسے ہوش آجائے۔“ سنتری ایک بار پھر مجھے لاک آپ میں لے گئے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ میں پولیس کے چنگل میں بے بس تھا اور پولیس افسر سے بدکلامی میرے ہی حق میں بری ثابت ہو سکتی تھی۔ مگر کیا کرتا؟ حالات کو قبول نہیں کر پارہا تھا۔ مجھے اب سو فیصد یقین ہو گیا تھا کہ پرنس اور پولیس والے ملے ہوئے ہیں۔ لاک آپ میں زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ دوبارہ میرا بلاوا آ گیا۔ اس بار جب ایس ایچ او کے کمرے میں داخل ہوا تو ڈی ایس پی بھی وہاں موجود تھے اور اُن کے چہرے پر عجیب سے آثار تھے۔

”بیٹھے مسٹر منصور!“

میں کرسی پر بیٹھ گیا۔ ڈی ایس پی نے معنی خیز نگاہوں سے انچارج کی طرف دیکھا اور انچارج نے آنکھیں بند کر کے گردن ہلا دی۔ مجھ سے وہ آنکھ ہی نہیں ملا رہا تھا۔ ڈی ایس پی کہنے لگے۔ ”دوست! یہ بات ثابت نہیں ہو سکی کہ تم لندن سے آئے ہو۔ ہم چاہیں تو کم از کم اس جرم کے سلسلے میں تمہیں بند رکھ سکتے ہیں۔ لیکن ہم نے آپس میں مشورہ کر کے یہ فیصلہ کیا ہے کہ تمہیں آزادی دے دی جائے۔“

”یہ فیصلہ آپ کو کرنا ہی تھا ڈی ایس پی صاحب!“

”کیوں؟“

”اس لئے کہ کسی بھی مسئلے میں میرا کوئی قصور نہیں ہے۔“

”بکواس کرتے ہو..... بالکل بکواس کرتے ہو۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ بملا کا قاتل گرفتار ہو گیا ہے اور اُس نے اپنے آپ کو ہیڈ کوارٹر میں پیش کر دیا ہے۔ لیکن اس سے یہ مت سمجھنا کہ تمہارا دوسرا جرم بھی ختم ہو جاتا ہے۔“

”بملا کا قاتل گرفتار ہو گیا؟“ میں نے متحیرانہ انداز میں پوچھا۔

”ہاں! اُس نے اپنے آپ کو پولیس ہیڈ کوارٹر میں پیش کر دیا ہے اور بتایا ہے کہ بملا اُس کی بہن تھی۔ وہ آوارہ اور بدچلن ہو کر پیسہ کمانے لگی تھی۔ چنانچہ اُس نے شدت غضب میں آ کر اپنی بہن کو اُس وقت ہلاک کر دیا تھا، جب وہ ہوٹل کی سیڑھیاں اتر کر نیچے آئی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ بملا ہوٹلوں میں کال گرل کی حیثیت سے آتی جاتی رہتی تھی۔ اُس نے

بچوں۔ آخر اس غلامی کے ذریعے وہ مجھ سے کیا چاہتی ہے۔ بے کار کی ضد کسی طرح ہار آمد نہیں ہوتی۔ چنانچہ دل میں یہ آخری فیصلہ کرنے کے بعد میں نے از سر نو ہمت باندھی اور پھر سڑکوں پر نکل آیا۔ لیکن مزید دو دن اور گزر گئے اور کسی نے میری جانب رخ بھی نہیں کیا۔ کیا پرنس مجھ سے مایوس ہو چکی ہے یا وہ مجھے تلاش نہیں کر پارہی؟ جانے کبخت کون سی جگہ تھی، جہاں مجھے لے جایا گیا تھا۔ اگر خود ہی وہاں پہنچ سکتا تو ضرور پہنچ جاتا۔ میں بے حد پریشان تھا۔ انتہائی پریشان.... پھر میں نے فیصلہ کیا کہ کم از کم بمبئی چھوڑ دیا جائے۔ یہی میں رہنا آسان کام نہیں تھا۔ لیکن یہاں سے جا کر میں کہاں رہ سکتا ہوں؟ عجیب الجھن میں گرفتار تھا۔

دوسری صبح ایک اور پریشانی کا آغاز ہو گیا۔ میں نے اخبار خریدا تو نہیں تھا بلکہ ہوٹل کے نچلے حصے میں ایک صاحب اخبار پڑھ رہے تھے۔ میں نے اُن کے ہاتھ سے اخبار اُٹک لیا کیونکہ اخبار میں مجھے اپنی تصویر نظر آئی تھی۔ اُن صاحب نے چونک کر مجھے دیکھا تو میں نے معذرت آمیز انداز میں کہا۔

”ابھی ایک منٹ..... ابھی واپس کرتا ہوں۔“ میں نے ایک بار پھر اخبار میں اپنی تصویر دیکھی جو پہلے صفحے پر چھپی ہوئی تھی۔ اور اس کے بعد میں اس کے نیچے لگی ہوئی خبر پڑھنے لگا۔ دوسرے لمحے میرے بدن نے ٹھنڈا پسینہ چھوڑ دیا تھا.... خبر تھی کہ ایئر پورٹ پر ایک پراسرار شخص ایک کمپنی کے جہاز سے اُترا۔ اُس کے ساتھ سامان کا ایک بیگ بھی تھا۔ کسٹم ڈیپارٹمنٹ میں اُس کے بیگ کی تلاشی لینے کی تیاریاں شروع کی گئیں تو اُس نے دفعۃً کسٹم افسروں پر فائرنگ شروع کر دی اور وہاں سے نکل بھاگا۔ دو کسٹم آفیسر ہلاک ہو گئے۔ تصویر سو فیصد میری تھی اور میں ہوش و حواس سے بیگانہ ہوا جا رہا تھا۔ ہلاک کے قتل کے بعد جب میں الزام سے بچا تو میں نے سوچا کہ کم از کم موت کا پھندا تو میرے حلق سے علیحدہ ہو گیا ہے۔ لیکن اب دو کسٹم افسروں کے قتل کا مسئلہ اور میری تصویر.... ظاہر ہے، وہ پراسرار شخص میں نہیں تھا۔ مجھے تو اس سلسلے میں کوئی معلومات نہیں تھیں۔ اخبار میں نے ان صاحب کو واپس کر دیا اور فوراً ہوٹل سے باہر نکل آیا۔ کیونکہ یہ تصویر وہ بھی دیکھ سکتے تھے۔

اب میرے لئے ایک بار پھر بھاگ دوڑ کا دور شروع ہو گیا تھا۔ میں جانتا تھا کہ پولیس طرف پولیس چوکس ہو گئی ہوگی۔ لیکن یہ سب کیسے ہوا؟ اور اس سلسلے میں زیادہ

تھا۔ وہ میری تقدیر ہی میں نہیں تھا۔ میری تقدیر میں تو کچھ بھی نہیں ہے۔ یہ بات میں اچھی طرح جانتا ہوں۔ ایک بار پھر سڑکوں پر آوارہ ہو گیا تھا۔ بہت تھوڑی سی رقم پاس، پلے تھی۔ اس کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں تھا۔ اور پھر بمبئی جیسے شہر میں بے یار و مددگار تھا، جہاں فٹ پاتھ پر سونے کے لئے بھی کرایہ ادا کرنا پڑتا ہے۔ بہت دیر تک آوارہ پھرتا رہا۔ ذہن ماؤف ہو رہا تھا۔ کوئی بات سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ پاسپورٹ کا حصول آسان نہیں ہوگا۔ میں اگر اس کے لئے کوشش بھی کروں تو اوّل میرے پاس خرچ کرنے کے لئے کوئی بڑی رقم بھی نہیں ہے۔ اور پھر پاسپورٹ لے کر بھی کیا کروں گا؟ کیسے نکلوں گا یہاں سے؟

حالات میرے بس میں بھی نہیں تھے۔ پہلے کم از کم یہ تو تھا کہ کہیں نکل جانا چاہتا تو اس میں آسانی ہوتی۔ اب تو بمبئی تھا اور میں..... چنانچہ میں فٹ پاتھوں اور سڑکوں پر وقت گزاری کرنے لگا۔ پھر ایک چھوٹے سے ہوٹل میں قیام کے لئے جگہ تلاش کر لی۔ اتنی رقم تھی کہ ابھی میں چار پانچ دن تک اس کا کرایہ ادا کر کے یہاں رہ سکتا تھا۔ کم از کم کچھ وقت ڈگزارا جائے۔ اس کے بعد جو ہوگا دیکھا جائے گا۔ بھیا نک مستقبل میری آنکھوں کے سامنے تھا۔ یہاں سے نکلنے کا بندوبست اگر ہو جائے تو سیدھا اپنے وطن ہی چلا جاؤں اور الہ شہادت کے قدموں میں گر کر اُن سے معافی مانگ لوں اور کہوں کہ خدا کے واسطے! اب بار پھر مجھے اُسی کھولی میں جگہ دے دیں جہاں کم از کم میرے حسین خواب تھے۔ مازمت نہیں تھی تو کیا ہوا؟ پیٹ بھر روٹی نہیں ملتی تھی تو کیا ہوا؟ کم از کم بقیہ زندگی تو سکون سے تھی۔ لیکن یہ سب خواب ہی معلوم ہوتا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے خالہ شہادت بھی ایک خواب ہے۔ اور اب اس خواب سے میری آنکھ کھل گئی ہو۔ ہوٹل کے کمرے میں اپنے مجھول سے تر پر پڑا میں اس بارے میں سوچتا رہا۔

دو دن گزر گئے۔ تیسرا دن اور چوتھا دن بھی گزر گیا۔ رقم تیزی سے ختم ہوتی جا رہی تھی۔ اور اب اس کے سوا اور کوئی چارہ کار نہیں تھا کہ کسی مجرمانہ طریقے سے دوبارہ رقم کا بندوبست کروں۔ یہ خیال بھی تھا کہ کسی نہ کسی وقت، کسی سڑک یا کسی گلی میں یا کسی ہوٹل کے دروازے پر ایک بار پھر وہ لوگ مجھ تک پہنچ جائیں گے اور میں دوبارہ اُس پرنس کے سامنے ہوں گا جو مجھے اپنا غلام بنانا چاہتی تھی۔ ایک بات یہ بھی سوچتی تھی کہ جب دوسرے لوگوں کی خواہش کے مطابق میں بہت سے کردار ادا کر چکا ہوں تو پرنس کا غلام بن کر بھی

سوچنا نہ پڑا۔ میں نے خوفزدہ انداز میں سوچا کہ صورت حال تبدیل ہو گئی ہے اور یقیناً یہ سب کچھ اُس پرنس کا کیا ہوا ہے۔ وہ ایک مسئلے میں ناکام ہو گئی تو اُس نے کوئی دوسرا کھیل، کھیل ڈالا۔ لیکن..... لیکن یہ تو بہت خوفناک بات ہے۔ کہاں چھپوں؟ کہاں جاؤں؟ کیا کروں؟ میں نے سیدھا ریلوے سٹیشن کا رخ کیا تھا۔ پاس، پلے جو رقم تھی اُس کے ذریعے اگر بمبئی ہی سے نکل جاؤں تو اس سے اچھی بات اور کوئی نہیں ہو سکتی تھی۔

ریلوے پلیٹ فارم پر پہنچنے کے بعد میں نے اپنے آپ کو دوسروں کی نگاہوں سے چھپاتے ہوئے یہ دیکھنا شروع کر دیا کہ میں کون سی ٹرین میں چھپ کر بیٹھ سکتا ہوں؟ ٹرینوں کے بارے میں مجھے صحیح معلومات حاصل نہیں تھیں۔ میں ایسے ہی ٹرینوں کے اوقات پڑھنے لگا اور اُن کے راستوں کے بارے میں جاننے کا چارٹ دیکھنے لگا۔ دفعۃً مجھے اپنے عقب سے شور و غل کی آواز سنائی دی۔ دیکھا تو چند پولیس والے دوڑے چلے آ رہے تھے اور اُن کا رخ میری جانب تھا..... میں اُچھل کر بھاگا۔ پلیٹ فارم سے نیچے کود کر سیڑھیوں پر پہنچا اور پھر سیڑھیاں پھلانگتا ہوا اپنے آپ کو بچانے کی کوشش کرنے لگا۔ پولیس والوں کی سیٹیاں فضا میں اُبھریں اور مجھ پر فائرنگ شروع ہو گئی.....

کئی گولیاں میرے پاس سے سنسناتی گزر گئی تھیں۔ پھر میں مال گاڑی کے ایک ڈبے میں گھس گیا۔ پولیس والے میرا مسلسل تعاقب کر رہے تھے۔ مال گاڑی کے اس ڈبے میں گھس کر میں ایک لمحے کے لئے، پولیس والوں کی گولیوں سے محفوظ ہو گیا تھا۔ لیکن ظاہر ہے چند لمحات کے بعد وہ وہاں پہنچ جائیں گے۔ میں تو اُن کا مقابلہ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ چنانچہ ڈبے کے دوسرے دروازے سے اُترنے کے بعد میں نے ایک بار پھر دوڑنا شروع کر دیا۔ لیکن اس بار میں نے عقل سے کام لیا تھا۔ میں سیدھا نہیں دوڑا تھا، بلکہ اُس ڈبے کے نیچے گھس کر واپس اس طرف دوڑنے لگا تھا جس طرف سے پولیس والے آ رہے تھے۔ میری یہ چال کارگر رہی۔ پولیس والے مال گاڑی کے ڈبے کے قریب پہنچ گئے اور پھر اُسے چاروں طرف سے گھیرنے لگے۔ میں برق رفتاری سے لوگوں کی بھیڑ میں گم ہو کر پلیٹ فارم سے باہر نکل آیا اور ابھی میں نے دروازے سے باہر قدم رکھا ہی تھا کہ ایک آدمی میرے قریب پہنچ گیا۔

”جناب آپ کی کار وہ کھڑی ہوئی ہے.....“

میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ..... اُس کے ساتھ تیزی سے چل پڑا اور گاڑی میں بیٹھ گیا۔ اس شخص نے فوراً ہی ڈرائیونگ سیٹ کا دروازہ کھولا اور کار سٹارٹ کر کے آگے بڑھا دی۔ نکل و صورت سے وہ ایک پڑھا لکھا اور مہذب آدمی معلوم ہوتا تھا۔ تعلق بھی اسی ملک سے تھا۔ لیکن پتہ نہیں اُسے کوئی دھوکہ ہوا تھا یا کوئی اور بات تھی۔ بہر طور! میں سکون سے بیٹھا ہوں۔ اگر اس میں بھی اب پرنس کا ہاتھ ہے تو میں تو تھا ہی پرنس کی تلاش میں۔

کار دوڑتی رہی۔ اور تھوڑی دیر کے بعد ایک مکان کے سامنے جا رُکی۔ خوبصورت مکان تھا۔ مجھے دروازے سے اندر داخل کر دیا گیا اور یہاں مزید دو افراد نے میرا استقبال کیا۔ وہ میرے سامنے مؤدب ہو گئے تھے۔ انہوں نے گردن خم کر کے کہا۔ ”اندر تشریف لے چلئے جناب! آپ کے لئے تمام انتظامات مکمل ہیں۔ ہم معافی چاہتے ہیں کہ بروقت آپ تک نہ پہنچ سکے۔“

”کوئی بات نہیں ہے۔ میں مطمئن ہوں۔“ میں نے تمسخرانہ انداز میں جواب دیا۔ اب تو یہ سارے ڈرامے مجھے مضحکہ خیز ہی لگتے تھے۔ مؤدب لوگ مجھے اندر لے گئے اور پھر ایک دروازے کے پاس رُک کر انہوں نے کہا۔

”یہ آپ کا بیڈ روم ہے جناب! ہم سب آپ کی خدمت کے لئے حاضر ہیں۔ کوئی بھی ضرورت ہو دیوار پر لگا ہوا بٹن دبا دیجئے۔ آپ آرام کرنا پسند کریں گے۔ غسل کر لیجئے گا۔ آپ کے لباس ابھی پہنچا دیئے جائیں گے۔“

”اوکے..... اوکے.....“ میں نے بھاری لہجے میں کہا اور بیڈ روم کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ طبیعت خوش ہو گئی تھی۔ اپنی تقدیر کے بارے میں کچھ کہنا مذاق اُڑانے کے مترادف تھا۔ عام طور سے مجھے اچھی رہائش گاہیں ہی ملتی تھیں اور اُن کا معاوضہ اتنا زبردست ہوتا تھا کہ طبیعت خوش ہو جاتی تھی۔ اسی طرح سے یہ کمرہ بھی تھا۔ اتنی شاندار انکوریشن تھی کہ آنکھیں نہیں ٹھہر پاتی تھیں۔ میں درحقیقت طبیعت پر بہت گرانی محسوس کر رہا تھا۔ چنانچہ غسل کیا تو اتنی فرحت محسوس ہوئی کہ ناقابل بیان ہے۔ تب کسی نے دروازے پر ہلک دی اور میں چونک کر اُدھر دیکھنے لگا۔

”جناب! آپ کا لباس باہر سٹینڈ پر ہے۔ میں دروازہ باہر سے بند کئے دیتا ہوں۔“

”ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے.....“ میں نے جواب دیا اور اُس کے بعد پھر ٹھنڈے پانی سے

لطف اندوز ہونے لگا۔ پھر غسل سے فارغ ہو کر بدن خشک کیا۔ سلک کا ایک سلپنگ سوٹ پہن لیا۔ لباس حیرت انگیز طور پر میرے بدن پر فٹ تھا۔ اس کے بعد میں اطمینان سے مسہری پر بیٹھ گیا۔

اب جو کچھ بھی ہو، اگر اُسی کمبخت پرنس نے یہ نئی چال چل کر میری جان بچائی ہے تو اس وقت مجھے اُس کا شکر گزار ہی ہونا چاہئے تھا۔ بعد کے معاملات بعد میں دیکھے جائیں گے۔ جہاں تک کسی چکر میں پھنسنے کی بات ہے تو اس سے فرار کہاں تھا؟ کسی چکر میں نہ بھی پھنستا تو چکر خود ہی مجھ میں پھنس جاتے تھے اور بالآخر میں چکرانے لگتا تھا۔ بارہا یہ فیصلے کئے تھے کہ اب کسی بھی مسئلے میں حالات سے روگردانی نہیں کروں گا۔ لیکن پھر نہ جانے کون سی فطرت غالب آ جاتی تھی اور میں اپنے بچاؤ میں مصروف ہو جاتا تھا۔ لعنت ہے مجھ پر..... کسی کل چین نہیں ہے۔ کوئی لمحہ پرسکون نہیں ہے۔ ایک بار پھر دل میں اپنے عزم کو دہرایا کہ دنیا جو کچھ بنا رہی ہے، بن جاؤ اور اس سے گریز نہ کرو..... چنانچہ میں پرسکون ہو کر لیٹ گیا۔ زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ وہی دو افراد اندر داخل ہو گئے۔ اُن میں سے ایک ٹرائی دھکیلتا ہوا آیا تھا جس پر کافی کے برتن اور کچھ لوازمات سجے ہوئے تھے۔ ٹرائی مسہری سے لگا دی گئی اور میں اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ وہ دونوں ادب سے گردن جھکا کر کچھ کہے بغیر واپس چلے گئے تھے۔ کافی کی دو پیالیاں ہیں۔ بسکٹ اور خشک میوے کھاتا رہا اور کمرے کی سجاوٹ دیکھتا رہا۔ ایک چھوٹے سے ایکوریم میں مچھلیاں تیر رہی تھیں۔ رنگین اور خوبصورت مچھلیاں۔ میری نگاہیں اُن پر جم گئیں اور میں مچھلیوں کی پرسکون زندگی دیکھنے لگا۔ بظاہر وہ پرسکون تھیں لیکن کون جانے کہ اس ایکوریم میں قید ہونے کے بعد ان کی ذہنی کیفیت کیا ہو؟ دل چاہا کہ ایک ایک مچھلی کو ایکوریم سے نکال کر دریا میں پھینک دوں۔ لیکن اول تو دریا کہاں تھا؟ دوسری بات یہ کہ یہاں سے جا نہیں سکتا تھا۔ تیسری بات یہ کہ مجھے ان مچھلیوں کو آزاد کرنے کا حق نہیں تھا۔ جانے کتنا وقت اسی طرح گزر گیا۔

رات کو اعلیٰ قسم کا ڈنر دیا گیا۔ لیکن ڈنر ٹیبل پر میں تنہا تھا۔ بڑے اطمینان سے میں نے رات کا کھانا کھایا۔ پھر اُن میں سے ایک شخص نے کہا۔ ”کیا آپ چہل قدمی کرنا پسند کریں گے؟“

”بالکل پسند کریں گے۔“ میں نے جواب دیا اور اُن کے ساتھ باہر نکل آیا۔ تب میں

پہلی بار محسوس کیا کہ یہ عمارت ساحل سمندر پر واقع ہے۔ اس کے عقبی حصے بے حد حسین عمارت کے عقبی حصے میں گھاس کا ایک بہت بڑا قطعہ تھا جس میں کیاریاں بنا کر پھول بنائے گئے تھے۔ قطعے کے اختتام کے بعد چند سیڑھیاں نیچے اُترتی تھیں اور ساحل تک چلی جاتی تھیں۔ حسین ترین جگہ تھی یہ۔ میں خاموشی کے ساتھ اُن کے ساتھ چلتا رہا۔ رات کا تھا، اس لئے کوئی خطرہ بھی نہیں تھا۔ اور پھر خطرہ حیثیت کیا رکھتا تھا؟ اب ظاہر ہے اس کے بعد کچھ نہ کچھ تو ہونا ہی تھا۔ سمندر کے کنارے میں دیر تک چہل قدمی کرتا رہا۔ وہ بڑا ادب، خاموشی سے دو قدم پیچھے ہٹ کر میرے ساتھ چلتے رہے۔

جب میں تھک گیا تو واپسی کا ارادہ کیا اور وہ میرے ساتھ اندر آ گئے۔ ہر طرح کی باتیں ہم پہنچائی گئی تھیں مجھے اور میں اپنے آپ کو بہت خوشگوار کیفیت میں محسوس کر رہا تھا۔ ان تمام چیزوں سے کھل کر لطف اندوز ہونا چاہتا تھا کیونکہ یہ نہیں معلوم تھا کہ کتنی دیر بعد میرے لئے مصیبتوں کا آغاز ہو جائے گا۔ دوسرا دن بھی اسی طرح گزر گیا۔

شام کے تقریباً سات بجے ہوں گے کہ ایک شخص دوڑتا ہوا اندر آیا۔ یہ انہی دونوں میں سے ایک تھا۔ دلچسپ بات یہ تھی کہ میں نے اُن دونوں میں سے ایک کا نام بھی نہیں پوچھا تھا۔ اور نہ ہی انہوں نے اب تک مجھے میرے نام سے مخاطب کیا تھا۔ اُس نے آتے ہی کہا۔ ”جناب! میڈم ربیکا آئی ہیں۔ ابھی ابھی گاڑی سے اُتری ہیں۔ کیا حکم ہے ان کے لئے؟ ملیں گے آپ ان سے یا انہیں ٹال دیا جائے؟“

”میڈم ربیکا.....“ میں نے سر جھکاتے ہوئے کہا۔

”جلدی فرمادیں۔ یقیناً وہ اندر داخل ہو گئی ہوں گی۔“

”جب اندر داخل ہو گئی ہیں تو آنے دو۔“ میں نے جواب دیا۔

”ڈرائنگ روم میں بٹھایا جائے یا یہاں بیڈ روم میں بھیج دوں؟“

”بیڈ روم ہی میں بھیج دو۔“ میں نے جواب دیا۔

وہ باہر نکل گیا۔ چند لمحات کے بعد دروازہ کھل گیا۔ لمبے قد کے دُبلے پتلے لیکن انتہائی عورت اور متناسب بدن کی مالک تقریباً پچیس سالہ لڑکی یا عورت اندر داخل ہوئی تھی۔ دروازہ کھول کر اُس نے مجھے دیکھا پھر شوخ انداز میں دیکھتی رہی۔ اور پھر دونوں ہاتھ پھیلا کر اُستغیا کرتی آئی۔

”ہیلو ڈارلنگ کیلاشی! اوہ مائی گاڈ! یہ تم ہی ہو؟ کیا تم ہی ہو یہ مسٹر کیلاشی.....“

”ہیلو سوٹ ہارٹ! کیسی ہو تم؟“ میں نے بھی اسی گرم جوشی کا مظاہرہ کیا۔

”گڈ گاڈ! تم اتنے شاندار ہو گے، میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ ویری گڈ! تم سے مل کر

اب دلی مسرت ہوئی ہے۔“ اُس نے مجھے اُوپر سے نیچے دیکھتے ہوئے کہا اور پھر میرے بازو پر دونوں ہاتھ رکھ دیئے۔ میں تھوڑا سا ٹھٹک گیا تھا۔ اُس کے یہ الفاظ کہ تم اتنے شاندار ہو گے مجھے اندازہ نہیں تھا اس بات کی نشاندہی کرتے تھے کہ کیلاشی جو کوئی بھی ہے اور جس کے بارے میں مجھے ابھی ابھی معلوم ہوا ہے کم از کم اس کا صورت آشنا نہیں ہے۔ میں نے جس انداز میں اُس کی پذیرائی کی تھی، اس سے یہ اظہار کیا تھا جیسے ہم گہرے ساتھی، دوست یا اور کچھ بھی ہیں۔

پھر میں نے کہا۔ ”تم بھی میرے خیال کے برعکس ہو ڈیر ریکا!“

”اوہ نو..... نو..... مجھے کتنی خوشی ہو رہی ہے، میں بیان نہیں کر سکتی۔“

”بیان کر دو تو اچھا ہے۔“ میں نے کہا اور وہ ہنس پڑی۔

”ویری گڈ! خوش مزاج بھی ہو۔ ورنہ عموماً ہماری فیلڈ کے لوگ چڑچڑے اور بد مزاج ہوتے ہیں۔ لیکن تمہارے بارے میں مجھے پتہ چل گیا تھا کہ تم عام لوگوں سے بالکل مختلف ہو۔ اوہ! میں کتنی خوش ہوں، بیان نہیں کر سکتی۔“ اُس نے پھر اپنے الفاظ دہرائے۔ کسی قدر کھسکی ہوئی سی لگتی تھی۔ لیکن بہر طور! شکل و صورت بہت عمدہ تھی۔ ”مجھے تو جب تمہارے بارے میں معلوم ہوا تو ایک لمحہ بھی صبر نہ کر سکی۔ فوراً ہی دوڑی چلی آئی۔“

”تمہیں صبر کرنا بھی نہیں چاہئے تھا ڈیر!“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا اور اُسے بیٹھنے کی پیش کش کی۔ وہ کرسی پر بیٹھنے کی بجائے مسہری پر جا بیٹھی تھی۔ اور اس حرکت سے میں نے اُس کے بارے میں کافی حد تک اندازہ لگا لیا تھا۔ بہر طور! میں خود کرسی پر جا بیٹھا۔

وہ میٹھی نگاہوں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ پھر بولی۔ ”تم..... تم نے کیسے کیسے پیش ہا کارنامے انجام دیئے ہیں۔ میں تو جب بھی تمہارے بارے میں کچھ سنتی تھی خوفزدہ ہو جاتی تھی۔ یہ سوچتی تھی کہ پتہ نہیں تم کس قسم کے آدمی ہو گے۔ ڈراؤنے اور خوفناک۔ چہرے پر زخموں کے نشانات ہوں گے اور پورے بدن پر بال ہی بال..... مگر تم..... اب لطف آئے گا کام کرنے کا۔ اوہ! ڈیر کیلاشی.....“

ہم دونوں باہر نکل آئے۔

”یہاں تمہیں کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی؟“ لڑکی نے میرے ساتھ آگے بڑھتے ہوئے

کہا۔ ”بالکل نہیں۔ بہت اچھا ماحول ہے یہاں کا۔ سب لوگ بہت اچھے ہیں۔ اور پھر اب تو تم آگئیں۔ کیا تم واپس چلی جاؤ گی؟“

”ہرگز نہیں۔ اب تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ویسے میں نے، معاف کرنا! یہاں آتے ہوئے یہ سوچا تھا کہ اگر تمہاری شخصیت میری توقع کے مطابق ہی نکلی تو میں تم سے معذرت کر کے چلی آؤں گی۔ لیکن اب کس کا جانے کو جی چاہتا ہے۔“

”میرا بھی نہیں چاہتا۔“ میں نے جواب دیا۔ یہ خاتون تھیں کیا۔ اور ان کی اپنی حیثیت کیا تھی؟ اس بارے میں جاننا مشکل تھا۔ لیکن بہر طور! آہستہ آہستہ معلومات حاصل ہو ہی جائیں گی۔ فی الحال تو ان کی ویری گڈ، ویری گڈ سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ دیر تک ہم مائل پر چہل قدمی کرتے رہے۔ میری نگاہیں دُور دُور تک بھٹک رہی تھیں۔ وہ مجھ سے باپ کی باتیں کر رہی تھی۔ میں لندن، پیرس اور اسکاٹ لینڈ یارڈ میں اپنی دیکھی ہوئی ٹیوٹوں کی تفصیل اُسے بتاتا رہا اور وہ ویری گڈ، ویری گڈ کی گردان کرتی رہی۔ پھر شاید وہ خود بھی تھک گئی اور ہم دونوں واپس اپنی رہائش گاہ کی طرف چل پڑے۔ میں اب اس صورت حال سے پوری طرح متفق ہو گیا تھا اور اس میں اس وقت تک کوئی ترمیم نہیں کرنا چاہتا تھا، جب تک ترمیم بیچ میں خود ہی نہ آکودے۔

سمندر کے کنارے کی غم ہوائیں بہت فرحت بخش تھیں۔ ہم کافی دیر سے واپس لوٹے۔ ریکا کی پسندیدگی اس حد تک بڑھ گئی تھی کہ اُس نے رات کو بھی واپسی کی ضرورت نہ سمجھی۔ اُس نے اپنے حالات سے جنون کی حد تک اُکتا گیا تھا، اب اپنی زندگی میں پیش آنے والے کبھی لمحے پر معترض نہیں تھا۔ زندگی کو اپنا سمجھنا میرے لئے مشکل ہو چکا تھا۔ میں تو یہ سمجھتا تھا کہ اپنی سوچ کا ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھا سکوں گا۔ یہی وجہ تھی کہ اجنبی ریکا کی بات کو بھی میں نے خوش دلی سے برداشت کر لیا۔

صبح ناشتے کے بعد وہ مجھ سے تھوڑی دیر کے لئے اجازت لے کر گئی اور پھر واپس آ کر شام کی چائے البتہ اُس نے میرے ساتھ پی تھی۔

”تم نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ یورپ میں گزارا ہے۔ میں تمہارا یارک شاروالا کیسے کبھی نہیں بھول سکوں گی۔ کمال کر دیا تھا اس میں تم نے کیلاشی!“ چائے کی چمکی لیے ہوئے وہ بولی۔

”اوہ ڈیئر ربیکا..... بس! کمالات خود بخود ہو جاتے ہیں اور ان میں انسان کی اپنی کوششوں کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔“

”لیکن یوڈی میکلارنس کو تو تم نے کھلے عام شکست دی تھی۔ کتنا مغرور انسان تھا وہ..... کتنا وحشی اور درندہ صفت..... لیکن یہ صرف کیلاشی ہی تھا جس نے یوڈی میکلارنس کو کتے کی موت مار ڈالا۔“

”بس! یوں سمجھ لو کہ اُس کی موت ہی آئی تھی۔“ میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

”شاید تم اس بات پر یقین نہ کرو کہ تم اسی وقت سے میرے ہیرو بن گئے تھے۔“

”اوہ..... اچھا، اچھا!“ میں اپنے آپ پر دل ہی دل میں ہنس رہا تھا۔ کون یوڈی میکلارنس اور کیسایارک شاروالا..... میں خالہ شہادت کی کھولی کے حوالے سے زیادہ بہتر طریقے سے پہچانا جاسکتا تھا۔ لیکن وقت مجھے جو کچھ بھی بنادے۔ اب پتہ نہیں یہ مسٹر کیلاشی میرے ہم شکل تھے یا ان تمام کوششوں میں کوئی اور کارروائی کارفرما تھی۔ میں جو اعترافات کر رہا تھا، اُن کے مضحکہ خیز ہونے پر خود دل ہی دل میں ہنس رہا تھا۔ اگر دوسرے ہنس رہے ہوں تو تعجب کی کون سی بات ہے؟

اسی طرح پانچ دن گزر گئے۔ چھٹے دن ربیکا نے مجھ سے کہا کہ ممکن ہے میں اکتاہٹ محسوس کر رہا ہوں۔ وہ بولی۔ ”ڈیئر کیلاشی! تمہارے لئے بھلا یہ کیا مشکل ہے کہ اپنے چہرے میں تھوڑی سی تبدیلی کر لو۔ آؤ! کیوں نہ بمبئی کی سیر کو چلیں؟ یہ جگہ ایسی دلنواز ہے کہ انسان کو اپنے آپ میں گم کر دیتی ہے۔“

”لیکن ڈیئر ربیکا! میک اپ کا سامان بھی تو ہونا چاہیے۔“

”کیا ضروری ہے؟ آنکھوں پر تاریک شیشوں کی عینک اور ناک کے نتھنوں میں سپرنگ..... تمہاری شخصیت ہی تبدیل ہو جائے گی۔ میں تمہیں یہ دونوں چیزیں مہیا کر دیتی ہوں۔“

”ٹھیک ہے۔“ میں نے دلیرانہ کہا۔ حالانکہ باہر جاتے ہوئے میری رُوح کانپ رہی

نہی۔ میں جانتا تھا کہ جو الزام مجھ پر آچکا ہے، وہ اتنا معمولی نہیں ہے کہ پولیس والے میرا چہرہ آسانی سے فراموش کر دیں۔ چپے چپے پر میری تلاش ہو رہی ہوگی۔ لیکن اب اتنی بزدلی کا مظاہرہ بھی نہیں کرنا چاہتا تھا کہ لوگ میرے لئے جان کی بازی لگا دیں۔ جس طرح انہوں نے پہلی مرتبہ مجھے پولیس کے چنگل سے نکالا تھا، اُسی طرح یقیناً وہ اب بھی میری نگرانی کا معقول بندوبست کریں گے۔

ربیکا نے مجھے بمبئی کی سیر کرائی۔ حسین عمارتوں اور حسین چہروں کا یہ شہر درحقیقت میرے لئے بہت پرکشش تھا۔ سوچا تو یہ تھا کہ اپنے اس مال و دولت کے ساتھ بمبئی میں ایک اعلیٰ درجے کی زندگی گزاروں گا۔ لیکن وہی تقدیر کا مسئلہ آ جاتا ہے۔ تقدیر کے کھیل بھی انوکھے ہوتے ہیں۔

یہ تمام باتیں میرے لئے باعث دلچسپی تھیں اور میں نے اپنے آپ کو پھر دنیا کے جھڑوں سے لا تعلق کر لیا تھا اور جس طرح میں نے اب تک بے شمار ملکوں کی سیر کی تھی، اُسی طرح بمبئی کو ایک سیاح کی حیثیت سے دیکھنے لگا۔

لیکن اب وہ وقت آ گیا تھا۔ اس تمام عیش و عشرت کا حساب ہونے والا تھا۔ یہ سب کچھ بھی میرے لئے اجنبی نہیں تھا۔ اس رات ربیکا نے مجھے بتایا کہ کل صبح ساڑھے دس بجے مسٹر بلیک، فرانس سے یہاں پہنچ رہا ہے۔ ”تمہیں یقینی طور پر مسٹر بلیک کا انتظار رہا ہوگا۔ ایسے کیلاشی! اس منصوبے کی تکمیل کے بعد تمہارا کیا پروگرام ہوگا؟ یہیں رُکو گے یا یہاں سے کہیں چلے جاؤ گے؟“

”کیا کہا جاسکتا ہے؟“ میں نے ٹھنڈی سانس لے کر گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ یہ مسٹر بلیک کیا چیز تھا؟ اس کے بارے میں بھلا مجھے کیا معلوم؟ ایک بات بار بار ذہن میں آرہی تھی۔ وہ کوئی ایسا منصوبہ لے کر آ رہا تھا جس پر مجھے عمل کرنا تھا اور یہ بات بھی سامنے تھی کہ مجھے اس منصوبے کے بارے میں معلوم ہونا چاہیے تھا۔ مسٹر بلیک کے آنے کے بعد میرا کیا ہوگا؟ اس کا فیصلہ کرنا بھی مشکل تھا۔ لیکن ڈر کی کیا بات ہے؟ صورت حال بگڑ گئی تو جو ہوگا، دیکھا جائے گا۔ چنانچہ میں نے ایک مطمئن رات گزاری۔

”سُرخے دن ناشتے وغیرہ سے فارغ ہونے کے بعد ربیکا مجھ سے رخصت ہو کر چلی گئی۔ وہ بلیک کو لینے ایئر پورٹ گئی تھی۔ اب بھی موقع تھا کہ اس کوٹھی سے بھاگ جاؤں اور

اپنی جان بچا لوں۔ بالآخر انسان تھا۔ خوف و دہشت کو دل سے کیسے جدا کر سکتا تھا؟ خطرناک لوگ تھے۔ یہ بات معلوم ہونے کے بعد کہ میں کیلاشی نہیں ہوں اور ان لوگوں کو دھوکہ دیتا رہا ہوں وہ میری زندگی کے گاہک بھی بن سکتے تھے۔ لیکن اس وقت یہاں سے بھاگنا بھی قیامت تھا۔ کیونکہ چپے چپے پر میری زندگی کے گاہک پھیلے ہوئے تھے۔ ناچار انتظار کرتا رہا اور ٹھیک پونے بارہ بجے مسٹر بلیک، ربیکا کے ساتھ یہاں پہنچ گئے۔ یقیناً بلیک تھے۔ افریقہ کے کسی ملک سے تعلق تھا۔ بدن پر اپنے دادا جان کا سوٹ پہنا ہوا تھا۔ اتنا ڈھیلا ڈھالا کہ ایسا لگتا تھا جیسے بانس پر لٹکا دیا گیا ہو۔ بڑا سا ہیٹ پہنے ہوئے تھے جو ان کے کانوں پر آ رہا تھا۔ چہرے پر بھی حماقت ہی برس رہی تھی۔ آنکھوں پر چشمہ لگا ہوا تھا جو پرانے بوڑھوں کی طرز کا تھا۔ دیکھنے میں اچھے خاصے کسی تھیٹر کے مسخرے معلوم ہو رہے تھے۔ انہوں نے اپنا برف جیسا رخ ہاتھ میرے ہاتھ میں دے کر منمناتے ہوئے کہا۔

”بہت دن کے بعد آپ سے ملاقات ہو رہی ہے مسٹر کیلاشی! کیسے ہیں آپ؟“

”بالکل ٹھیک ہوں مسٹر بلیک!“ میں نے لہجے کو پر اعتماد بناتے ہوئے کہا۔

”افسوس! کام وقت سے کچھ پہلے ہو رہا ہے۔ ہمیں اپنے بعض منصوبوں میں ناکامی ہوئی۔ مگر آئیے! میں آپ سے تفصیلی گفتگو کئے لیتا ہوں۔ کیونکہ کل ٹھیک ایک بجے وہ لوگ یہاں پہنچ رہے ہیں۔“

”اوہ..... اتنی جلدی؟“ میں نے حیرت کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

”ہاں..... کسی خاص وجہ سے ان کے پروگرام میں کوئی تبدیلی ہوئی ہے۔ ہم لوگ وقت نہیں جاسکے تھے۔“

”خیر! کوئی بات نہیں ہے۔ ابھی تو چوبیس گھنٹے کا وقت ہے ہمارے پاس۔“ میں نے کہا۔ ربیکا ہمارے ساتھ ہی اندر آئی تھی۔ مسٹر بلیک نے آرام نہیں کیا۔ انہوں نے اپنا وہ سوٹ کیس منگوا لیا جو وہ اپنے ساتھ لائے تھے۔ اور پھر سوٹ کیس کھول کر بیٹھ گئے۔ کچھ کاغذات، فائل، ایک فلم اسپول اور ایسی ہی چند دوسری چیزیں..... اس کے بعد انہوں نے فائلیں وغیرہ کھول کر میرے سامنے رکھ دیں اور میں ان کے مطالعے میں مصروف ہو گیا۔

انہوں نے ربیکا سے کہا کہ وہ سولہ ایم ایم کے پروجیکٹر کا بندوبست کرے اور ربیکا اٹھ کر باہر چلی گئی۔ مسٹر بلیک مجھے دیکھتے رہے اور میں فائل پر نگاہیں دوڑاتا رہا۔ عجیب

غریب عبارتیں درج تھیں اس فائل میں۔ میرے پلے کچھ نہیں پڑ رہا تھا۔ غالباً یہ کوڈورڈز تھے، جن میں مجھے ہدایات دی گئی تھیں۔ ربیکا کی آمد نے یہ مشکل حل کر دی۔ اُس نے پروجیکٹر ایک طرف رکھا اور پھر سکرین لگانے لگی۔ مسٹر بلیک نے وہ اسپول پروجیکٹر پر ڈھادیا اور مجھے اُس کی جانب متوجہ کر لیا۔ تب میں نے سکرین پر ایک شخصیت کو دیکھا جس کے مختلف پوز نمایاں کئے گئے تھے۔ یہ شخصیت میرے لئے اجنبی نہیں تھی۔ ایک بہت بڑے ملک کی بہت بڑی سیاسی شخصیت جو اس وقت ایک نہایت اہم سرکاری عہدہ رکھتی تھی۔ پھر اس کے بعد مجھے اُس شخصیت کی مختلف عادات سے متعلق فلم رپورٹیں دکھائی گئیں۔ اور ان فلم رپورٹوں میں کمٹری بھی تھی جس میں مجھے یعنی مسٹر کیلاشی کو ہدایات دی جا رہی تھیں۔ ایئر پورٹ پر کون کون سے لوگ متوقع ہو سکتے ہیں اور کتنے لوگوں کی نگاہوں میں دھول جھونک کر مجھے اپنا کام انجام دینا ہے؟ فلم رپورٹ میں ایئر پورٹ کے آس پاس کے مناظر بھی نمایاں کئے گئے تھے۔ اور اس کے بعد وہ بلڈنگ بھی دکھائی گئی تھی جو ابھی زیر تعمیر تھی۔ اس کے فاصلے کا پورا پورا ناپ موجود تھا۔ یہ تمام چیزیں مجھے بڑی تفصیل کے ساتھ ذہن نشین کرائی جا رہی تھیں اور میرے بدن میں ٹھنڈے پسینے آ رہے تھے۔ کیا کرنا ہے..... مجھے کیا کرنا ہے؟ پھر جب تمام فلم ختم ہو گئی تو مسٹر بلیک نے مجھ سے سوال کیا۔

”میرا خیال ہے مسٹر کیلاشی! اس سے زیادہ تفصیلی رپورٹ اور کوئی نہیں ہو سکتی۔ ہم نے بہت دُور بیٹھ کر انتظامات کئے ہیں۔“

”یقیناً..... میں حیران ہوں۔“ میں نے بھی اب اپنے جنون کا ساتھ چھوڑ دیا تھا۔

”اب آپ آخری چیز دیکھ لیجئے اور اس کے بعد آپ کے کام کا آغاز ہوتا ہے۔“ یہ آخری چیز جدید ساخت کی راکفل تھی جس پر دُور بین فٹ کر دی گئی تھی۔ مسٹر بلیک نے اُس راکفل کے مختلف پارٹس جوڑے۔ دُور بین اُس پر فٹ کی اور مجھ سے بولے۔ ”اس سے نو چیز آپ کے کام کے لئے دوسری نہیں ہو سکتی۔ اس کی رینج بہت زیادہ ہے اور آپ جس جگہ سے اسے استعمال کریں گے وہاں سے اس کا استعمال آپ کے لئے بے حد آسان ہوگا۔ طے یہ کیا گیا ہے کہ اس کے چھ فائر کئے جائیں اور چھ فائر میں آپ لازمی طور پر ہیبائی سے ہمکنار ہو جائیں گے۔ بس! آپ کو ذرا محنت اور ہوشیاری سے کام کرنا ہوگا۔“ اب میں بالکل نڈھال ہو گیا تھا۔ بات میری سمجھ میں آرہی تھی۔ زیر تعمیر عمارت، ایک

غیر ملکی سیاسی شخصیت، اعلیٰ قسم کی رائفل اور اس شخصیت کے بارے میں فلم رپورٹ..... گویا مجھے ایک اہم ترین سیاسی شخصیت کو قتل کرنا تھا ایک ماہر قاتل کی حیثیت سے۔ میرا پورا وجود ٹوٹا جا رہا تھا۔ کنپٹیاں چٹخ رہی تھیں۔ ہاتھ پاؤں ڈھیلے ہو رہے تھے۔ مسٹر بلیک نے میزا شانہ تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

”مجھے اُمید ہے کہ آپ اپنی سابقہ روایات کو برقرار رکھیں گے اور ہمیں کامیابی سے روشناس کرائیں گے۔“

میں نے بڑے اعتماد سے یقیناً..... یقیناً کہنا چاہا۔ لیکن میرے حلق سے بطخ کی سی آوازیں نکل کر رہ گئیں۔ اب تو آواز بھی ساتھ نہیں دے پا رہی تھی۔

☆.....☆.....☆

میری بطخ جیسی آواز سن کر مسٹر بلیک نے مطمئن انداز میں گردن ہلائی اور غالباً یہ فیصلہ لیا کہ میں اپنی سابقہ روایات برقرار رکھنے کا عہد کر رہا ہوں۔ ویسے وہ افریقی نژاد تھے اور افریقہ کے باشندے ہر چیز آسانی سے مان لیا کرتے ہیں۔ کیونکہ کسی بھی جنبش کا اُن کے لئے جواز نکل آتا ہے۔ لیکن میرے دل کا خدا ہی حافظ تھا۔ بہت سے جرائم کا اگر ماسٹر نہیں رہا تھا تو انہیں سمجھ ضرور گیا تھا۔ مگر وقت گواہ ہے کہ ان ساری کارروائیوں میں میرا کوئی تصور نہیں تھا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ خالہ شہادت کی کھولی سے ساحل سمندر جانا میرے لئے مذاب بن جائے گا۔ آغاز تو وہیں سے ہوا تھا۔ اور اس کے بعد مجھے بین الاقوامی بکرا سمجھ لیا گیا۔ جس کے ہاتھ میں بھی چھری ہوتی، وہ میری گردن کی طرف للچائی ہوئی نگاہوں سے اٹھتا، اٹھاتا، پٹختا اور میری گردن پر چھری پھیر دیتا۔

میں بہت دیر تک اپنے اس نئے منصب کے بارے میں اور شاید مسٹر بلیک میرے پروگرام کی کامیابی کے بارے میں سوچتے رہے۔ پھر دفعۃً ہی وہ مسکرائے اور تاریکی میں ہوب نکل آئی۔ انہوں نے پر جوش انداز میں تالیاں بجاتے ہوئے کہا۔ ”مجھے یقین ہے سُر کیلاشی! کہ آپ کامیاب ہوں گے۔ اس نقشے میں کوئی کمی رہ گئی ہو تو براہ کرم! بتا دیجئے۔“

”آپ کو میرے نقشے میں کوئی کمی نظر آ رہی ہو تو مجھے بھی بتا دیجئے۔“

”اوہ..... کیا آپ نے بھی اپنے ذہن میں کوئی نقشہ ترتیب دیا ہے؟“

”جی ہاں! لیکن وہ بے حد خفیہ ہے۔ کسی مناسب وقت پر آپ کے سامنے پیش کروں گا۔“

مسٹر بلیک میری بات نہیں سمجھ پائے تھے۔ بہر طور! انہوں نے ایک بٹن دبا کر ربیکا کو صبر کرایا اور پھر شراب کے برتن بج گئے..... میرے لئے جام صحت تجویز کیا گیا اور

کامیابی کی خوشی میں دونوں پینے لگے۔ جام میں نے بھی لیا تھا لیکن اُس وقت شراب کی بجائے زہر پینے کو جی چاہ رہا تھا۔ بھلا میں اور ایک پیشہ ور قاتل؟ اور پھر وہ بھی ایک ایسی شخصیت کا جسے قتل کرنا آسان کام نہیں تھا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اب تک کی زندگی میں غیر اختیاری طور پر بہت کچھ ہو چکا تھا پھر اپنی جان بچانے کے لئے کسی کو کچھ نقصان پہنچا دیا تھا۔ لیکن اس کا کیا سوال تھا کہ ایک پیشہ ور مجرم کی حیثیت سے کسی کو قتل کر دوں۔ لیکن مجبوریاں اور پھر وہ مادام جنہوں نے مجھے اپنی غلامی میں لینے کا عہد کر رکھا تھا، میں جانتا تھا کہ چوہے بلی کا جو کھیل میرے ساتھ کھلایا جا رہا ہے، وہ انہی پرنس کی ہدایات پر ہے۔ میرے ہاتھوں ایک ایسی شخصیت کو قتل کروایا جا رہا تھا جو اگر واقعی قتل ہو جائے اور اُس کی موت کا الزام مجھ پر آ جائے تو شاید میں قیامت تک اپنی گلو خلاصی نہ کرا سکوں گا۔ لیکن اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مجھے کرنا کیا چاہئے؟ حالات بتا رہے تھے کہ اگر ان لوگوں کی ہدایات پر عمل نہ کیا تو اسی طرح کسی چوک پر کھڑا کر کے مجھے گولی مار دی جائے گی۔ ظاہر ہے پولیس ابھی تک میرے چکر میں ہوگی اور یہی لوگ اس وقت میری زندگی کے ضامن بن سکتے ہیں لیکن شرط یہ ہے کہ میں اُن کی ہدایت پر عمل کرنے ضمانت دوں۔

شراب کے دور چلتے رہے۔ ربیکا آؤٹ ہو گئی تھی..... مسٹر بلیک اُٹھ کر چلے گئے اور ربیکا مجھے اپنی بچپن کی محبت کا یقین دلانے لگی۔ حالانکہ بچپن میں، میں اگر اُسے دیکھ لیتا تو کمبخت کو جو ان ہی نہ ہونے دیتا۔ کہیں گلا گھونٹ کر سلا دیتا تاکہ اس وقت اس مصیبت میں گرفتار تو نہ ہونا پڑتا۔

تمام پروگرام پایہ تکمیل کو پہنچ گیا تھا۔ اور اب میرے لئے سوچنے سمجھنے کی کوئی گنجائش نہیں رہی تھی۔ رات گزری اور پھر وقت آ گیا جب قتل کے ماہر کیلاشی کو ایئر پورٹ ایریا میں داخل ہونا تھا۔ تمام نقشے میرے پاس محفوظ کر دیئے گئے تھے اور مجھے بتایا گیا تھا کہ میرے تحفظ کا مکمل بندوبست کر لیا گیا ہے۔ اگر کوئی خطرہ درپیش ہوا تو مجھے اس سے محفوظ رکھنے کی کوشش کی جائے گی۔

ایک بند گاڑی مجھے اور میری رائفل کو لے کر چل پڑی..... دو افراد ساتھ تھے۔ تیرا ڈرائیور تھا۔ دونوں خاموشی سے میرے ساتھ اُس جگہ تک آئے جہاں سے مجھے اُن دونوں کو

ہذا حافظ کہہ دینا تھا۔ یہ ایک ویران سی جگہ تھی اور یہاں سے ایئر پورٹ کا فاصلہ زیادہ نہیں تھا۔ سامنے ہی بے شمار فلیٹ بنے نظر آ رہے تھے جو ایئر پورٹ کے احاطے سے کافی دُور تھے لیکن پھر بھی قریب محسوس ہوتے تھے۔

مجھے ان فلیٹوں سے بھی دُور اُتار دیا گیا اور پھر ایک طرف جھاڑیوں کی طرف اشارہ کیا۔ یہاں جھاڑیوں کے جھنڈ ضرور تھے لیکن جس جگہ یہ گٹر لائن شروع ہوتی تھی، وہاں جھاڑیاں نہیں تھیں۔ چنانچہ مصنوعی جھاڑیاں لگا کر یہاں میری نقل و حرکت کو پوشیدہ کر دیا گیا تھا اور یہ جھاڑیاں صرف اُسی وقت تک کے لئے تھیں جب تک میں اپنا کام مکمل طریقے سے انجام دے کر وہاں سے فرار نہ ہو جاؤں۔ گٹر کا ڈھکن اُٹھایا گیا اور میں نے گھبرا کر پوچھا۔

”بھائی! اس قسم کے پرانے گٹروں میں کیسیں ہوا کرتی ہیں جن سے لوگ ہلاک ہو جایا کرتے ہیں۔ کیا ان میں میری ہلاکت کا معقول بندوبست موجود ہے؟“

”نہیں جناب! گٹر خاص طریقے سے گیس سے خالی کر لئے گئے ہیں۔ آپ اندر اتریں گے تو آپ کو ایک خوشبو کی سی کیفیت ملے گی۔ انہیں آپ کے کام کے لئے خوشبو سے معطر کیا گیا ہے۔“

”واہ..... سبحان اللہ! ایسی غلیظ جگہ..... بہر طور!“ میں نے کہا اور پھر خدا کا نام لے کر گٹر میں اتر گیا۔

پہلے تو یہی سوچا تھا کہ اب مصیبت آہنی گئی ہے تو دلجمعی سے کام کیا جائے۔ لیکن گٹر میں اترنے کے بعد تمام قوتیں ساتھ چھوڑتی محسوس ہو رہی تھیں۔ گٹر کا ڈھکن اُوپر سے بند کر دیا گیا..... میں نے تجربے کے طور پر اُسے اُٹھا کر دیکھا تو وہ با آسانی اُٹھ گیا۔ ڈھکن رکھ کر ہانے والے ایک دم پلٹ آئے تھے۔

”جناب عالی! کوئی ہدایت؟“

”جاؤ میاں! اپنا کام کرو۔ اپنا تجربہ کر رہا تھا میں۔“ میں نے کہا اور دوبارہ ڈھکن بند کر دیا۔ پھر میں نے بدن پر لگی ہوئی جیبی ٹارچ روشن کر لی۔ بہت سی کارآمد چیزیں میرے ہارڈ کر دی گئی تھیں جو میرے لئے معاون ثابت ہو سکتی تھیں۔ اُس جیبی ٹارچ سے میں نے گٹر کا نقشہ دیکھا اور پھر اُس سرخ نشان کی طرف چل پڑا جو نقشوں میں میری نشاندہی کے

لئے بنایا گیا تھا۔

گٹر لائن میں واقعی کافی صفائی کر دی گئی تھی۔ اور یہ کام انہی لوگوں نے کیا تھا۔ میرے آگے بڑھتا رہا۔ نقشے ہی سے مدد لے رہا تھا ورنہ اس تنگ و تاریک سرنگ نما جگہ، بھلا کیا کیا جاسکتا تھا؟ ذرا دیر بعد زوردار آوازیں سنائی دینے لگیں۔ میں نے اندازہ لگا لیا کہ کوئی جہاز عین میرے سر کے اوپر سے گزرا ہے۔ اس کا مطلب تھا کہ اب میں ایئر پورٹ آ پہنچا ہوں..... نقشے کے مطابق میں نے بائیں سمت کی وہ سرنگ دیکھی جس طرف مجھے بڑھنا تھا۔ یہاں تھوڑا سا پانی موجود تھا۔ تعفن بھی اُٹھ رہا تھا۔ لیکن میں اُس جگہ پہنچ گیا جہاں مجھے زمین پر اُبھرنا تھا اور اُس کے بعد اس معقول جگہ پہنچنا تھا جہاں سے نہ صرف ایئر پورٹ کے رن وے پر ہونے والی کارروائی کا پتہ چل سکتا تھا بلکہ اور بھی کئی جگہوں پر نظر رکھی جاسکتی تھی۔ خطرہ سیوریٹی فورس کا تھا جو ایئر پورٹ پر آنے والے معزز مہمان کی نگہداشت کے لئے پوری طرح مستعد اور چوکس تھی۔

میں نے گٹر کا ڈھکن اُٹھا کر گردن باہر نکالی۔ میرے اطراف امکانات کے مطابق بالکل سنسان تھے۔ میں آہستہ سے گٹر سے باہر نکل آیا۔ سامان کا تھیلہ میرے پاس موجود تھا۔ میں نے وہ بلندیاں عبور کیں جنہیں طے کر کے مجھے اپنی منزل پر پہنچنا تھا۔ اور پھر ایک جگہ فٹ ہو گیا۔ لباس اور انداز ایسا تھا کہ ذرا بھی جنبش نہ ہو اور اگر کہیں قریب سے دیکھ بھی لیا جاؤں تو کوئی یہ نہ سوچ سکے کہ مٹی کے تودے میں اور بھی کوئی چیز پوشیدہ ہے۔

سامنے ایک چھوٹا سا کیمپ نظر آ رہا تھا جو کسی قدر بلندی پر بنایا گیا تھا۔ جانے اس کا کیا مقصد تھا؟ لیکن تھوڑی ہی دیر کے بعد معلوم ہو گیا کہ وہاں سیوریٹی کے افراد موجود تھے اور مجھے اُس وقت پتہ چلا جب دو مسلح آدمی اُس کیمپ سے اتر کر اطراف کا گشت کرنے کے لئے نکلے تھے۔ میں سہمی نگاہوں سے سانس روکے ہوئے انہیں دیکھتا رہا۔ وہ لوگ ایک مخصوص ایریے میں گشت کرتے ہوئے دُور تک نکل گئے تھے۔

میں نے رائفل کے ٹکڑے جوڑے اور اُس پر دُور بین فٹ کر لی۔ دوسری دُور بین اپنی آنکھوں پر لگا کر میں آس پاس کا جائزہ لینے لگا۔ رن وے پر مہمانوں کے استقبال کی زبردست تیاریاں تھیں۔ مسلح دستے گارڈ آف آنر پیش کرنے کے لئے تیار تھے۔ پروٹوکول الگ مستعد تھا۔ میرے بدن میں سنسنی دوڑ رہی تھی اور میں اب یہ طے کر رہا تھا کہ اپنی

مخصوص جگہ پہنچ جاؤں۔ جہاں سے مجھے رن وے کا نشانہ لینا تھا۔ میں کھسکتا ہوا اُس جگہ بڑھا۔ سیوریٹی سٹاف کے دونوں آدمی واپس آ رہے تھے اور اُن کی واپسی سے پہلے ہی میں اپنے آپ کو پوشیدہ کر لینا چاہتا تھا۔ چنانچہ میں اُس آخری حصے میں پہنچ گیا جہاں سے مجھے رن وے صاف نظر آ رہا تھا اور اسی جگہ سے مجھے اپنی کارروائی کرنی تھی۔

ابھی زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ مجھے اپنی گردن پر کوئی چیز رینگتی ہوئی محسوس ہوئی۔ اُسے بڑا تو سیاہ رنگ کا ایک چیونٹا تھا۔ میں نے اُسے مسل کر پھینک دیا۔ لیکن چند ہی لمحات کے بعد پھر ایسی ہی سرسراہٹ محسوس ہوئی۔ یہاں نیم تاریکی تھی۔ لیکن اس کے باوجود میں چیونٹوں کو دیکھ سکتا تھا۔ بڑی نسل کے چیونٹے تھے۔ میں نے اپنے بدن کے کھلے ہوئے حصوں کو ڈھک لیا تا کہ چیونٹے مجھے نقصان نہ پہنچا سکیں۔ اور پھر ایک ٹھنڈی سانس لے کر دیوار سے پشت ٹکا دی۔ دُور بین بار بار آنکھوں سے لگتی اور فضا کا جائزہ لینے لگتی۔ کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی میں وقت بھی دیکھتا جا رہا تھا۔ سوئیاں بہت سست روی سے کھٹک رہی تھیں۔

پھر میں نے ایئر پورٹ ایریا میں کچھ ہلچل سی دیکھی۔ اور اس کے ساتھ ہی میری نگاہیں آسمان کی جانب اُٹھ گئیں۔ ایک طیارہ فضا میں گردش کر رہا تھا۔ لینڈنگ کے انتظامات کئے جا رہے تھے۔ اور پھر تھوڑی دیر کے بعد طیارے نے رن وے کو چھو لیا اور دوڑتا ہوا ایک جگہ آکھڑا ہوا۔ میری نگاہیں اب رائفل کی دُور بین سے طیارے پر تھیں۔ سیڑھی لگ گئی۔ معزز مہمان نیچے اترنے لگے اور ان کے درمیان وہ شخص نظر آیا جس کے لئے مجھے یہاں بھیجا گیا تھا۔ ایک لمحے کے لئے میرا دل دھڑک اُٹھا۔ اُس بے چارے سے میری کوئی دشمنی نہیں تھی۔ مگر جس مقصد کے لئے مجھے بھیجا گیا تھا وہ کرنا تھا۔ چنانچہ میں دُور بین سے اُس شخص کو دیکھتا رہا۔ معزز شخصیتیں اُس سے ہاتھ ملا رہی تھیں۔ میری رائفل اُس شخص کے ہاتھ ساتھ گردش کرتی رہی۔ مجھے ایک مخصوص فاصلے تک اپنا کام کرنا تھا۔ کیونکہ اس کے بعد نشانہ لینا ممکن نہ ہوتا۔

پھر میرا دل دھک دھک کرنے لگا..... وہ میری رنج میں آتا جا رہا تھا۔ اس وقت پوزیشن ایسی تھی کہ میں فائر کر سکتا تھا۔ میں نے دانت کچکچائے، اُس کا نشانہ لیا اور ٹرائیگر پر انگلی رکھ دی..... لیکن اچانک ہی مجھے اپنی پشت پر سرسراہٹ محسوس ہوئی۔ میں نے سوچا کہ

میں خاموش تماشائی کی حیثیت سے اُن کی کارروائی کو دیکھ رہا تھا لیکن مسٹر بلیک کی بات میرے ذہن میں کچھ کے لگا رہی تھی۔ پھر غالباً کروٹ بدلنے کی کوشش کی تھی کہ عقبی حصے میں ٹیس اٹھی اور ٹیس نے سارا معمہ حل کر دیا۔ میں بھی عجیب بیوقوف آدمی تھا۔ ذرا سی بات نہ سوچ سکا۔ جب میں رائفل سے فائر کر رہا تھا، اسی وقت میرے بدن پر سرسراہٹ پڑی تھی۔ اور کسی شے نے اس زور سے کاٹا تھا کہ میں بلبلا اٹھا تھا۔ رائفل کی نال یقیناً اُنہی ہو گئی تھی۔ مسٹر بلیک غالباً مووی کیمرے سے تمام کارروائی کی فلم بنا رہا تھا۔ رائفل نے اُسی کی پیشانی کا نشانہ لے لیا۔ ارے باپ رے باپ..... میرے بدن نے پسینہ چھوڑ دیا۔ گویا اُس شخص کی بجائے حیرت انگیز، بلکہ ڈرامائی طور پر مسٹر بلیک میری گولی کا نشانہ بن گیا تھا۔ یہ اچھا ہوا یا برا؟ یہ میں نہیں جانتا تھا۔ بہر طور! اب اگر سکیورٹی فورس والوں نے پکڑ لیا ہے تو ظاہر ہے میری جان بخشی آسان نہ ہوگی۔ البتہ اگر کوئی ترکیب لڑائی جائے تو لیکن تھا کچھ کام بن جائے۔

ذہن کی تیز رفتاری کا یہ عالم تھا کہ جیسے سوکھو میٹر کی رفتار سے چل رہا ہو۔ اور پھر میرے ذہن نے ایک عجیب منصوبہ تیار کر لیا۔ منصوبے تیار کرنے میں حرج ہی کیا ہے؟ کامیابی ضروری تو نہیں ہوتی۔ اور پھر مجھ جیسے شخص کے لئے جس کا برسوں سے اس دنیا میں یارو مددگار کوئی نہیں تھا۔ میں نے پر خیال انداز میں گردن ہلائی اور دل میں سوچا کہ اپنے کام کا آغاز کر دینا چاہئے۔

جس طرح مجھے باندھ دیا گیا تھا، اُس سے تکلیف بھی ہو رہی تھی۔ سکیورٹی کے بہت سے افسروہاں موجود تھے۔ میں نے اُن میں سے ایک کو اشارہ کیا اور وہ خونی نگاہوں سے مجھے دیکھتا ہوا میرے پاس آ گیا۔ ”بڑے بھائی! کم از کم ایک گلاس پانی تو پلوادو۔“ میں نے کہا۔ جواب میں اُس کی ٹھوکر میری پسلیوں میں پڑی۔ میں نے شدت کرب سے کراہتے ہوئے کہا۔ ”دیکھو! میرے ساتھ جو کچھ کر رہے ہو، اس پر تمہیں خون کے آنسو رونا پڑے گا، اس بات کو ذہن میں رکھنا۔ تم نے بلاشبہ مجھے ایک مجرم کی حیثیت سے گرفتار کیا ہے۔ لیکن جو کچھ میں نے کیا ہے، اُس کی تفصیل جب منظر عام پر آئے گی تو تم مجھے سیلوٹ کرنے پر مجبور ہو گے۔“

سکیورٹی آفیسر غرایا۔ ”زبان بند رکھو! ورنہ منہ پر پاؤں رکھ کر سارے دانت حلق میں

پسینہ ہے۔ لیکن پشت کی سرسراہٹ اب نیچے کی جانب محو سفر تھی۔ میں اس پر توجہ دیئے بغیر اپنا نشانہ درست کرتا رہا۔ اور پھر میں نے ٹرائیگر دبا دیا..... لیکن گولی شاید پلٹ کر میری کمر میں ہی آ لگی تھی یا پھر..... یا پھر کاٹنے والی چیز کے دانت ہی مضبوط تھے کہ مجھے شدید تکلیف کا احساس ہوا تھا۔ میں اُچھل پڑا۔ دھماکہ ہوا اور اس کے ساتھ ہی نجانے کیا ہوا.....؟ میں نے البتہ اپنی پشت پر ریگنے والی اُس شے کو پتلون کے اوپر ہی سے پکڑا اور مسل ڈالا۔ کمبخت نے کاٹنے میں اتنی قوت کا مظاہرہ کیا تھا، جتنی قوت میں نے رائفل کی لبلبی دبانے میں لگائی تھی۔

ایئر پورٹ پر بھگدڑ مچ گئی اور میں نے فوراً ہی دُور بین سینے سے اٹھا کر آنکھوں سے لگا لی۔ میں نے دیکھا کہ جس شخص کا میں نے نشانہ لیا تھا وہ صحیح سلامت ہے۔ اُسے گھیرے میں لے لیا گیا تھا۔ آس پاس کوئی زخمی بھی نہیں ہوا تھا۔ پھر میری نگاہیں کچھ اور آگے اٹھ گئیں۔ بہت فاصلے پر ایک عمارت کی بلندی سے ایک شخص دونوں ہاتھ فضا میں بلند کئے نیچے جھک رہا تھا۔ میں نے اُسے فوکس میں لیا اور پھر میرے ہوش و حواس رخصت ہو گئے..... اگر میرا اندازہ غلط نہیں تھا تو وہ مسٹر بلیک تھا جو چھت کی بلندی سے نیچے آ رہا تھا۔ دُور بین کے طاقتور لینز اُس کی کھوپڑی کے سوراخ کو بھی نمایاں کر رہے تھے۔

میں ایسی گہری سوچ میں ڈوب گیا کہ اپنے اطراف سے بھی بے خبر ہو گیا۔ مجھے اندازہ نہ ہو سکا کہ سکیورٹی کے لوگ کس طرح پوزیشن لئے ہوئے آگے بڑھ رہے ہیں۔ جس وقت ہوش آیا تب تک پستول کی چار پانچ نالیں میرے بدن کے مختلف حصوں میں گدگدی شروع کر چکی تھیں اور میں انہیں بھی چپوٹے سمجھ کر جھاڑ رہا تھا۔ لیکن جب کسی نے میرا گریبان پکڑ کر مجھے پوری قوت سے باہر کھینچا تو میں حیران رہ گیا۔ رائفل میرے ہاتھ سے چھوٹ گئی اور میں متحیرانہ انداز میں اُن لوگوں کی شکلیں دیکھنے لگا۔ وہ سب مجھ پر ٹوٹ پڑے۔ مجھے فوراً ہی احساس ہو گیا کہ اگر میں نے مزاحمت کی ذرا بھی کوشش کی تو وہ یہیں پر مجھے پھینچ کر مار ڈالیں گے۔ بہتر یہی تھا کہ مکمل خاموشی اختیار کی جائے۔ سو میں نے یہی کیا۔ وہ لوگ مجھے گھسیٹتے ہوئے اُس کیبن کی جانب لے چلے۔ وہاں انہوں نے نائیلون کی مضبوط رسی سے میرے ہاتھ پاؤں کس دیئے اور اچھی خاصی ہنگامی کارروائی ہونے لگی۔ غالباً میرے بارے میں اطلاع دی جا رہی تھی۔

اتار دیئے جائیں گے۔“

مجھے یہ تصور بالکل پسند نہیں آیا۔ اگر وہ ایسا کر ڈالتے تو اس کے بعد جینا بے مزہ ہو جاتا۔ میں فوراً خاموش ہو گیا۔

باہر جانے کیا کیا کارروائیاں ہو رہی تھیں۔ سکیورٹی کے لوگ ٹیلی فون پر پیغامات وصول کر رہے تھے۔ وائزلیس پر گفتگو ہو رہی تھی۔ لیکن فاصلہ اتنا تھا کہ میں اُن کی آوازیں نہیں سن سکتا تھا۔ پھر کافی دیر کے بعد کچھ فوجی اندر داخل ہوئے۔ اُن میں سے دو سپاہیوں نے مجھے بازوؤں سے پکڑ کر لٹکا لیا اور کیمبن کے نزدیک ترپال سے ڈھکی گاڑی میں ٹھونس دیا۔ کئی فوجی میرے آس پاس بیٹھ گئے۔ گاڑی شارٹ ہوئی اور چل پڑی۔

میں خاموشی سے بلکہ کان دبا کر پڑا رہا۔ یہاں تک کہ گاڑی کا سفر ختم ہو گیا۔ جہاں مجھے اتارا گیا، وہ اندازے سے کوئی فوجی چھاؤنی معلوم ہوتی تھی۔ ایک طرف وسیع و عریض، سرخ پتھروں کی عمارت بھی تھی۔ مجھے پیدل وہاں تک لے جایا گیا۔ پیچھے چند فوجی انتہائی مہلک ہتھیار لئے چل رہے تھے۔ پھر مجھے ایک کمرے میں لے جا کر بند کر دیا گیا جس کے دروازے پر موٹی موٹی سلاخیں لگی ہوئی تھیں۔ میں کچھ دیر وہاں کھڑا رہا اور پھر کھردرے فرش پر لیٹ کر سکون کی گہری گہری سانسیں لینے لگا۔

صبر و سکون سے میں نے کافی وقت گزار دیا۔ غالباً اندازے سے کوئی اٹھارہ گھنٹے ہو چکے ہوں گے کہ میری طرف توجہ دی گئی۔ ان اٹھارہ گھنٹوں میں مجھے کھانا اور چائے البتہ ضرور پیش کی گئی تھی۔ بالآخر چار افراد میرے پاس آئے۔ چاروں فوجی تھے۔ انہوں نے میرے ہاتھوں میں لوہے کی ہتھکڑیاں ڈال کر انہیں پشت پر باندھ دیا اور پھر اُن میں سے ایک نے کرخت لہجے میں کہا۔ ”تمہیں اپنی زندگی بچانے کے لئے احتیاط کرنا ہوگی۔ تمہاری ذرا سی غلط جنبش تمہیں موت سے ہمکنار کر سکتی ہے۔“

”میں جانتا ہوں۔ تم لوگ اطمینان رکھو! میں تم سے مکمل تعاون کروں گا۔“ میں نے جواب دیا اور انہوں نے مجھے آگے بڑھنے کا اشارہ کیا۔

حقیقت یہی ہے کہ میں ان سے مکمل تعاون کر رہا تھا۔ کیونکہ اسی پر میرے منصوبے کا دار و مدار تھا۔ سفر کا اختتام ایک کمرے میں ہوا۔ تین افراد باہر ہی رہ گئے تھے۔ صرف ایک آدمی اندر داخل ہوا تھا۔ کمرے میں قدم رکھ کر اُس نے ایڑیاں بجائیں اور پھر گردن خم کر

پس پلٹ گیا۔ جاتے ہوئے اُس نے دروازہ دوبارہ بند کر دیا تھا۔ اب جو میں نے کمرے کے ماحول پر نگاہ دوڑائی تو ایک لمحے کے لئے مجھ پر اچھا خاصا رعب سا طاری ہو

وسیع و عریض کمرہ تھا۔ جس میں نیم دائرہ نما بہت بڑی میز لگی ہوئی تھی، جس کے عقبی سرے میں چار آدمی بیٹھے ہوئے تھے۔ تمام اعلیٰ فوجی افسر تھے۔ دائرے کے دوسرے حصے میں بن ایک کرسی تھی۔ مجھے آگے آنے کا اشارہ کیا گیا۔ ایک آدمی نے اُٹھ کر جیب سے پینکالی اور میری ہتھکڑیاں کھول دیں۔ اس کے بعد اُس نے مجھے نہایت احترام سے کرسی بیٹھنے کے لئے کہا۔ میں نے اس سلسلے میں تکلف نہیں کیا۔

نورانی دو سمتوں سے تیز روشنیاں جلیں اور انہوں نے مجھے اپنے دائرے میں لے لیا۔ یہی تیز روشنیاں تھیں۔ میں جانتا تھا کہ ایسی روشنیاں پوچھ گچھ کرنے کے لئے استعمال کی جاتی ہیں۔ حالانکہ ان کا مقصد میری سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ شاید چہرے کے تاثرات کا صحیح فائدہ لینے کے لئے ان روشنیوں کی موجودگی ضروری سمجھی جاتی تھی۔

وہ چند لمحے خاموش رہے۔ پھر روشنیاں بجھ گئیں اور مدھم لائٹیں میرے گرد احاطہ کرنے لگیں۔ میں نے سکون کی گہری سانس لی۔ ان روشنیوں کی وجہ سے طبیعت میں کچھ بے چینی پیدا ہو گئی تھی۔ تب درمیان میں بیٹھے ہوئے شخص نے کہا۔ ”مسٹر! تمہیں ایئر پورٹ کے قریب علاقے سے گرفتار کیا گیا ہے۔ تمہارے قبضے سے جی۔ ایم سترہ ٹیلی سکوپک رائفل اُمد ہوئی ہے جس سے اُس وقت فار کیا گیا جب ہمارے ایک معزز مہمان نے ایئر پورٹ قریب رکھا۔ ہر چند کہ اُس معزز مہمان کو نشانہ نہیں بنایا گیا تھا اور ایک دوسرا شخص نشانہ بنا۔ اس کے باوجود یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ تمہارا نشانہ خطا ہو گیا اور ہمارے معزز مہمان کو نشانہ بنائے وہ شخص لقمہ اجل بن گیا۔ گویا تم نے ایک ایسے بھیانک جرم کا ارتکاب کرنا چاہا جو پایہ تکمیل تک پہنچ جاتا تو ہمارے لئے بدنامیوں کے سوا اور کچھ نہ رہ جاتا۔ اب تمہیں یہ جواب دینا ہے کہ کس کے ایماء پر اور کن ذرائع سے تم وہاں تک پہنچے؟ اور ہمارے مہمان کو قتل کرنے کے پس پردہ کیا جذبے تھے؟ تمہارے ساتھ کتنے افراد شریک ہیں؟ اس وقت وہ کہاں تھے جب ایئر پورٹ پر تم نے اپنی کارروائی کی؟ جواب نہ ملے تو تم کو یہ حالت مجبوری ہمیں وہی طریقہ اختیار کرنا پڑے گا جو بہر طور گھٹیا اور فرسودہ

ہے۔ لیکن بد قسمتی سے کارگر ہو جاتا ہے۔“

میں ان الفاظ کا مفہوم سمجھ رہا تھا۔ چند لمحے خاموش رہنے کے بعد میں نے کہا۔ ”معزز آفیسرز! میں جو کچھ بھی آپ کو بتاؤں گا، ممکن ہے وہ آپ کے لئے ناقابل یقین ہو۔ لیکن اگر آپ کو میرے جوابات جھوٹے محسوس ہوں تو آپ مجھ سے یہ نہ کہیں کہ اس کے بعد میں سچ بولوں۔ بلکہ بہتر یہی ہے کہ میرے لئے وہ طریقہ کار منتخب کر لیں جو آپ کے ذہن میں موجود ہو۔ یعنی آپ کے ہر سوال کا جواب میرے پاس آخری ہوگا۔ اذیتیں دیں گے، تب بھی وہی جواب ملے گا۔ یقین کر لیں گے تو وہی حقیقت ہوگی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ میں رائفل کے ساتھ خفیہ طور پر گٹر لائن کے ذریعے ایئر پورٹ تک پہنچا۔ لیکن آپ کا یہ سوچنا کہ وہ فائر اتفاقیہ طور پر نشانہ خطا ہو جانے کی وجہ سے کسی اور شخص پر کارآمد ہوا تھا، بالکل غلط ہے۔ یہ ایک لمبی داستان ہے اور اس کا آخری سرا یہی سمجھ لیجئے کہ جو شخص میرے فائر کی زد میں آیا وہی میرا نشانہ تھا۔“

”لیکن ایئر پورٹ ایریے میں داخل ہونے کے بعد اُس شخص کو نشانہ بنانے کا کیا جواز ہے؟“ اُس نے مجھ سے سوال کیا۔

”نشانہ وہ شخص نہیں تھا۔ نشانہ آپ کا معزز مہمان ہی تھا۔ لیکن یہ صرف میں ہوں جس نے اُس معزز مہمان کو قتل نہ کرنے کا فیصلہ کر کے اُس شخص کو قتل کر دیا، جس نے مجھے اس قتل کے لئے آمادہ کیا تھا۔“

میں نے اُن چاروں کو چونکتے ہوئے دیکھا۔ اُن کی تیز نگاہیں میرے چہرے کا طواف کر رہی تھیں۔ پھر اُسی شخص نے کہا۔ ”اب یہ ضروری ہو گیا ہے کہ پہلے تم سے تمہارا نام پوچھا جائے۔“

”مجھے جس نام سے اس کام کے لئے آمادہ کیا گیا ہے، وہ کیلاشی ہے۔ لیکن اصل نام منصور ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ میں صرف ایک سیاح ہوں۔ جب میں یہاں پہنچا تو کچھ لوگوں کے ہتھے چڑھ گیا۔ وہ چاہتے تھے کہ میں ایئر پورٹ کے علاقے میں داخل ہو کر آپ کے اُس معزز مہمان کو قتل کر دوں۔ ورنہ مجھے بملا نامی لڑکی اور بعض دوسرے افراد کے قتل کے الزام میں پولیس کے حوالے کر دیا جائے گا۔ میں جانتا تھا کہ وہ لوگ ایسا کر سکتے ہیں اور چونکہ پولیس اُن لوگوں سے تعاون کر رہی ہے اس لئے میری آواز بے اثر ہو جائے گی۔“

بچے میں نے آمادگی کا اظہار کر دیا۔ یہاں تک پہنچنے کے راستے انہوں نے دریافت کئے۔ رائفل انہوں نے ہی دی تھی اور گٹر لائن کے ذریعے وہاں پہنچنے کے نقشے بھی انہوں نے فراہم کئے تھے۔ لیکن میں اپنے ذہن میں کچھ اور ہی منصوبہ بنا چکا تھا۔ مجھے اُس شخص کے بارے میں معلوم تھا جو ایئر پورٹ کے سامنے اُس عمارت پر اس تمام حادثے کی فلم بنانے والا تھا اور شاید آپ کو یقین نہ آئے کہ مسٹر بلیک ہی کَم از کم اس پروگرام کا سربراہ ہے۔“

”مسٹر بلیک.....؟“ اُن میں سے ایک نے آہستہ سے کہا۔

”ہاں! جو شخص میری رائفل کا نشانہ بنا ہے، اُسے آپ مسٹر بلیک ہی کے نام سے پکارتے ہیں۔ وہ اسی نام سے مشہور تھا۔“

”اوہ..... اور یہ تمام باتیں تم سچ کہہ رہے ہو؟“

”میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ جھوٹ نہیں بولوں گا۔“ میں نے سرد لہجے میں جواب دیا۔ میرے لہجے کی پختگی پر وہ سوچ میں ڈوب گئے۔ پھر وہ آہستہ آہستہ سرگوشیوں کے انداز میں آپس میں گفتگو کرنے لگے۔ بالآخر وہی شخص مجھ سے مخاطب ہوا جو پہلے ہی سے باتیں کر رہا تھا۔ ”آپ کا تعلق کہاں سے ہے مسٹر منصور؟“

”میں برطانوی شہری ہوں۔ سیاحت کے لئے نکلا تھا لیکن سازشوں کا شکار ہو گیا۔ میرا رپورٹ اور دیگر کاغذات بھی غائب کر دیئے گئے۔ میری پوزیشن حد درجے مشکوک بنا دی گئی اور مجھے کیلاشی کا نام دیا گیا۔“

”ٹھیک ہے مسٹر منصور! جب تک آپ کے ان الفاظ کی تصدیق نہ ہو جائے آپ کی حیثیت ہمارے یہاں قیدی کی سی رہے گی۔ لیکن ایک معزز قیدی کی حیثیت جسے آپ باہر لے کر لیں گے۔“ ملٹری آفیسر کا لہجہ نرم تھا۔ میں نے دل میں نعرہ لگایا کہ وہ مارا۔ اس کے بعد میں خاموش ہو گیا۔

مجھے واپس میری کوٹھڑی میں پہنچا دیا گیا۔ لیکن تھوڑی ہی دیر کے بعد اُن کے اس قول کی تصدیق ہو گئی۔ کیونکہ اُس کوٹھڑی میں ایک بہت ہی نفیس بستر اور ضروریات زندگی کی ہر چیزوں کا فوری اضافہ کر دیا گیا۔ میں نے خدا کا شکر ادا کرتے ہوئے کہا کہ تھوڑی سی اذیت سے میں نے حالات پر قابو پانے کی کوشش تو کی ہے۔ لیکن بہر طور! ابھی اسے

آخری قدم قرار نہیں دیا جاسکتا تھا۔ کھانا آیا تو میں اُس پر ٹوٹ پڑا۔ پیٹ میں کھانا پہنچا۔ طبیعت پر کبولت طاری ہو گئی اور میں اس آرام دہ نفیس بستر پر لیٹ گیا جو بہت دنوں کے بعد مجھے نصیب ہوا تھا۔ لیکن بستر پر لیٹنے کے بعد گزرے ہوئے واقعات ذہن کے پردے پر چسپاں ہو گئے۔ میں اُن واقعات کی گہرائیوں میں کھو گیا۔

وہ تو کمبخت ایک چیونٹے نے سارا کھیل بگاڑ دیا۔ ورنہ اگر حکومت کا معزز مہمان میرے ہاتھوں قتل ہو جاتا تو ظاہر ہے سکیورٹی کے لوگ مجھے اسی طرح گرفتار کر لیتے اور اس کے بعد..... میرے بدن کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ ظاہر ہے کسی حکومت کے معزز مہمان کے قاتل کو سزائے موت سے کم کیا سزا ملتی اور بجلی کی کرسی..... میرے بدن میں کرنٹ دوڑنے لگا اور میں بے اختیار اٹھ کر بیٹھ گیا۔ بال بال بچ گیا تھا میں..... اور مسٹر بلیک.....؟

میرے حلق سے بے اختیار قہقہہ نکل گیا۔ میرے فرشتوں کے بھی گمان میں نہیں تھا کہ مسٹر بلیک اس عمارت کی چھت پر کھڑے اس کارنامے کی فلم بنا رہے ہیں۔ وہ کمرے سمیت نیچے آگئے تھے اور بلیک سے ریڈ ہو گئے تھے۔ اُن کے ساتھ ہی ربیکا یاد آئی اور بہت سے لمحات..... ارے باپ رے! ایک بار پھر میرے بدن میں سرد لہریں دوڑنے لگیں۔ مسٹر بلیک کے قتل کے بعد تو وہ تمام لوگ میرے بدترین دشمن بن گئے ہوں گے۔ اب اگر میں اُن کے قبضے میں چلا جاؤں اور انہیں یہ بتانے کی کوشش کروں کہ معاملہ میرا نہیں بلکہ ایک بد بخت چیونٹے کا تھا تو وہ لوگ دانت پیسنے کے علاوہ اور کیا کریں گے..... پھر مجھے جماہیاں آنے لگیں اور میں بلیک، ریڈ اور ربیکا پر لعنت بھیج کر بستر پر دراز ہو گیا اور تھوڑی ہی دیر بعد انشا غفیل ہو چکا تھا۔

جانے کتنا وقت گزر گیا اور میں اپنے اُس قید خانے میں آنے والے وقت کا انتظار کرتا رہا۔ پھر وہ وقت آ ہی گیا جس کا مجھے انتظار تھا۔ ایک بار پھر قید خانے سے نکال کر مجھے اُن ہال میں پہنچا دیا گیا۔ وہی لوگ بیٹھے ہوئے تھے جنہیں میں پہلے ہی دیکھ چکا تھا۔ البتہ ایک کرسی کا اضافہ تھا جس پر بیٹھی ہوئی شخصیت کو میں ایک ہی نگاہ میں پہچان گیا۔ یہ وہی معزز مہمان تھے جو میرا نشانہ بننے والے تھے لیکن ایک چیونٹے نے اُن کی زندگی بچا لی تھی۔

”مسٹر منصور!“ ایک فوجی افسر نے کہا۔ لیکن وہ مہمان شخصیت مجھے دیکھ کر بے اختیار کھڑی ہو گئی۔ اُس کی آنکھوں میں حیرت کے شدید آثار تھے۔ وہ میرے نزدیک آگئے۔

میں نے میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔
”اوہ..... تم..... تم.....“

”ہیلو.....“ میں نے مسکراتی نگاہوں سے اُسے دیکھا۔

”آہ..... میرے دوست! آہ..... وان ڈارک! یہ تم ہو کیا؟ واقعی یہ تم ہو.....؟“ معزز مہمان کے لہجے سے بے اختیاری ٹپک رہی تھی۔ ”اوہ آفیسر! آپ نہیں جانتے۔ آپ نہیں جانتے۔ یقیناً یہ شخص میرے لئے جان کی بازی لگا سکتا ہے۔“
”مسٹر آرسن پاور! کیا آپ پورے وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ یہ آپ کے شناسا ہیں؟“
”فوجی آفیسر نے جواباً دریافت کیا۔

”آپ وثوق کی بات کرتے ہیں۔ یہ وہ واحد شخص ہے جو بچپن سے میرا دوست ہے۔“
”نہی کافی عرصہ پہلے..... اوہ! میں کچھ اور ہی سمجھ رہا تھا۔ میں سمجھ رہا تھا ڈیز وان! کہ تم اپنی ہر پر نکل گئے ہو۔ لیکن مجھے حیرت تھی.....“
”حیرت کی بات ہی ہے۔ ظاہر ہے تمہیں بتائے بغیر میں اپنی مہم پر کیسے نکل سکتا تھا ڈیز وان؟“

”ویری گڈ! تمہارا مل جانا..... مگر تم غائب کہاں ہو گئے تھے؟ اور میرا خیال ہے ہمیں کجگہ یہ باتیں نہیں کرنی چاہئیں۔“

فوجی افسر بے چارے اپنی کھوپڑیاں سہلا رہے تھے۔ اُن کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اب کیا کریں۔ یقیناً میرے بارے میں انہیں معلوم ہوا ہو گا کہ منصور نامی کوئی شخص برطانوی شہریت نہیں رکھتا اور نہ ہی برطانیہ سے آیا ہے۔

”مسٹر آرسن پاور نے فوجی افسر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”ڈیز آفیسر! آپ یہ سمجھ لیں کہ میں اس شخص کی ہر طرح سے ضمانت دینے کے لئے تیار ہوں۔ اور پھر یہ تو میرا محسن ہے۔ بقول آپ کے اس نے میری جان بچائی ہے۔ کیا آپ لوگ اس بات کا یقین کریں کہ میری جان بچانے کے لئے اگر اسے اپنی جان کی بازی بھی لگانا پڑتی تو یہ اس سے نشانہ کرتا۔ اُن لوگوں کی یہ بد قسمتی تھی کہ انہوں نے میرے قتل کے لئے اس شخص کا سہارا نہ دیا۔“
”یہ ایسے جس مسٹر بلیک کو قتل کیا گیا ہے، میں اُسے جانتا ہوں کہ وہ میرے قتل کے لئے نکل آمادہ ہوئے۔ خیر! میں اس سلسلے میں آپ کے اعلیٰ افسران سے بھی بات کر لوں گا۔“

فوجی افسروں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ پھر اُن میں سے ایک افسر اٹھ کر باہر نکل گیا اور آرسن پاور مجھ سے بات چیت کرنے لگے۔ ”ڈیئر ڈارک! تم اس دوران کہاں کہاں رہے؟“

”ظاہر ہے میرا یہ سفر اتنا مختصر نہیں تھا کہ میں چند الفاظ میں تمہیں اپنے بارے میں بتا دوں۔ لیکن میری کہانی اتنی دلروز ہے کہ سنو گے تو تمہاری آنکھوں سے آنسو نکل آئیں گے۔“

”تم بچپن ہی سے مصیبتوں کا شکار رہے ہو میرے دوست! لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ تمام مصیبتیں تمہاری اپنی مول لی ہوئی ہیں۔“

”ہرگز نہیں۔ میں کوئی چیز مول نہیں خریدتا۔ لیکن اب جو کچھ بھی ہو، اُسے تم میری تقدیر کی خرابی کہہ سکتے ہو۔“

”آؤ! یہاں سے چلیں.... آفیسر! کیا آپ انہیں میرے ساتھ جانے کی اجازت دیں گے؟“

”آپ مکمل طور پر ذمہ داریاں لے چکے ہیں۔ چنانچہ ہمیں کیا اعتراض ہو سکتا ہے؟“ فوجی آفیسر نے جواب دیا۔

تھوڑی دیر بعد وہ آفیسر بھی آگیا جو باہر چلا گیا تھا۔ اور اس کے بعد مسٹر آرسن پاور مجھ ساتھ لے کر باہر نکل آئے۔

باہر ایک اعلیٰ درجے کی کار کھڑی تھی جو بلیٹ پروف تھی اور بند تھی۔ ہم دونوں کو اس میں بٹھایا گیا اور فوجی نگرائی میں ہم سرکاری مہمان خانے میں پہنچ گئے جہاں آرسن پاور رہائش پذیر تھے۔ غالباً بہت ہی بے تکلفی کا رشتہ تھا میرے اور اُن کے درمیان۔ انہوں نے بہت محبت بھرے انداز میں کہا۔ ”تم نے مجھے چھوڑ دیا وان ڈارک! میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا میرے دوست!“

”کہانی بہت طویل ہے آرسن! بس.... تم یوں سمجھ لو کہ یہ سب کچھ میں نے خود نہیں کیا تھا۔ بلکہ کچھ پراسرار قوتوں نے مجھے اغواء کر لیا تھا۔“

”اغواء....؟“ اُن کی آنکھوں میں حیرت کے نقوش نظر آئے۔ ارے! کون لوگ تھے وہ؟“

”خدا ہی جانے.... میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ جانے کہاں کہاں بھٹکتا پھرا ہوں۔ کون کون سی مصیبتیں اُٹھائی ہیں میں نے اور اس کے بعد یہاں پہنچا تھا کہ یہاں وہ کینت پرنسز، مسٹر بلیک اور ربیکا مل گئے اور انہوں نے مجھے تمہارے قتل پر مامور کر دیا۔ جب میرے علم میں یہ بات آئی کہ تم ہو وہ شخصیت جسے مجھے قتل کرنا ہے تو میں نے دل میں سوچ لیا کہ چاہے کچھ بھی ہو جائے اُن لوگوں کو کیفر کردار تک پہنچانے میں کوئی کسر نہیں پھوڑوں گا۔ اور اس کے بعد میر نے کم از کم اُس شخص کو قتل کر ہی دیا جو اُس بلڈنگ کی چھت پر چڑھا تمہاری فلم بنا رہا تھا۔ غالباً وہ اس فلم کو اپنے مذموم مقاصد کے لئے استعمال کرنا چاہتا تھا۔ لیکن میں نے اُسے اُس کے کیمرے سمیت جہنم رسید کر دیا۔“

آرسن پاور اپنی جگہ سے اُٹھے اور انہوں نے مجھے گلے سے لگا لیا۔ ”اگر تمہاری جگہ کوئی اور قاتل ہوتا تو کیا وہ مجھے چھوڑ دیتا؟“

”سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اُن لوگوں نے جس طرح مجھ سے معاہدہ کیا تھا، اُس کے تحت لاکھوں ڈالر مجھے ملنے والے تھے۔ بھلا کسی اور شخص کو ان لاکھوں ڈالرز کی پیشکش کی جاتی تو وہ بھلا باز رہتا اس سے؟“

”اور تم نے یہ سب کچھ میرے لئے ٹھکرا دیا؟“

”کیسی باتیں کرتے ہو ڈیئر! تمہارے لئے تو میں یہ دنیا ٹھکرا سکتا ہوں، تم دولت کی بات کر رہے ہو۔ اور پھر میرا دوست میرے ہاتھوں قتل ہو۔ کیا دنیا میں کبھی ایسا ہوا ہے؟ جتنی دوستی تمہارے اور میرے درمیان ہے، اتنی دوستی کے بعد بھلا کوئی دوست دوسرے دوست کو قتل کر سکتا ہے؟“

آرسن پاور بہت زیادہ جذباتی آدمی تھے۔ جذباتی ہونے کے ساتھ ساتھ وہ طاقتور بھی تھے کیونکہ جب وہ مجھے اپنے سینے سے بھینچتے تھے تو میری ہڈیاں کڑکڑانے لگتی تھیں۔ میں نے فوراً دل میں فیصلہ کیا کہ آئندہ کوئی ایسی بات نہ کہوں گا جس سے وہ جذباتی ہو جائیں۔ اور اپنی ہڈیوں کی کڑکڑاہٹ کا خطرہ کون مول لیتا؟ ہو سکتا ہے ایک دو پسلیاں ٹوٹ ہی جائیں۔

اُن کے سوالات کے جوابات میں نے انتہائی ذہانت سے دیئے تھے۔ بہت سے ایسے نامیرے سامنے لئے گئے جن کا میں تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ لیکن میں نے اُن سے اس

طرح واقفیت کا اظہار کیا جیسے میں اُن کے پورے شجرۂ نسب سے واقف ہوں۔ مقصد یہ تھا کہ میں یہاں سے نکل جاؤں اور اپنی زندگی بچاؤں۔ بعد میں مسٹر پاور کو تمام صورت حال بتا دوں گا اور اُس کے بعد اُن سے مدد طلب کروں گا کہ وہ مجھے بھی زندگی گزارنے کے لئے صحیح موقع عنایت کریں۔ کیونکہ میں نے اُن کی زندگی بچائی ہے۔

اب مقامی حکام اور سکیورٹی اُن کے سلسلے میں کافی مستعد تھی۔ چنانچہ انہیں نہایت خفیہ طریقے سے یہاں سے روانہ کیا گیا۔ بعد میں مجھے پتہ چلا کہ جس طیارے سے آرسن پاور کی روانگی کا اعلان کیا گیا تھا، اُس کی پرواز ہی روک دی گئی اور ہم لوگ ایک دن پہلے ہی یہاں سے روانہ ہو گئے تھے، یہ صرف حفاظتی اقدام کے طور پر کیا گیا تھا۔ اُس طیارے تک کو فضا میں بھیجنے کا خطرہ مول نہیں لیا گیا تھا جس سے مسٹر آرسن پاور کی روانگی کا اعلان کیا گیا تھا۔

طیارے نے ہندوستان کی سرزمین چھوڑ دی اور میں کسی نامعلوم سمت پرواز کرنے لگا۔ میں اب تک اُن سے یہ پوچھنے کی جرات نہیں کر سکا تھا کہ خود اُن کا تعلق کون سے ملک سے ہے۔ لیکن فی الوقت یہ مرحلہ آیا بھی نہیں تھا۔

بالآخر یہ طویل سفر ختم ہوا اور طیارہ کسی سرزمین پر اتر گیا۔ مجھے ابھی تک نہیں معلوم تھا کہ یہ سرزمین کون سی ہے۔ لیکن آرسن پاور کو دیکھتے ہوئے یہی اندازہ کیا جاسکتا تھا کہ اُس کا تعلق کسی افریقی ریاست سے ہوگا۔ جس رن وے پر ہم لوگوں کو اتارا گیا، وہاں چاروں طرف سناٹا تھا۔ اطراف میں بھوری پہاڑیاں تھیں۔ شام کا جھپٹا فضا پر مسلط ہوتا جا رہا تھا۔ رن وے کے آخری سروں پر مسلح فوجی ہتھیار سنبھالے کھڑے ہوئے تھے۔ آرسن پاور کو خوش آمدید کہنے کے لئے کچھ لوگ آئے تھے۔ جو یقیناً اُن کے اہل خانہ معلوم ہوتے تھے۔ اُن میں بعض شکلیں بے حد پرکشش تھیں۔ مثلاً وہ نو جوان اور خوبصورت لڑکی جس کا تعلق تو سیاہ نسل ہی سے تھا لیکن رنگ گندمی اور نقوش اتنے حسین تھے کہ ایک نگاہ دیکھنے کے بعد دوسری نگاہ کی حسرت ہی رہ جائے۔ بلکہ نگاہیں اُس پر سے ہٹنے کا نام ہی نہ لیں۔

اُن سب نے آگے بڑھ کر مسٹر آرسن پاور کا استقبال کیا۔ وہ لڑکی تو اُن سے لپٹ ہی گئی جس کے حسن بے مثال نے مجھے بے اختیار کر دیا تھا۔ آرسن پاور کے ساتھ باقی لوگ بھی رن وے پر کھڑی گاڑیوں میں جا بیٹھے۔ میں آرسن پاور کے ساتھ کچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔

اگلی سیٹ پر وہ لڑکی تھی۔ باقی افراد دوسری گاڑی میں بیٹھے تھے۔ ہمیں کئی سانس راتوں سے گزار کر ایک عمارت میں لے جایا گیا۔ میں ظاہر ہے آرسن پاور کا مہمان تھا۔ چنانچہ میری بھی پذیرائی ہو رہی تھی۔ ابھی تک البتہ اُن لوگوں سے تعارف نہیں ہو سکا تھا۔

آرسن پاور بھی دوران سفر مجھ سے اس طرح لا تعلق ہو گئے تھے جیسے میرے وجود ہی کو نظر انداز کر بیٹھے ہوں۔ میں بھی بھلا اُنہیں کیا لگاس ڈالتا؟ میں اپنی دنیا کا بادشاہ تھا۔ بس! اس بادشاہ کو ذرا اپنے دشمنوں سے کچھ خطرہ لاحق ہو گیا تھا جس کی وجہ سے آرسن پاور کا سہارا قبول کرنے پر مجبور ہونا پڑا تھا۔ ورنہ مسٹر آرسن کیا اور اُن کی اوقات کیا.....

آرسن پاور مجھ سے مخاطب ہوئے بغیر، اُس لڑکی اور ایک معمر خاتون کے ساتھ آگے بڑھ گئے جس کے نقوش میں لڑکی کے نقوش کی جھلک پائی جاتی تھی۔ یہ دوسری بات ہے کہ اب یہ جھلک کافی مدہم پڑ گئی تھی۔ مجھے ایک دراز قامت آدمی نے مخاطب کر کے کہا۔ ”آئیے جناب! آپ کے لئے مہمان خانے میں بندوبست کر دیا گیا ہے۔ ویسے براہ کرم! آپ اپنا تعارف کر دیجئے۔“

”کیا تم مجھے نہیں جانتے..... مجھے یعنی ڈارک کو؟“

”معافی چاہتا ہوں۔ بہر طور! تشریف لائیے۔“ اُس نے معذرت کی اور مجھے عمارت کے مہمان خانے میں لے گیا۔ ایک شخص کو میری خدمت پر مامور کر دیا گیا۔ مقامی آدمی تھا۔ نام جوزان تھا۔ پتہ نہیں سلا کیا تھا؟ لیکن روباٹ معلوم ہوتا تھا کمبخت۔ مشینی انداز میں بولتا تھا۔ ضرورت پوچھتا اور خاموشی سے باہر نکل جاتا۔ بہر حال! مجھے کیا؟ میرے سامنے تو ایک ہی سوال تھا کہ وان ڈارک کی حیثیت سے میں اپنے آپ کو کس طرح برقرار رکھ سکوں گا؟ میری صورت نے یہاں بھی ایک خوبصورت پھول کھلا دیا تھا۔ یعنی میں وان ڈارک کا ہم شکل تھا۔

سوچا تھا کہ چند روز تو وان ڈارک بن کر ہی گزار لئے جائیں۔ اور اس کے بعد آرسن پاور کو بڑے خلوص سے بتا دوں کہ بھائی میاں! میں نہ ڈارک ہوں نہ لائٹ۔ میرا نام منصور ہے۔ اور اس کے علاوہ میں کیا ہوں؟ کوئی شخص بتا دے تو اُسے دنیا کے سب سے بڑے اعزاز سے نواز دوں۔ کیونکہ خود مجھے اپنی ذات کے بارے میں اب کچھ نہیں معلوم تھا کہ کیا ہوں؟

”اوہ..... نہیں نہیں۔ اب ایسا بھی نہیں ہے۔ دراصل آپ سے مکمل تعارف نہیں ہو۔“
 میں اس بات کا انتظار کر رہی تھی کہ ڈیڈی آپ سے تعارف کرا دیں تو آپ کے ساتھ
 بے تکلفی کے لمحات شروع ہوں۔ لیکن شاید آپ کو اس بات کا علم نہیں کہ یہاں آتے ہی
 ڈیڈی کو تھوڑی دیر کے بعد محکمہ خارجہ میں طلب کر لیا گیا ہے اور وہاں وہ اب تک مصروف
 ہیں۔ سوری مسٹر! کیا میں آپ کا نام پوچھ سکتی ہوں؟“
 ”وان ڈارک!“ میں نے جواب دیا۔

”اگر میں آپ کو صرف مسٹر ڈارک کہوں تو آپ برا تو نہیں مانیں گے؟“
 ”یہاں کم از کم اس ملک میں برا ماننے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ویسے کیا آپ مجھے
 یہ بتانا پسند کریں گی، معاف کیجئے گا! آپ کا نام بھی تو مجھے ابھی تک معلوم نہیں ہو سکا۔“
 ”لیشی پاور۔“ اُس نے جواب دیا۔ میرے پاپا مجھے بہت زیادہ چاہتے ہیں۔“
 ”آپ چاہے جانے کی چیز ہیں۔“ میں نے کہا اور پھر دانتوں تلے زبان دبالی۔ لیکن
 اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔
 ”شکریہ!“

”ہاں! تو میں یہ عرض کر رہا تھا آپ سے میڈم لیشی! کہ یہ کون سی جگہ ہے؟“
 ”کیا مطلب؟ آپ اس جگہ کے بارے میں نہیں جانتے؟“
 ”نہیں.....“

”کیوں؟“ اُس نے متحیرانہ انداز میں کہا۔

”کاش! آپ کے ڈیڈی مجھے یہ بات بتا دیتے۔“

”یہ سان بوتو ہے۔“ لیشی نے جواب دیا۔ میں زیر لب یہ نام دہرانے لگا۔ کوئی غیر
 معروف سی جگہ تھی۔ لیکن یہ اندازہ ہوتا تھا کہ افریقہ ہی کا ملک ہے۔ ”ویسے مسٹر وان
 ڈارک! آپ کا تعلق کہاں سے ہے؟“

”آہ..... اس سلسلے میں مسٹر آرسن پاور نے مجھے منع کر دیا ہے۔ اُن کی خواہش ہے کہ
 میں اپنے بارے میں کسی کو بھی نہ بتاؤں۔“

”اوہ..... یہ اچھی بات ہے کہ وعدے کی پابندی کی جائے۔ لیکن میں آپ کو یہ بتاؤں
 کہ پاپا دنیا کی کوئی بات مجھ سے نہیں چھپاتے۔“

اگلی صبح جوزان نے ناشتہ میرے کمرے ہی میں دیا۔ کسی سے ملاقات نہیں ہوئی تھی ابھی
 تک۔ البتہ یہ بات ذرا دل کو کھٹکتی تھی کہ مسٹر آرسن پاور، جہاز میں قدم رکھتے ہی مجھ سے
 بیگانے ہو گئے تھے۔ جس انداز میں اُنہوں نے جذباتیت کا مظاہرہ کیا تھا اس سے تو یہی لگتا
 تھا کہ میرا اُن کا عشق انتہائی گہرا ہے۔ لیکن اچانک ہی یہ عشق ہوا ہو گیا تھا۔

میں خود بھی جانتا تھا کہ جب انہیں حقیقت معلوم ہوگی تو صورتِ حال اس سے مختلف
 نہیں ہوگی۔ پتہ نہیں انہیں میرے بارے میں حقیقت معلوم ہوگئی تھی یا پھر اُن کی مصروفیات
 نے انہیں جکڑ لیا تھا۔ دن آہستہ آہستہ بیت رہا تھا۔ میں نے جوزان سے پوچھنے کی کوشش کی
 کہ یہ کون سی جگہ ہے؟ لیکن وہ احمقوں کی طرح میری صورت دیکھتا رہا۔ شاید مقامی زبان
 کے علاوہ اور کوئی زبان نہیں جانتا تھا۔ میں خاموش ہو گیا۔ دوپہر ہو گئی۔ کھانا اب بھی مجھے
 نہیں پہنچا دیا گیا تھا۔ میں رہائش گاہ سے یہ سوچ کر نہیں نکلا تھا کہ جب تک میزبان مجھ سے
 ملاقات کر کے اس کی اجازت نہ دے۔ مجھے اپنے طور پر بے تکلفی کا مظاہرہ نہیں کرنا
 چاہئے۔ لیکن مسلسل بے اعتنائی اُلجھن کا باعث بن رہی تھی۔ تقریباً تین بجے میں اپنے اُس
 کمرے سے باہر نکلا تو جوزان جلدی سے میرے پاس آ گیا۔

”کیا بات ہے؟ کیا تو میرا پہرے دار ہے؟“ میں نے تیکھے انداز میں کہا اور وہ دو قدم
 پیچھے ہٹ گیا۔

پتہ نہیں کیا سمجھا تھا، احمق کہیں کا..... میں وہاں سے آگے بڑھ گیا۔ زیادہ فاصلہ نہیں
 طے کرنا پڑا تھا۔ سامنے ہی ایک خوبصورت لان نظر آ رہا تھا جہاں وہ لڑکی بھی موجود تھی جسے
 دیکھ کر میں نے یہ سوچا تھا کہ رنگ سانولا ضرور ہے لیکن نقوش قیامت ہیں۔ لڑکی نے بھی
 مجھے دیکھا اور پھر مسکراتی ہوئی میری جانب بڑھ آئی۔

”ہیلو.....!“ اُس نے مجھے مخاطب کیا۔

”ہیلو.....!“ میں نے بھی جواب دیا۔

”سوری مسٹر! آپ سے تفصیلی ملاقات ہو ہی نہیں سکی۔“

”اگر کوئی مجھ سے تفصیلی ملاقات کرنا چاہتا، تبھی ہو سکتی تھی۔ مسٹر آرسن پاور تو مجھے یہاں
 لا کر بھول ہی گئے اور مجھ سے ایک بار بھی ملاقات نہیں کی۔ میرا خیال ہے ان حالات میں
 مجھے یہ جگہ چھوڑ دینی چاہئے۔“

”میرے؟“ آرسن پاور کے چہرے کی لکیریں عجیب انداز میں نمایاں ہو گئیں۔
 لیشی، میں اور دوسرے لوگ حیرت سے آرسن پاور کو دیکھ رہے تھے۔ ”پاپا! کیا یہ آپ
 کے دوست نہیں ہیں؟“

”سوری ڈیر! یا تو میں انہیں پہچان نہیں سکا یا پھر کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔ میری نگاہیں تو
 اپنے ہر دوست کو پہچانتی ہیں۔ جبکہ انہیں میں پہلی بار دیکھ رہا ہوں۔“
 میرے اعصاب کشیدہ ہو گئے۔ میں نے آہستہ سے کہا۔ ”کیا آپ مذاق کر رہے ہیں
 سُر آرسن؟“

”سوری مسٹر! میں اجنبی لوگوں سے مذاق نہیں کرتا۔“
 ”تب کیا آپ مجھے پہچان نہیں پارہے ہیں؟ وان ڈارک ہوں۔ آپ کا دوست۔ جس
 پاپ ناز کرتے ہیں۔“

”وان ڈارک میرا دوست..... میں اُس پر ناز کرتا ہوں؟ معاف کرنا نو جوان! اب تو
 انہیں اپنے بارے میں اور بھی بہت کچھ بتانا پڑے گا۔ اس عمارت میں تمہارا داخلہ کس
 طرح ہوا؟“

”پاپا! یہ آپ کے ساتھ جہاز پر آئے تھے۔“ لیشی نے کہا۔
 ”میرے ساتھ؟“ آرسن پاور کی آنکھیں سوالیہ انداز میں لیشی اور پھر میری طرف اٹھ
 گئیں۔

”میں وان ڈارک ہوں۔ وان ڈارک..... میں نے کسی قدر غصیلے لہجے میں کہا۔
 ”کون وان ڈارک؟ میں کسی وان ڈارک کو نہیں جانتا۔ یہ نام پہلی بار میرے کانوں
 تک آیا ہے۔“

”ارے باپ رے باپ..... میں نے خوفزدہ انداز میں گردن ہلائی۔ لیکن اب آرسن
 پاور کے انداز میں کسی قدر کھٹکی پیدا ہو گئی تھی۔
 انہوں نے سرد لہجے میں کہا۔ ”کون ہو تم؟“

”سمجھ میں نہیں آتا پاپا! آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں؟“ لیشی نے میری حمایت کی۔ ”یہ
 پ کے ساتھ جہاز میں آئے تھے۔ آپ انہیں یہاں لے کر آئے ہیں اور اب آپ کہہ
 رہے ہیں کہ آپ انہیں نہیں جانتے۔“

”یقیناً..... آپ سے کوئی بات چھپائی بھی نہیں جاسکتی۔“ میں پھر بے اختیار بول اٹھا
 اور وہ ہنسنے لگی۔

”آپ دلچسپ آدمی ہیں۔“
 ”اس کا بے حد شکریہ۔“ میں نے نیاز مندی سے سرخم کر کے کہا۔ پھر لیشی مجھ سے اپنے
 پاپا کے بارے میں بات کرنے لگی۔ لیکن یہ ساری باتیں گھریلو انداز کی تھیں۔ وہ ایک ایسی
 بیٹی تھی جو اپنے باپ کو بہت زیادہ چاہتی تھی۔ خیر! اُس کی چاہتوں کا جو سلسلہ بھی ہو لیکن
 مجھے وہ سر سے پاؤں تک چاہے جانے کے قابل نظر آئی اور میں اُسے جی بھر کے دیکھتا رہا۔
 وہ بے تکان بولتی رہی اور میں جواب دیتا رہا۔ کئی دفعہ اُسے رُکنا پڑا اور مجھے بھی۔ کیونکہ اس
 طرح بات میری ذات تک آ جاتی تھی۔ لیشی اب خود اس بات سے گریز کر رہی تھی کہ
 میرے بارے میں زیادہ کھوج کرے۔ دو تین گھنٹے پر لگا کر اڑ گئے۔ اُس نے وقت دیکھ کر
 کہا۔

”میرا خیال ہے کہ پاپا کے آنے میں دیر نہیں ہوگی۔ اب مجھے ذرا کچھ مصروفیت ہے۔
 تاہم جب تک تم یہاں ہو، تمہارے ساتھ وقت گزارنے میں لطف آئے گا۔“

”تھینک یو!“ میں نے گردن خم کر کے جواب دیا اور وہ چلی گئی۔ میں احمقوں کی طرح
 ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ یہ اُسی کا گھر تھا اور یہاں وہ میرے لئے ایک مہمان کی حیثیت اختیار
 کر گئی تھی۔ میں آہستہ آہستہ چلتا ہوا اپنے کمرے میں آ گیا۔ اس سے یہ اندازہ تو ہو گیا تھا
 کہ کم از کم آرسن پاور نے مجھ پر کوئی پابندی نہیں لگائی تھی۔ لیکن اب میں تھوڑی سی اکتاہٹ
 محسوس کر رہا تھا۔

شام کے کھانے پر لیشی نے مجھے بھی طلب کر لیا۔ آرسن پاور بھی کھانے کی میز پر موجود
 تھے۔ مجھے دیکھ کر انہوں نے سوالیہ انداز میں لیشی کی جانب نگاہیں اٹھائیں۔ وہ خاموش
 رہی تو انہوں نے دوسرے افراد کی طرف دیکھا۔ اور پھر آہستہ سے بولے۔ ”آپ سے
 تعارف نہیں ہو۔ کا۔“

”جی.....؟“ میری آنکھیں شدت حیرت سے پھٹی رہ گئیں۔
 ”لیشی! کیا تم اپنے دوست کا تعارف نہیں کراؤ گی؟“
 ”پاپا! یہ تو آپ کے دوست ہیں۔“

آرسن پاور پریشان نگاہوں سے ایک ایک کو دیکھنے لگا۔ ”یا تو تم لوگ پاگل ہو گئے ہو یا پھر میرا دماغ خراب ہو گیا ہے۔“ نوجوان دوست! براہ کرم اپنے بارے میں مجھے تفصیل بتا دو۔ میں بے حد مصروف انسان ہوں۔ ہو سکتا ہے تمہیں بھول گیا ہوں۔“

”اب تو بتانی پڑے گی تفصیل مسٹر آرسن پاور! لیکن ساتھ ہی میں نہایت افسوس کے ساتھ یہ الفاظ کہتا ہوں کہ آپ نہایت ناسپاس اور گھٹیا آدمی ہیں۔“

آرسن پاور کے چہرے پر عجیب سے تاثرات پیدا ہو گئے۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ اپنا غصہ دبانے کی کوشش کر رہے ہوں۔ دوسرے لوگ بھی چونک پڑے۔ پھر میں نے ہی کہا۔ ”آپ غالباً یہ بھول گئے ہوں گے کہ ہندوستان میں آپ پر قاتلانہ حملہ ہوا تھا اور کسی نے آپ کی زندگی بچائی تھی۔“

”اوہ..... تعجب ہے۔ اگر آپ وہ تھے مسٹر..... کیا نام بتایا، مسٹر وان ڈارک! تو آپ یہاں کیسے آ گئے؟ کیا میرے تحفظ کے لئے ہندوستان کی حکومت نے آپ کو میرے ساتھ بھیجا تھا؟“ آرسن پاور نے سوال کیا اور میری آنکھیں غصے سے سرخ ہو گئیں۔

”جی نہیں۔ ویسے اگر آپ اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھے ہیں تو مجھے اس کا افسوس ہے۔ ہندوستانی حکام کے سامنے آپ نے مجھے وان ڈارک کی حیثیت سے پہچانا اور حکومت سے درخواست کی کہ مجھے آپ کے حوالے کر دیا جائے۔ آپ نے دوستی کے جن جذبوں کا اظہار کیا، اُن کے تحت میں نے آپ کو مایوس کرنا مناسب نہیں سمجھا اور اپنا وطن چھوڑ کر یہاں آ گیا۔ اب آپ نے دل میں یہ سوچا ہے کہ میری ضرورت نہیں رہی۔ چنانچہ عدم واقفیت کا اظہار کیا۔ معاف کیجئے گا مسٹر آرسن! میں آپ کا احسان لینا بھی نہیں چاہتا۔ اور اس کے بعد آپ کے عیش کدے میں رہنا بھی پسند نہیں کرتا۔ آپ غلط فہمی کا شکار ہیں۔ میں تو صرف آپ کی دعوت پر یہاں تک چلا آیا ہوں اور اس سلسلے میں اگر آپ کو کسی طرح کا کوئی شبہ ہے تو حکومت ہندوستان اس بات کی تصدیق کر سکتی ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ میں نے ایک غلط آدمی کو وہ حیثیت دی جو ذہن و دل سے تعلق رکھتی ہے۔ سوری! اس کے بعد اس کا کیا سوال ہے کہ میں آپ کے ساتھ وقت گزاروں یا اس میز پر بیٹھ کر کھانا کھاؤں.....“

مسٹر آرسن پاور متحیرانہ انداز میں مجھے دیکھ رہے تھے۔ میں کرسی سے اٹھ کر واپسی کے لئے مڑا تو انہوں نے آہستہ سے کہا۔ ”سنئے تو سہی مسٹر ڈارک! پلیز..... یہ بات بھی

بہت نہیں ہے کہ آپ کھانے کی میز سے اس طرح چلے جائیں۔“

”آپ کیا سمجھتے ہیں اپنے آپ کو؟ آپ کے خیال میں، میں آپ کی اس میز پر بیٹھنے کے لئے یہاں آیا ہوں؟ اس توہین کے بعد اگر میری جگہ آپ ہوتے تو کیا رُک جاتے؟ بالبتہ یہ کسی طور ممکن نہیں سمجھتا۔“ میں نے کہا اور واپسی کے لئے مڑ گیا۔

میں تیزی سے کمرے سے باہر نکلا۔ لیکن اُسی تیزی سے لیشی پاور بھی میرے قریب پہنچ گئی۔ ”سنو تو سہی مسٹر ڈارک..... پلیز!“

”سوری ڈیئر! تم خود سوچو۔ میں نے مسٹر آرسن پاور کی زندگی بچائی تھی۔ اور اُس وقت میرے ذہن کے کسی گوشے میں یہ خیال بھی نہیں تھا کہ اُس کے بدلے میں مسٹر آرسن پاور نے ساتھ سان بوتو تک آؤں گا۔ مسٹر آرسن پاور نے ہندوستان کی حکومت سے درخواست کی اور مجھے یہاں تک لے آئے۔ اور یہاں آنے کے بعد وہ مجھ سے جان چھڑانے کے لئے اس طرح بیگانگی کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔ میں ایک خود دار آدمی ہوں۔ اور یہ سب کچھ برداشت نہیں کر سکتا۔“

”تو آپ سے کون کہتا ہے کہ آپ یہ سب کچھ برداشت کیجئے؟ ڈیڈی نے اگر یہ حرکت کی ہے تو کیا ہوا؟ دوسروں سے بھی تو آپ کا تعارف ہو چکا ہے۔ میں بھی موجود ہوں۔ کیا یہ بات برداشت کر سکتی ہوں کہ میرے گھر سے کوئی مہمان اور خاص طور سے وہ جس نے میرے ڈیڈی پر احسان کیا ہو، اس طرح رخصت ہو جائے۔“

”کمال کی بات ہے مس لیشی! بھلا میرے اور آپ کے درمیان کیا ربط ہے؟“

”سنئے! اگر ڈیڈی کسی وجہ سے یہ باتیں بھول چکے ہیں تو یہ اندازہ تو لگانا ہی ہوگا کہ ایسا کیوں ہوا؟ قاتلانہ حملے کے بارے میں مجھے کچھ تفصیل معلوم ہے۔ اس کی اطلاع ہم اُن کو مل گئی تھی لیکن بہت ہی مختصر انداز میں۔ میں ابھی تک ڈیڈی سے اس سلسلے میں پوچھ نہیں پائی کہ حملہ آور کون تھے؟ اور اُن کا مقصد کیا تھا؟ ظاہر ہے مجھے وقت ہی نہیں ملا۔“

”لیکن اگر آپ نے ڈیڈی کی جان بچائی ہے تو پھر یہ مجھ پر لازم ہے کہ میں آپ کی مدد کروں۔ ہو سکتا ہے کہ ڈیڈی کسی ذہنی منصوبے کے زیر اثر ہوں۔ براہ کرم! آپ اس سے جانے کا فیصلہ ملتوی کر دیجئے۔“

”مس لیشی! کیسی عجیب باتیں کر رہی ہیں آپ؟ جس شخص کے ایماء پر میں یہاں تک

آیا ہوں اگر وہ مجھے پہچانے سے منکر ہو جائے تو اس کے بعد میرے یہاں رکنے کا کیا سوال ہے؟“

لیشی کس سوچ میں ڈوب گئی۔ پھر اُس نے آہستہ سے کہا۔ ”اچھا! ایک کام کیجئے آپ۔ آپ یہاں نہ رکیں۔ لیکن میرے ساتھ کہیں اور تو چل سکتے ہیں۔“

”کہاں؟“

”جہاں میں لے جاؤں۔“ اُس نے عجیب سے انداز میں کہا اور میں اُس کی صورت دیکھنے لگا۔

پھر میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”کہنے کو تو میں آپ سے بہت کچھ کہہ سکتا ہوں مس لیشی! لیکن بہر طور! اگر آپ کی یہ خواہش ہے کہ آپ مجھے کہیں رکھیں تو ٹھیک ہے۔ عارضی طور پر آپ کی یہ بات مان لینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ میں آپ کو دھوکہ نہیں دوں گا۔“

”تو پھر آئیے! میرے ساتھ چلیے۔“

”آپ جانیے۔ کھانے کے کمرے میں وہ لوگ آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔“

”میں کھانا نہیں کھاؤں گی۔ ان حالات میں بھلا کیا یہ مناسب ہو گا؟ میں خود بھی بہت بد دل ہوئی ہوں ڈیڈی، کے اس انداز سے۔ براہ کرم! میرے ساتھ آئیے۔“ لیشی نے مجھے اس طرح مجبور کیا کہ میں نے حامی بھر لی اور تھوڑی دیر کے بعد میں اُس کے ساتھ ایک چھوٹی سی کار میں بیٹھا جا رہا تھا۔

راستے میں، میں نے اُس سے پوچھا۔ ”کہاں لے جائیں گی مجھے؟“

”ایشانوں۔ یہ ایشیائیوں کا ہوٹل ہے۔“

”اوہ! لیکن.....“

”معاف کیجئے گا۔ ہوٹل کا مینجر میرا دوست ہے۔ اور مجھے اس کے اخراجات ادا نہیں کرنے پڑیں گے۔ اور اگر ادا کرنے بھی پڑے، تب بھی یہ کوئی ایسی اہم بات نہیں ہے۔ آپ مطمئن رہیں۔ میں نہیں سمجھتی کہ آپ کے اور ڈیڈی کے معاملات کیا ہیں؟ لیکن بہر طور! میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ آپ ڈیڈی کے ساتھ ہی جہاز سے اترے تھے۔ اس وقت ڈیڈی آپ کو بڑے احترام سے اپنے ساتھ لائے تھے۔ یہاں آکر نہ جانے اُن کو کیا ہو گیا؟“

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ہوٹل ایشانوں، واقعی ایشیائیوں کا ہوٹل تھا۔ یہاں چمکی ہوئی اپنی باندھے سکھ بھی نظر آ رہے تھے۔ دھوتی بردار ہندو بھی تھے اور مسلمان بھی مختلف لباس میں نظر آ رہے تھے۔ چینی اور جاپانی افراد بھی گاہے گاہے نظر آ جاتے تھے۔ مقامی لوگوں کی تعداد بھی اچھی خاصی نظر آتی تھی۔

لیشی مینجر کے پاس پہنچ گئی۔ وہ ایک مقامی نو جوان تھا۔ انتہائی چوڑے شانوں والا۔ مقامی لوگوں کی طرح بدنما تھا لیکن آنکھیں بے حد خوبصورت تھیں۔ لیشی اُس سے باتیں کرتی رہی۔ اُس نے گردن خم کی پھر ایک شخص کو بلایا اور اُسے کچھ ہدایات دیں۔ اُس شخص نے ہاؤس سے ایک چابی حاصل کی اور اُس کے بعد ہمیں ساتھ آنے کا مشورہ دے کر لفٹ کی جانب بڑھ گیا۔ لفٹ نے ہمیں پانچویں منزل پر اتار دیا۔ پانچویں منزل کا ایک کمرہ ہے جسے منتخب کر دیا گیا۔ چنانچہ میں اُس میں مقیم ہو گیا۔ کمرہ کافی کشادہ اور بہت خوبصورت تھا۔ لیشی پاؤں نے عقبی کھڑکی کھولی اور گہری سانسیں لینے لگی۔ تب اُس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”میرا خیال ہے کمرہ آپ کو پسند آئے گا۔ لیکن براہ کرم! یہاں سے جانے کی کوشش نہ کیجئے گا۔ میرا آپ سے رابطہ رہے گا۔ براہ کرم! مجھ سے تعاون کیجئے۔ میں آپ سے وفادار کرتی ہوں۔“

”مس لیشی! آپ کو واقعی میری وجہ سے بہت تکلیف ہوئی ہے۔ میں اُس کے لئے فطرت خواہ ہوں۔ ایک اور درخواست کرنا چاہتا ہوں آپ سے۔ کسی قسم کی پریشانی یا تردد ضرورت نہیں ہے میرے لئے۔ ہاں! کم از کم یہ بات ضرور معلوم کر لیجئے کہ میں نے پاور کی جان بچائی تھی یا نہیں؟ اگر یہ ثبوت آپ کو مل جائیں تو براہ کرم! مجھے اس سے آگاہ کر دیجئے گا تا کہ میں اپنی پوزیشن صاف کرنے کے بعد یہاں سے چلا جاؤں۔“

لیشی نے عجیب سی نگاہوں سے مجھے دیکھا اور آگے بڑھی۔ میرا ہاتھ پکڑا۔ اُسے بوسہ دیا۔ پھر میری طرف مڑتی ہوئی بولی۔ ”اس امانت کو اپنے پاس محفوظ رکھئے گا۔“

میں نے اسے بوسہ دیا۔ یہ آپ کو کسی لیشی پاور کی یاد دلاتی رہے گی اور آپ اسے چھوڑ کر بھاگنا نہیں کریں گے۔“

”خوبصورت انداز تھا کسی کو رُجھانے کا۔ میں اپنے ہاتھ کی پشت پر اُس کے ہونٹوں

کے سرخ نشانات دیکھتا رہا جو لپ اسٹک سے بن گئے تھے۔ پھر میں نے شانے ہلائے اور اس کھڑکی کے پاس پہنچ گیا جو لیشی نے کھولی تھی۔ تھوڑی دیر وہاں کھڑا باہر کا نظارہ کرتا رہا۔ پھر واپس آ کر کمرے کے وسط میں پڑے صوفے پر بیٹھ گیا۔ اب میرا ذہن انہی پر اسرار واقعات میں الجھا ہوا تھا۔

مگر یہ الجھاؤ زیادہ طویل ثابت نہ ہوا۔ اچانک کھڑکی سے سرد ہوا کا ایک جھونکا اندر داخل ہوا اور میرے بدن پر ایک لمحے کے لئے کپکپی سی طاری ہو گئی۔ میں نے کھڑکی کی طرف دیکھا اور حیران رہ گیا..... کھڑکی کے پاس سے ہٹے ہوئے میں نے اُسے بند کر دیا تھا۔ پھر..... اور پھر یہ ٹھنڈک میرے ذہن میں سرایت کر گئی۔ میرے ہونٹ ہنچ گئے۔ آنکھیں خون اُگلنے لگیں۔ میں نے سرد اور بگڑے ہوئے لہجے میں پکارا۔

”راعمیس..... تم؟“

”ہاں! میرا خیال تھا کہ مجھے بھول چکے ہو گے۔“ ذہن میں راعمیس کی آواز گونجی۔

”ہاں..... تمہارا خیال درست ہے۔ میں واقعی تمہیں بھول چکا ہوں۔“

”تو پھر تم نے مجھے میرے نام سے کیسے پکارا؟“

”ظاہر ہے۔ تکلیف دہ لمحات اتنی جلدی ذہن سے فراموش نہیں ہوتے۔“

”راعمس! بد قسمتی ہے میری کہ تم میرے دوست کے ہم شکل ہو۔ ورنہ تمہارا کیا خیال

ہے، کیا تم ایسی ہی خوبیوں کے مالک ہو کہ تمہاری خوشامدی کی جائیں؟“

”میں تمہاری دوستی پر لعنت بھیجتا ہوں۔ اور اپنی اس صورت پر بھی جو کہیں اور کسی جگہ

تمہارے دوست راعمس سے ملتی جلتی ہے۔ مجھے ساری شکلیں قبول ہیں لیکن راعمس کی

صورت قبول نہیں ہے اور اس بات پر میں ہمیشہ شرمسار رہوں گا۔“

”تم ناسپاس بھی ہو راعمس! میں نے ہمیشہ ہر جگہ تمہاری مدد کی ہے۔ ہر برے وقت

میں تمہارا ساتھی بنا ہوں۔ لیکن جب بھی ہمارا سامنا ہوتا ہے، تم ایسی ہی باتیں کرتے ہو۔“

”میں لعنت بھیجتا ہوں تمہاری ہر طرح کی امداد پر۔ تم سے درخواست کرتا ہوں کہ مجھے

بار بار اپنی مکروہ یاد نہ دلایا کرو۔“

”احمق انسان! کیا تو نے یہ نہیں سوچا کہ تجھے یہاں کون لایا؟ کس نے اُس وقت تیری

مدد کی جب ہندوستانی فوج اور پولیس تیرے پاسپورٹ اور تیری شناخت میں ناکام ہوئی

تھی؟ اس کے بعد جو کچھ بھی ہوتا، اس کا تصور تم نہیں کر سکتے۔ میں نے یہی مناسب سمجھا کہ بن پاور کے ذہن میں تیرے لئے جگہ پیدا کر دی جائے۔ تب میں نے اُس کے ذہن میں ان ڈارک پیدا کیا۔ اور وہ تجھے اس حیثیت سے پہچان گیا۔ اس کے علاوہ اور کوئی کار نہیں تھا کہ آرسن پاور تجھے یہاں اپنے ساتھ لے آئے۔ ورنہ تیرا ہندوستان سے نکلنا نہیں ہوتا۔ بہر طور! میں تیرے لئے کچھ نہیں کرتا۔ جو کچھ کرتا ہوں، اپنے دوست اس کے لئے کرتا ہوں۔ ٹھیک ہے۔ تو میرے لئے دل میں یہی جذبات رکھتا ہے تو بن مرضی میں جا رہا ہوں۔ اب بھگت ان حالات سے.....“

سردی کی فضا معدوم ہو گئی اور مجھے اندازہ ہو گیا کہ راعمیس ناراض ہو کر چلا گیا ہے۔

بن وہ میرے ذہن میں بڑی سنسنی چھوڑ گیا تھا۔ واقعی راعمیس کا کہنا درست تھا۔ آرسن

یقیناً اُس کے زیر اثر آ گئے تھے اور یہ سب اُسی کی کارستانی تھی اور اب اگر وہ مجھے

پننے سے انکار کر رہے تھے اور اُن کے ذہن سے وہ تمام لمحات محو ہو گئے تھے تو مجھے

ات نہیں کرنی چاہئے تھی۔ وہ بے چارے بے قصور تھے۔ لیکن میں بھی تو نہیں جانتا تھا کہ

اب کچھ اُس بری رُوح کا کارنامہ ہے جو بھٹکتی ہوئی نجانے کہاں سے آتی ہے اور کہاں

لجھاتی ہے؟ مگر اب کیا ہو گا.....؟

☆.....☆.....☆

بین کمرے کا دروازہ کھلا دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی تھی۔ میں متحیرانہ انداز میں اندر داخل
 لیش کو صوفے پر دراز پایا۔ وہ کسی رسالے کی ورق گردانی میں مصروف تھی۔ اُس نے
 راتی نگاہوں سے مجھے دیکھا۔

”کہاں چلے گئے تھے؟“

”بس..... ایسے ہی تمہارا سان بوتو دیکھ رہا تھا۔“

”سان بوتو کی شہری زندگی تو تمہاری دنیا سے مختلف نہیں۔ دیکھنی ہے تو یہاں کی دیہی
 زندگی دیکھو۔ ویسے میں تمہیں آج رات کے کھانے پر مدعو کرنے آئی ہوں۔“

”اس تکلف کی کیا ضرورت ہے؟ میں تو آپ کا انتظار کر رہا تھا یہ سوچ کر کہ آپ آ
 ئیں تو آپ سے اجازت لے لوں۔ ظاہر ہے میں آپ کے یہ احسانات زیادہ دیر تک
 بول نہیں کر سکتا۔“ میں نے سنجیدگی سے کہا اور لیش کا چہرہ بھی سنجیدہ نظر آنے لگا۔

”میرا خیال تھا کہ آپ میری دوستی قبول کر چکے ہیں۔ اور آپ یقین کیجئے کہ میں نے
 اعلیٰ درجے کی عمارتوں سے مرصع تھے۔ البتہ اُن کے درمیان گھومنے پھرنے والے لوگ
 نہیں آیا۔ تاہم اگر آپ یہاں سے جانا چاہتے ہیں تو میں آپ کو روکنے کی کیا ہمت رکھتی

میں ٹہلتا ہوا ایک ایسے علاقے کی جانب جا نکلا جو عام شہر کی نسبت ذرا ہلکی طرز پر بنا ہوا تھا۔
 ”اُس کے لہجے میں اُداسی گھل گئی اور میں اُسے دیکھنے لگا۔ تب وہ رسالہ رکھ کر سیدھی
 تھا۔ یہاں پہلی بار مجھے روایتی افریقی رقص نظر آیا۔ غالباً کوئی تقریب تھی۔ لوگوں نے ہنس
 کھڑے کر کے اُن میں رنگ برنگی جھنڈیاں لٹکائی ہوئی تھیں اور اُن کے آس پاس بہت

”نہیں..... میں ناراض نہیں ہوں۔ لیکن آپ خود سوچئے! میں کس بنیاد پر آپ کے
 سے لوگ ایک دائرہ بنائے بیٹھے ہوئے تھے۔ پتہ نہیں وہ اُن کے درمیان باقاعدہ طور پر مدعو تھے
 دیکھا جو پتھروں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ پتہ نہیں وہ اُن کے درمیان باقاعدہ طور پر مدعو تھے
 پھر یہ صرف اتفاق ہی تھا۔ میں خود بھی اُن کے درمیان جا کھڑا ہوا۔

دونگ دھڑنگ نوجوان جنہوں نے کسی جانور کی کھال سے جسم کے نچلے حصے کی ستر پٹائی
 کی ہوئی تھی اور اُن کے عقب میں جانور کی کھال کی دُم لٹک رہی تھی، وحشیانہ رقص کر رہے
 تھے۔ رقص میں عورتیں شامل نہیں تھیں۔ اُن لوگوں کے لرزیدہ بدن بالکل مشینی انداز میں
 رقص کرتے ہوئے محسوس ہوتے تھے۔ ڈھول کی آواز پر وہ چار چار فٹ اونچی چھلانگ لگاتے

اپنے بدن کو تحریک دے رہے تھے۔ رقص میں بہت مزہ آیا۔ اور میں کافی دیر تک اُن کے
 درمیان شامل رہا۔ پھر رقص ختم ہو گیا۔ اور میں مزید کچھ دیر گھومتا رہا۔ پھر واپس اپنے
 ”تو پھر آپ آج رات ہمارے ساتھ کھانے پر شریک نہیں ہو رہے؟“
 یہ دعوت اگر آپ کی ذاتی نوعیت کی ہے تو اس کے لئے گھر کا تکلف کیا حیثیت رکھتا
 ہے؟ میں نے کہا کہ میں کھانا کھا لیں گے۔ آپ میرے ساتھ کھانا کھا لیجئے۔“
 ”نہیں..... یہ ذاتی نوعیت کی نہیں ہے۔ ذاتی دعوتوں کے سلسلے میں تو میں نے آپ کے
 ایک بروگرام ترتیب دیا تھا۔ لیکن یہ اُس وقت کی بات ہے جب میں سوچ رہی تھی کہ

رات یونہی گزری۔ دوسرا دن بھی خاص اہمیت کا حامل نہیں تھا۔ ذہن پر ایک بوجھ سا تھا
 جو ہمیشہ ہی طاری رہتا۔ اور میں اپنی ذات اور اپنے مستقبل کے وسوسوں میں گھرا رہا تھا۔
 فی الوقت یہی فیصلہ کیا تھا کہ لیش پاؤں تک سپاس گزاری کر رہی ہے، کرنے نہ
 جائے۔ جب وہ اکتا جائے تو پھر آگے کے بارے میں سوچنا مناسب ہے۔ میں لیشی پاؤں
 انتظار کرتا رہا۔ دوپہر تک وہ نہ آئی تو میں خود ہوٹل سے نکل آیا اور سان بوتو کے گلی کوچوں
 میں گردش کرنے لگا۔ افریقہ کی روایتی زندگی یہاں نظر نہیں آ رہی تھی۔ شہر، گلیاں اور بازار
 اعلیٰ درجے کی عمارتوں سے مرصع تھے۔ البتہ اُن کے درمیان گھومنے پھرنے والے لوگ
 بہت زیادہ مہذب نظر نہیں آ رہے تھے۔

میں ٹہلتا ہوا ایک ایسے علاقے کی جانب جا نکلا جو عام شہر کی نسبت ذرا ہلکی طرز پر بنا ہوا تھا۔
 ”اُس کے لہجے میں اُداسی گھل گئی اور میں اُسے دیکھنے لگا۔ تب وہ رسالہ رکھ کر سیدھی
 تھا۔ یہاں پہلی بار مجھے روایتی افریقی رقص نظر آیا۔ غالباً کوئی تقریب تھی۔ لوگوں نے ہنس
 کھڑے کر کے اُن میں رنگ برنگی جھنڈیاں لٹکائی ہوئی تھیں اور اُن کے آس پاس بہت
 سے لوگ ایک دائرہ بنائے بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے اس تقریب میں چند غیر ملکیوں کو بھی
 دیکھا جو پتھروں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ پتہ نہیں وہ اُن کے درمیان باقاعدہ طور پر مدعو تھے
 پھر یہ صرف اتفاق ہی تھا۔ میں خود بھی اُن کے درمیان جا کھڑا ہوا۔

دونگ دھڑنگ نوجوان جنہوں نے کسی جانور کی کھال سے جسم کے نچلے حصے کی ستر پٹائی
 کی ہوئی تھی اور اُن کے عقب میں جانور کی کھال کی دُم لٹک رہی تھی، وحشیانہ رقص کر رہے
 تھے۔ رقص میں عورتیں شامل نہیں تھیں۔ اُن لوگوں کے لرزیدہ بدن بالکل مشینی انداز میں
 رقص کرتے ہوئے محسوس ہوتے تھے۔ ڈھول کی آواز پر وہ چار چار فٹ اونچی چھلانگ لگاتے
 اپنے بدن کو تحریک دے رہے تھے۔ رقص میں بہت مزہ آیا۔ اور میں کافی دیر تک اُن کے
 درمیان شامل رہا۔ پھر رقص ختم ہو گیا۔ اور میں مزید کچھ دیر گھومتا رہا۔ پھر واپس اپنے

آپ میری دوستی قبول کر لیں گے۔ میں آپ کو کسی بھی جگہ مجبور کرنا نہیں چاہتی۔ آپ رات کے کھانے پر مسٹر آرسن پاور نے بلایا ہے۔“

”کیا وہ میرا نام تسلیم کرنے پر آمادہ ہو گئے ہیں؟“

”میں اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتی۔ بہتر یہ ہو گا کہ اس بارے میں سوالات آپ انہی سے کر لیں۔“ لیشی نے کہا۔ وہ کچھ رُوٹھی رُوٹھی سی نظر آ رہی تھی۔ میں نے سنبھالا لیا۔ اب اس سے زیادہ ناراضگی کا اظہار مناسب نہیں تھا کہ کہیں میری بے بسی میرے لئے مصیبت نہ بن جائے۔

چنانچہ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”آپ کا رُوٹھا ہوا چہرہ بہت دلکش لگ رہا ہے۔“

”ٹھیک ہے۔ کچھ لوگ صرف دُکھ دینا جانتے ہیں۔ آپ بھی انہی میں سے ہیں۔“

”اوہو! یہ الفاظ کہہ کر آپ مسٹر پاور ہی کی طرح اپنائیت کا مظاہرہ کر رہی ہیں۔“

”جی نہیں۔ یہ میرے ذاتی جذبات ہیں۔“

”مگر مس لیشی.....“

”نہیں..... رہنے دیجئے۔ میں کسی طرح کی بھی رعایت نہیں چاہتی۔“

”سوری لیشی! اگر آپ کو میرے الفاظ سے دُکھ پہنچا ہے تو میں معافی چاہتا ہوں۔“

”دُکھ پہنچانے کی کوشش ہی کیوں کی گئی تھی؟ کوئی بھی ایسی دقت ہو سکتی ہے ڈیڈی کے لئے، جس کی وجہ سے وہ ذہنی طور پر معطل ہو گئے۔ آپ کو فوراً ہی بدلہ تو نہیں لے لینا چاہئے تھا۔“

”میں نے بدلہ کہاں لیا ہے؟ بس! اس احساس کا شکار رہا ہوں کہ اگر مسٹر آرسن میری پذیرائی کرتے تو زیادہ بہتر ہوتا۔ اب میرا بوجھ آپ کے اوپر پڑ رہا ہے۔“

”لیکن میں نے تو اس بوجھ کو بالکل بھی محسوس نہیں کیا۔ آپ غیریت برت رہے ہیں تو دوسری بات ہے۔“

”چلیں چھوڑیں۔ ہم لوگ بہت سنجیدہ گفتگو کرنے لگے۔ میں آپ سے آپ کے

بارے میں باتیں کیوں نہ کروں؟“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”دل چاہے تو ضرور کریں۔ آپ نے تو اس کا حق ہی چھین لیا مجھ سے۔“ لیشی نے کہا

اور میں اُس کے برابر ہی ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔

”ٹھیک ہے لیشی! اگر میری بات سے آپ کو دُکھ پہنچا ہے تو میں معافی چاہتا ہوں،

رات کے کھانے کی دعوت کا شکریہ۔ آپ کہتی ہیں تو ضرور چلوں گا۔ اب ان تمام باتوں کو

چھوڑ کر مجھے اپنے بارے میں بتائیے۔“

”کیا بتاؤں اپنے بارے میں؟“

”کیا کرتی ہیں آپ؟“

”بوریت کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔ بہت کم دوست بنانے کی عادی ہوں۔ دوستوں

کو پرکھتی ہوں اور اس کے بعد اپنے قریب آنے دیتی ہوں۔ لیکن دنیا سے بہت زیادہ خوش

نہیں ہوں۔“

”اوہ..... افریقہ کی زندگی میں آپ کیسا محسوس کرتی ہیں؟“

”دراصل مجھے جدید زندگی بالکل پسند نہیں ہے۔ ہاں! افریقہ کے اندرونی علاقے

میرے لئے باعث دلکشی ہیں۔ وہاں کے لوگ عقل سے عاری ہیں۔ لیکن انسانی محبت سے

مالامال ہیں۔ وہ نفرت کرتے ہیں تو اس کا اظہار بھی کرتے ہیں۔ اور محبت کرتے ہیں تو اُن

کی محبت میں بھی کوئی کھوٹ نہیں ہوتا۔ میں نے تو اپنے دل میں سوچا تھا کہ آپ کو افریقہ کی

زندگی دکھاؤں۔ سان بوتو کا یہ شہر جدید شہر ہے۔ لیکن اس سے آگے کی زندگی اُن سادہ لوح

لوگوں کے جذبات کی آئینہ دار ہے جو یہاں کے باشندے ہیں۔“

”آہ! میں ایک سیاح ہوں اور سیاحت کی حیثیت سے بہت کچھ دیکھ چکا ہوں۔ لیکن

آپ کے ساتھ افریقہ کی زندگی دیکھ کر مجھے واقعی لطف آئے گا۔“

لیشی مسکراتے لگی۔ اُس نے اپنی حسین آنکھوں سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”پھر ابتداء

میں ناراضگی کا اظہار کیوں کیا تھا؟ سارا موڈ خراب کر دیا۔“

”چلو! اب اپنا موڈ بحال کر لو، میں دوستوں کو ناراض نہیں کر سکتا۔“

لیشی آہستہ آہستہ بحال ہو گئی۔ ہم دونوں نے کافی منگوا کر پی اور اس کے بعد لیشی مجھ

سے آج کے مشاغل کے بارے میں معلومات حاصل کرتی رہی۔ میں نے اُس تقریب کا

نہ سنا یا تو وہ مسکراتے لگی۔ ”ہاں! یہاں کے لوگ مہمان نواز بھی ہیں۔ وہ تقریب یقیناً کسی

گھر میں ہو گی۔ جس گھر میں تقریب ہوتی ہے وہاں کے لوگ ایسے ہی میدانوں میں

نہ کیا کرتے ہیں۔ میں تمہیں اندر کی زندگی دکھاؤں گی۔ لطف آ جائے گا۔“ لیشی نے

کہا۔

شام تک ہم دونوں ساتھ ہی رہے اور دنیا بھر کی باتیں کرتے رہے۔ پھر شام کو میں تیار ہو کر اُس کے ساتھ ہی اُس کے گھر کی جانب چل پڑا۔

مسٹر آرسن پاور نے خوبصورت مکان کے بیرونی حصے میں میرا استقبال کیا تھا۔ وہ ایک شاندار لباس میں ملبوس بہت سمارٹ نظر آ رہے تھے۔

لیشی کہنے لگی۔ ”پاپا! مسٹر ڈارک بہت ناراض تھے اور ہمارے گھر نہیں آنا چاہتے تھے۔ ان کا کہنا ہے کہ مسٹر آرسن کی اس توجہ سے وہ اپنے لئے انتظامات کر کے ہی نہ آئے اور یہاں سے واپس جانے کے لئے انہیں کافی دقت پیش آئے گی۔ اگر یہ دقت اُن کے ساتھ نہ بیوتی تو شاید وہ سان بوتو چھوڑ کر چلے گئے ہوتے۔“

آرسن پاور نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ مجھے ساتھ لئے ہوئے ڈرائنگ روم میں آ بیٹھے جو کافی نفاست سے آراستہ تھا۔ یہاں اُن کے دیگر اہل خانہ بھی تھے۔ سب کے سب مہذب اور تعلیم یافتہ۔ گو اُن کے چہروں سے سان بوتو جھلک رہا تھا۔ لیکن مہذب تھے اور وہ بھی اعلیٰ درجے کے۔ اور افریقہ کی روایتی وحشت کبھی کی چھوڑ چکے تھے۔

مسٹر آرسن پاور نے مجھے اپنے سامنے بٹھالیا۔ ”اب میں آپ کو مسٹر وارن ڈارک کہہ کر مخاطب نہیں کروں گا۔ کیونکہ آپ وہ نہیں ہیں۔ لیکن مسٹر منصور! آپ یقین کیجئے کہ میں زندگی میں اتنا حیران کبھی نہیں ہوں۔“

میں نے کوئی جواب نہ دیا تو مسٹر پاور کہنے لگے۔ ”یہ وعدہ جو میں نے کیا تھا، ایک خاص نوعیت کا حامل تھا۔ مجھے ایک بہت بڑی مملکت نے اپنا نمائندہ بنا کر بھیجا تھا۔ لیکن چھوڑ پئے! یہ سارے معاملات سیاسی نوعیت کے ہیں۔ مجھے شدید حیرت ہے کہ میری زندگی کے وہ لمحات کہاں گم ہو گئے جن میں، میں نے آپ کو وان ڈارک کہہ کر مخاطب کیا تھا۔ آپ یقین کیجئے! اس میں میرا کوئی قصور نہیں۔ میں بس! کسی ایسے ذہنی مرض کا شکار ہو گیا تھا جس کے زیر اثر میں نے آپ کو وان ڈارک سمجھا، آپ کو یقیناً تعجب ہو گا کہ اس نام کا میری زندگی میں کوئی دخل نہیں ہے اور مجھے یہ یاد نہیں کہ میں نے کب آپ کو طیارے میں اپنے ساتھ سفر کی دعوت دی اور کب آپ سے اپنی محبت کا اظہار کیا..... میں آپ سے بھی اس سلسلے میں معلومات حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ کیا آپ میری اس ذہنی کیفیت کا کوئی تجزیہ

ہوتے ہیں؟“ مسٹر آرسن پاور چند لمحات خاموش رہ کر میرا چہرہ دیکھتے رہے۔ پھر آہستہ سے ستر کر بولے۔ ”لیشی نے مجھے بتایا ہے کہ آپ ناراض ہو گئے تھے۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ اپنی بھی شخص اگر کسی پر انحصار کرے اور اس کی طرف سے اچانک بے اعتنائی کا مظاہرہ کرنے لگے تو ناراضگی اپنی جگہ ایک ٹھوس حقیقت رکھتی ہے۔ لیکن میں آپ کو تمام صورت اہل بتا چکا ہوں۔ پہلے میں آپ کو یہ بتاؤں کہ جب آپ نے اپنی حیثیت کا اظہار کیا اور میں ان گمشدہ لمحات کو یاد نہ کر سکا جن کا تعلق آپ سے تھا تو مجھے شدید حیرت ہوئی۔ لیشی نے ایک عمدہ کام کیا۔ یعنی آپ کو یہاں سے جانے نہ دیا۔ اور اس کے بعد جب وہ آپ کو بلی ایشیانو میں پہنچا کر میرے پاس آئی اور اُس نے تمام باتیں مجھ سے کیں تو مجھے جستجو ہوئی۔ میں نے تحقیقات کیں تو پتہ چلا کہ یہ تمام باتیں ایک ٹھوس حقیقت رکھتی ہیں۔ آپ نے مجھے قتل کرنے کی بجائے میری زندگی بچائی اور اُس شخص کو قتل کر دیا جسے میں قطعی نہیں مانتا۔ اور اس کے بعد وہاں میں نے آپ سے اپنائیت کا اظہار کیا۔ یہ تمام باتیں ایک ٹھوس حقیقت رکھتی ہیں۔ لیکن آپ یقین کیجئے کہ مجھے وہ گمشدہ لمحات نہیں ملتے جس میں، میں نے آپ سے واقفیت کا اظہار کیا تھا۔ بہر حال! میں آپ کا شکر گزار ہوں اور شرمندگی کا اظہار کرتا ہوں کہ میری کچھ باتوں سے آپ کی دل شکنی ہوئی۔“

مسٹر آرسن پاور کے لہجے میں شرمندگی کے آثار تھے۔ اور پھر چونکہ اب میں حقیقتوں سے واقف ہو چکا تھا چنانچہ میں بھی نرم پڑ گیا۔ ”آپ میرا تجزیہ کریں مسٹر آرسن پاور! میں صرف ایک سیاح ہوں۔ میں نے اپنی زندگی کے بیش قیمت لمحات مختلف ملکوں میں گزارے ہیں۔ خود بہتان میں، میں عجیب و غریب حالات کا شکار ہو گیا..... میں نے پرنسز، ریکا اور مسٹر ہڈ کے ساتھ گزرے ہوئے لمحات کی کہانی انہیں کہہ سنائی۔“ کیا آپ اس بات پر غور نہیں کر سکتے مسٹر آرسن پاور! کہ سکیورٹی پولیس کی تحویل میں جانے کی بجائے، میں دوبارہ اُن سے مل سکتا تھا اور میری ان کاوشوں کے جواب میں وہ مجھے کتے کی موت مار سکتے تھے۔ کیونکہ میں نے اُن کے ایک اہم آدمی کو قتل کر دیا تھا۔“

”یقیناً..... میں اس بات کا اعتراف کرتا ہوں۔“

”اور اس کے بعد جب آپ نے مجھے وان ڈارک کی حیثیت سے مخاطب کیا تو میں نے

اور کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔ پھر یہاں آنے کے بعد آپ کے ان الفاظ سے میری جو بات ہوئی، اُس کا اندازہ آپ خود کر لیجئے۔“

”سوری ڈیز! ویسے مجھے اُن لوگوں کے بارے میں کچھ اور تفصیلات بتاؤ۔“

”کیا آپ کو اپنے دشمنوں کے بارے میں خبر نہیں ہے؟“ میں نے سوال لیا تو وہ مسکرا نے لگے۔ پھر بولے۔

”دراصل میری ذمہ داریاں کچھ ایسی ہیں کہ میرے بے شمار دشمن ہو سکتے ہیں۔ اور پھر جس مشن پر میں ہندوستان گیا تھا، اس سے بہت سے لوگوں کو اختلاف تھا۔ میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ میرے قتل کی کارروائی کن لوگوں کا کارنامہ تھا؟ بہر طور! چھوڑو ان باتوں کو۔ تم میرے ذاتی مہمان ہو اور میں تم سے معافی مانگ چکا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ تم طویل عرصہ سان بوتو میں قیام کرو۔ مجھ سے جو چاہو حاصل کرو۔ میں تمہارے بارے میں بھی جاننا چاہتا ہوں کہ تم کون ہو اور تمہاری زندگی کیا ہے؟ یہ تمام چیزیں دوستی کی بنیاد پر میں تمہیں پیش کرنا چاہتا ہوں اور مجھے یقین ہے کہ اب تم دل سے ساری باتیں فراموش کر کے میری دوستی قبول کر لو گے۔ کیا میں یقین کر لوں میرے دوست! کہ تم نے اپنے ذہن سے ساری کبیدگی دور کر لی؟“

میں نے مسکرا کر گردن بلائی اور آہستہ سے بولا۔ ”میں اپنی اس چھوٹی سی کاوش کا کوئی صلہ وصول کرنا نہیں چاہتا۔ عرض کر چکا ہوں کہ ایک سیاح ہوں۔ دنیا گردی کرتا پھر رہا ہوں۔ ہندوستان میں تھا، وہاں سے کہیں اور نکل جاتا۔“

”تو پھر تمہاری اس سیاحت میں سان بوتو کی سیاحت بھی شامل ہو جانی چاہئے۔ لیش خود بھی مہم جو ہے اور میں یقین رکھتا ہوں کہ وہ اپنے باپ کے محسن کو کہیں بھی کوئی تکلیف نہیں ہونے دے گی۔ جہاں تک ہوٹل ایشیانو میں رہنے کا تعلق ہے، اب تمہیں وہاں رہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ لیش تمہاری واپسی کا بندوبست کر دے گی۔“

”میرا خیال ہے اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ ایشیانو بہت خوب صورت ہے اور مجھے پسند ہے۔ آپ کی محبتوں کے سائے میں، میں وہاں بھی رہ سکتا ہوں۔“ میں نے کہا۔

”ٹھیک ہے دوست! اگر تمہاری یہ خواہش ہے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔“

”مسٹر آرسن پاور سے اس ملاقات کے بعد نوعیت ہی بدل گئی تھی۔ میں نے دل ہی دل

میں سوچا کہ کیا حرج ہے؟ زندگی جب تک کوئی دوسری پٹری نہ بدلے، لیشی کے ساتھ گھومنا پڑنا لکشی کا باعث ہو سکتا ہے۔ اور یوں بھی اب میں زندگی کی اقدار تو کھو چکا تھا۔ تقدیر نے جو کچھ مجھے دیا تھا، وہی میری عادت بن چکا تھا۔ لیشی کی دلکش شخصیت اور اُس کے گداز پرورد کو نظر انداز کرنا اس دنیا سے منہ موڑنے کے مترادف تھا۔

رات کو بہترین قسم کا ڈنر لیا گیا۔ لیشی بھی خوش نظر آ رہی تھی۔ اُس نے بھی اس بات کو قبول کرنے سے انکار نہیں کیا تھا کہ میں ایشیانو میں رہوں۔ کھانے کے بعد کافی دیر تک تلف موضوعات پر گفتگو ہوتی رہی۔ میں نے جو ممالک دیکھے تھے، اُن کے بارے میں تفصیلات بتائیں۔ اور اس کے بعد مسٹر آرسن نے لیشی کو ہدایات جاری کیں اور لیشی نے انہیں بند کر کے گردن ہلا دی۔ پھر لیشی خود ہی مجھے ہوٹل چھوڑنے آئی تھی۔ اب وہ بے حاشا بننے لگی تھی اور تیزی سے بے تکلفی کے مراحل طے کرتی جا رہی تھی۔ ایشیانو میں وہ میرے ساتھ کافی دیر رہی۔ اور پھر واپس چلی گئی۔

اُس کی مجھ میں دلچسپی اس بات سے ظاہر ہوتی تھی کہ اگلی صبح جب میں جاگا تو وہ میرے کمرے میں موجود تھی۔ اُسے دیکھ کر میں حیرت سے اُچھل پڑا۔ میں نے دروازہ اندر سے لاک کر دیا تھا اور وہ کسی رُوح ہی کی مانند، دوسری بار بھی میرے کمرے میں گھس آئی تھی۔ پہلے تو میں اُس سے اُس کی اس طرح آمد کے بارے میں پوچھنا بھول گیا تھا۔ لیکن اب اُسے دیکھ کر مجھے اچنبھا ہوا اور میں اُٹھ کر بیٹھ گیا۔

”مائی گاڈ! اس کا مطلب ہے کہ تم مافوق الفطرت ہو۔“

”کیوں؟“

”تم دوسری بار اس طرح میرے کمرے میں آگئی ہو۔ آخر کیسے؟“

”ایسے.....“ اُس نے ایک چابی نکال کر میرے سامنے رکھ دی اور دروازے کے تالے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ ”یہ لاک دونوں طرف سے کھولا جاسکتا ہے۔“

”جئے؟“ اور پھر مسکراتے ہوئے بولی۔ ”میں نے ناشتے کے لئے کہہ دیا ہے۔ میں نے بھی نہیں کیا۔“

میں مسکراتا ہوا غسل خانے کی جانب بڑھ گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد ہم ناشتہ کر رہے تھے۔

طرح ایڈونچر رہتا ہے۔ جب کہ بند گاڑی بہت سی آسانیوں کا سبب بن جاتی ہے اور مہمانی سفر میں جب تک آسانیوں سے دور نہ رہا جائے، مزہ نہیں آتا۔“

”تو تم اس سفر کی تیاریاں کر چکی ہو؟“

”ہاں! میں خود بھی ان دنوں بڑی بوریٹ کا شکار تھی۔ لیکن کسی اچھے ساتھی کے بغیر کسی بھی قسم کی تفریح میں لطف نہیں آتا۔ بس! اب تم تیار ہو جاؤ۔ افریقہ تمہارا منتظر ہے۔“ لیشی نے کہا اور میں گہری سانس لے کر مسکرائے لگا۔

”افریقہ.....“ میں نے آہستہ سے کہا۔

لیشی سفر کی تفصیلات ترتیب دے کر آئی تھی۔ اُس نے بتایا کہ گھوڑوں کے ذریعے سان بوتو کی نواحی بستی پہنچیں گے اور وہاں سے دریائے بوناٹا کے ذریعے سفر کیا جائے گا.....

”میں دعوے سے کہہ سکتی ہوں کہ تم نے دورانِ سیاحت بڑے بڑے ملکوں اور شہروں کو دیکھا ہوگا۔ لیکن سرزمینِ افریقہ پر دریائے بوناٹا میں سفر کر کے تم ایک انوکھی فرحت محسوس کرو گے۔ یہاں کی زندگی خوفناک ہے۔ لیکن اس میں قدم قدم پر زندگی اور موت کے درمیان جو آنکھ مچولی کھیلی جاتی ہے، وہ انسانی زندگی کے لئے سب سے دلکش لمحات کی حیثیت رکھتی ہے۔“

”مم..... موت.....“ میں نے بوکھلائے ہوئے انداز میں کہا اور لیشی ہنس پڑی۔

”ہاں..... موت..... موت کو اتنے قریب سے دیکھنے میں جو لطف حاصل ہوتا ہے وہ کسی اور چیز میں نہیں ہوتا۔“

”تم خاصی خوفناک معلوم ہوتی ہو لیشی!“

”کم از کم اس سلسلے میں اگر تم مجھے خوفناک کہنا چاہو تو کہہ سکتے ہو۔ میں خطرات سے کھیل کر ہی زندہ رہ سکتی ہوں۔“

”اور میں خطرات سے کھیلتا ہوا زندہ ہوں۔ لیکن یہ خطرات خود بخود مجھ تک پہنچ جاتے ہیں۔ بلکہ یوں سمجھ لو! کہ کبھی میرا پیچھا نہیں چھوڑتے۔ میں اُن سے بھاگتا ہوں لیکن یہ میری دُم میں اٹکے رہتے ہیں۔ کبھی کسی شکل میں اور کبھی کسی شکل میں.....“

”تب تو تمہاری ان سے دوستی ہو چانی چاہئے۔ جبکہ تم گھبراہٹ کا مظاہرہ کر رہے ہو۔“

”نہیں..... یہ کم از کم میرے ایک طرفہ دوست ضرور ہیں۔ یعنی میں ان کی طرف نہیں

بڑتا لیکن یہ مجھ سے دور نہیں جاتے۔ ویسے ہمیں کب چلنا ہے؟“

”اب سے تھوڑی دیر کے بعد۔ میں پاپا سے اجازت لے کر آتی ہوں۔“

”یعنی..... یعنی بالکل تیار؟“

”ہاں! بالکل تیار.....“ لیشی نے ایک ادا سے گردن جھٹکتے ہوئے کہا اور میں پر خیال انداز میں گال کھجانے لگا۔

یہ پہلا موقع تھا کہ میں تفریحی انداز میں کسی مہم پر روانہ ہو رہا تھا۔ اور اس میں میری کوئی مجبوری شامل نہیں تھی۔ یہ تبدیلی ہی کم از کم پر سکون تھی۔ لیشی میرے ساتھ ہوٹل سے نکل آئی۔ کمرہ چھوڑا نہیں گیا تھا۔ ظاہر ہے لیشی ایک بڑے باپ کی بیٹی تھی اور اُس بڑے باپ نے میرے سلسلے میں اُسے ہر طرح کی اجازت دے رکھی تھی۔ وہ مجھے ساتھ لئے ہوئے بازار میں آئی اور درحقیقت تھوڑی دیر کے لئے مجھے شرمندہ ہی ہونا پڑا۔ کیونکہ اُس نے کچھ دوسری خریداریوں کے ساتھ میرے لئے بھی چند چیزوں کی خریداری کی تھی۔ جن میں لباس وغیرہ شامل تھے۔ پھر وہ بستی کے اُس حصے میں آگئی جہاں میں پہلے بھی آچکا تھا اور اُس نے یہاں سے دو گھوڑے حاصل کئے۔ مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ گھوڑے کرائے پر حاصل کئے گئے ہیں۔ اُس نے خود ہی مقامی لوگوں سے اس سلسلے میں گفت و شنید کر لی تھی۔ ایک تیسرا آدمی بھی ہمارے ساتھ تھا جو تیسرے گھوڑے پر سوار تھا۔ جب ہم بستی سے باہر نکلے تو میں نے لیشی سے پوچھا کہ کیا یہ شخص گائیڈ کے طور پر ہمارے ساتھ رہے گا؟ تو لیشی نے جواب دیا کہ نہیں یہ اُس بستی تک ہمارے ساتھ جائے گا جہاں ہم گھوڑے چھوڑ دیں گے اور دریائے بوناٹا میں سفر کریں گے۔ یہ شخص وہاں سے گھوڑے واپس لے آئے گا۔

”دریائے بوناٹا میں سفر کا ذریعہ کیا ہوگا؟“ میں نے سوال کیا۔

”افریقی وحشیوں کی بنائی ہوئی چھوٹی کشتیاں جو ہمیں وہاں سے با آسانی حاصل ہو جائیں گی۔“ لیشی نے جواب دیا۔

میں ایک لمحے کے لئے واقعی سوچ میں ڈوب گیا تھا۔ لیشی تو افریقی نژاد تھی۔ لیکن کیا کشتیوں کا سفر باعث دلچسپی ہوگا؟ کہیں لینے کے دینے نہ پڑ جائیں۔ لیکن اب کسی لڑکی کے سامنے اس بزدلی کا اظہار بھی مناسب نہیں تھا۔ گھڑسواری میں مجھے کوئی دقت نہیں ہو رہی تھی کیونکہ میں پہلے بھی اسے بھگت چکا تھا۔ آبادیاں دور رہ گئیں تو افریقہ کی روایتی زندگی کا

آغاز ہو چکا تھا۔ ہمیں چھوٹی چھوٹی بستیاں نظر آئیں۔ بعض ایسی تھیں جن میں صرف آٹھ دس مکانات ہی تھے اور ان کے درمیان رہنے والے آپس ہی میں میل جول کی زندگی گزار رہے تھے۔ ہم قریب سے گزرتے رہے اور کوئی پانچ گھنٹے کے سفر کے بعد ایسی بستی میں پہنچ گئے جو تقریباً چار پانچ سو مکانات پر مشتمل تھی۔ رات ہمیں یہیں گزارنی پڑی۔

دوسری صبح لیشی نے کشتی کے حصول کے لئے کوششیں شروع کر دیں۔ وہ شخص دونوں گھوڑے لے کر واپس چلا گیا تھا جو اس بستی تک ہمارے ساتھ آیا تھا۔ لیشی نے ایک چھوٹی کشتی جو درخت کے تنے کو کھوکھلا کر کے بنائی گئی تھی، حاصل کر لی اور سامان کے تھیلے کشتی میں منتقل کر دیئے گئے۔

دریائے بوناٹا ہمارے سامنے بہہ رہا تھا۔ اُس کی روانی بہت زیادہ تند نہیں تھی۔ لیکن پھر بھی اچھی خاصی تھی۔ لیشی نے مجھے بتایا کہ وہ کشتی رانی کی ماہر ہے۔ اُس کی مہارت تسلیم کرنے کے علاوہ اور کوئی چارہ کار بھی نہیں تھا۔ اُس نے ایک جگہ جا کر لباس تبدیل کیا۔ اب وہ ایک ڈھیلی ڈھالی پتلون اور سرخ رنگ کی بشرٹ پہن کر ایک سیاح کی حیثیت اختیار کر چکی تھی۔ ویسے اُس کے وجود کی دلکشی کا میں دل سے معترف ہو گیا تھا۔ سر کے بالوں کو اُس نے ایک سرخ رومال سے باندھ لیا تھا۔

ہم نے کشتی دریا میں دھکیلی اور اُچھل کر اُس پر سوار ہو گئے۔ ہماری اس مہم کا آغاز ہو گیا تھا۔ پتہ نہیں کتنے گھنٹے تک کشتی دریا میں سفر کرتی رہی۔ جب شام کے سائے گہرے ہو کر رات میں تبدیل ہونے لگے تو ہم نے ریتلے ٹاپو کا رخ کیا۔ لیشی کے انداز سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ ایسی مہمات کی عادی ہے۔ اُس نے لکڑیاں جلا کر مچھلی اور مکئی کے دانے بھونے۔ یہ چیزیں وہ ڈبوں میں بند کر کے لائی تھی۔ میں نے یہ غذا کھائی تو بڑا ہی لطف آیا۔ اور اب میں ذہنی طور پر اس مہم جوئی کے لئے تیار ہو چکا تھا۔ پھر لیشی نے ربڑ کا بستر بچھا دیا اور بڑے اطمینان سے لیٹ گئی۔ میں نے کن انکھیوں سے اُسے دیکھا۔ لیکن اُس کے چہرے پر کوئی خاص بات نہیں پائی۔ کافی رات تک وہ مجھ سے باتیں کرتی رہی اور پھر سو گئی۔ مجھے تعجب ہو رہا تھا کہ کیا وہ اتنی ہی معصوم ہے کہ اُسے میری قربت کا احساس نہیں یا پھر وہ میری طرف سے کسی تحریک کی منتظر ہے؟

وہ ساری رات سکون سے سوتی رہی تھی۔ مجھے بھی کسی وقت نیند آ گئی۔ صبح ہم دونوں

ساتھ ہی جاگے تھے۔ کیفیت شرمساری کی سی تھی۔ لیکن اس کے بعد لیشی نے کسی اور ذہنی ہیئت کا اظہار نہیں کیا اور ہم نے ضروری تیاریوں کے بعد دوبارہ ڈونگی پر سفر شروع کر دیا۔ دوپہر کے بعد ہم اُس دریا کے دو شاخے پر پہنچے۔ ایک شاخ نہایت پرسکون تھی اور دوسری بہت تیز۔ میں نے لیشی کی جانب دیکھا تو وہ مسکرا دی اور اُس نے معنی خیز لہجے میں کہا: ”تمہیں دریا کی تیز روانی پسند ہے یا اس کا پرسکون انداز؟“

”میں اس کا کوئی جواب نہیں دوں گا۔“

”میں تو تیز دھاروں پر بہنا چاہتی ہوں۔“ اُس نے کہا اور میں نے شانے ہلا دیئے۔ لیکن اُس نے دوبارہ پوچھا۔ ”تم نے اپنا خیال ظاہر نہیں کیا۔“

”میں تمہارے ساتھ ہوں۔“ میں نے کہا۔

لیشی نے فوراً کشتی کا رخ تبدیل کر دیا۔ ایک لمحے کے لئے ہوا تو کھسکی تھی۔ لیکن اب ایسا بھی کیا جو ہو گا، دیکھا جائے گا۔ ہم تیز رفتار شاخ کے ذریعے آگے بڑھتے رہے۔ بجائے اڑتی ہوئی لہریں اُچھل اُچھل کر کشتی میں آرہی تھیں۔ کہیں کہیں بھنور بھی اُٹھ رہے تھے۔ اور انہیں دیکھ کر میری آنکھیں دہشت سے بند ہوئی جا رہی تھیں۔ لیکن لیشی نے کشتی رانی کے بارے میں سچ کہا تھا۔ وہ ان بھنوروں سے بچتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی اور اپنی کشتی رانی کی مہارت کا ثبوت دے رہی تھی۔

دوسری شام ہم نے پھر دریا کے کنارے کا رخ کیا۔ یہاں ہمیں ایک چھوٹی سی بستی نظر آئی جہاں کے لوگ کافی وحشی معلوم ہوتے تھے۔ اُن کے دانت بہت تیز اور نوکیلے تھے۔ میں سے گفتگو کر کے وہ لوگ وہاں سے چلے گئے۔

لیشی مجھ سے مخاطب ہوئی۔ ”یہ مہمان نواز ہیں اور ہمیں رات کو اپنی بستی میں ٹھہرانا ہوتا ہے۔ میرا خیال ہے اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔“

”اگر تم سمجھتی ہو کہ کوئی حرج نہیں ہے تو ٹھیک ہے۔“

”ظاہر ہے ڈیز ڈارک! ہم اُن کی زندگی دیکھنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ ان کے درمیان نہایت ہی نہیں ہو گا۔“

”ایک بات پر اعتراض کرنا چاہتا ہوں لیشی۔“ میں نے کہا۔

”اوہ..... کہا؟“ لیشی چونک کر مجھے دیکھنے لگی۔

”تم مجھے مسلسل ڈارک کہہ کر مخاطب کر رہی ہو۔ جبکہ میں کسی طرح بھی ڈارک نہیں ہوں۔“

لیشی ہنس پڑی۔ پھر بولی۔ ”مجھ سے منصور بنتا نہیں۔ تاہم اگر تمہاری یہ خواہش ہے تو میرا تلفظ غلط ہوگا۔ لیکن میں تمہیں منصور ہی کہوں گی۔“

”اس کے لئے میں تمہارا پیشگی شکر یہ ادا کرتا ہوں۔“

لیشی نے بتایا کہ آنے والے گاؤں میں ہمارے بارے میں اطلاع دینے کے لئے گئے ہیں اور اب گاؤں کے لوگ ہمارے استقبال کے لئے آتے ہی ہوں گے۔ لیشی کا کہنا غلط نہ ہوا۔ تقریباً بیس پچیس افراد کا گروہ ہمیں لینے کے لئے چلا آیا۔ وہ لوگ لیشی سے باتیں کر رہے تھے۔ اور اس کے بعد ہم اُن کے ساتھ چل پڑے اور ایک ایسی جگہ پہنچ گئے جہاں بے شمار لوگ آگ کے گرد بیٹھے ہوئے تھے اور آگ پر کوئی چیز بھون کر کھا رہے تھے۔ انہوں نے ہمیں بھی اپنے قریب بیٹھنے کی پیشکش کی اور لیشی اُن کے ساتھ ہی پالتی مار کر بیٹھ گئی۔ میں خود بھی اُسی انداز میں بیٹھ گیا تھا۔ پھر میں نے اس پر غور کیا کہ وہ لوگ، آگ سے کیا نکال کر کھا رہے ہیں؟ اپنے قریب ہی بیٹھے ہوئے شخص کے ایک ہاتھ میں، میں نے وہ چیز دیکھی جو راکھ سے نکالی تھی تو دہشت سے میرا خون رگوں میں منجمد ہو گیا۔ وہ ایک ادھ جلا انسانی پنجہ تھا۔ میرا بدن تھرا اٹھا۔ ایک لمحے میں خیال گزرا کہ یہ آدم خور ہیں۔ میں نے دہشت بھری نگاہوں سے لیشی کو دیکھا تو اُس نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

”پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ غور سے دیکھو۔ یہ انسانی ہاتھ نہیں ہے۔“

”تب؟“ میں نے متحیرانہ انداز میں پوچھا۔

”یہ لوگ بندروں کے رسیا ہیں۔ چھوٹی بڑی نسل کے بندر انہیں دیکھ کر دُور بھاگتے ہیں۔ یہ قبیلہ تو ساناہ ہے۔ اور تو ساناہ قبیلے کے لوگ بندروں کی ضیافت کو اولین ترجیح دیتے ہیں۔“

لیشی کی بات پر میرے منہ کا مزا خراب ہو گیا تھا۔ مجھے سخت گھن آ رہی تھی۔ اُسی وقت ایک شخص ہمارے لئے بھی بندر کی ایک لاش اٹھا لیا اور لیشی سے کچھ کہنے لگا۔ لیشی نے مسکراتے ہوئے گردن خم کر دی اور پھر میری طرف دیکھ کر بولی۔ ”کیا تم بندر کھانا پسند کرتے؟“

”میرا تو دل اُلٹ رہا ہے۔ براہ کرم! یہاں سے ہٹ جاؤ۔“

”نہیں نہیں..... ہمیں مجبور نہیں کیا جائے گا۔ یہ ان کی طرف سے ہمارے لئے ایک تحفہ ہے۔“

”کیا تم بھی اس ضیافت کو پسند کرتی ہو؟“

”میں نے آج تک تو ساناہ قبیلے کی میزبانی کا شرف حاصل نہیں کیا۔ بس! اُن کے بارے میں سنا ہے۔ دیکھو! وہ بندر کی لاش پکا رہے ہیں۔“

میں اُن کی جانب متوجہ ہو گیا۔ ہر چند کہ طبیعت اوب رہی تھی۔ لیکن افریقی روایتوں کو دیکھنے کا شوق بھی دل میں تھا۔ لیشی نے اپنے پاس بیٹھے ہوئے شخص سے مقامی زبان میں کچھ کہا اور وہ چیخ چیخ کر دوسرے لوگوں سے کچھ کہنے لگا۔ متحرک لوگ رُک گئے اور ہماری طرف دیکھنے لگے۔ پھر ایک بوڑھے وحشی نے انہیں کچھ سمجھایا اور وہ خاموش ہو گئے۔ لیشی مجھے بتا رہی تھی کہ وہ اس بات کو پسند نہیں کر رہے کہ ہم نے ان کی ضیافت قبول نہیں کی۔

”کیا یہاں سے اٹھا جاسکتا ہے؟“

”اگر تم چاہو تو ٹھیک ہے۔“ لیشی نے جواب دیا اور پھر مقامی زبان میں اجازت لی۔ ہم وہاں سے اٹھ کر ایک جھونپڑے میں آ گئے جو ہمارے لئے بنایا گیا تھا۔ جھونپڑے میں گھاس پھوس کا بستر تھا۔ لیشی نے مسکراتی نگاہوں سے مجھے دیکھا اور بستر پر لیٹ گئی۔ اُس کے دیکھنے کا انداز بھٹکا دینے والا تھا۔ لیکن میں نے بھی تہیہ کر لیا تھا کہ اپنے آپ پر جر کروں گا اور کسی بھی ایسی کمزوری کا مظاہرہ نہیں کروں گا جو میرے لئے وبال جان بن جائے۔

رات گزر گئی اور صبح ہم اُن سے رخصت ہو کر اپنے سفر پر چل پڑے۔ اب دریا کی رفتار سست ہوتی نظر آ رہی تھی۔ کشتی کی رفتار بھی مدہم پڑ گئی تھی۔ لیشی جو خوراک اپنے ساتھ لائی تھی اُس میں چاول، مچھلی کے ڈبے، گوشت کے ٹکڑے موجود تھے۔ سکٹ بھی تھے۔ البتہ پائے یا کافی وغیرہ کا اُس نے کوئی بندوبست نہیں کیا تھا۔ بیوقوف لڑکی اگر مجھ سے مشورہ کرتی تو میں اُس کا انتظام ضرور کرتا۔ لیکن اب کیا، کیا جاسکتا تھا؟

سفر جاری رہا۔ اور پھر ایک دن ہمیں دریا کے کنارے بڑی بلیں نظر آئیں جو پیٹھے جیسے پھل سے لدی ہوئی تھیں۔ میں نے کشتی وہاں رُکوائی، پھل توڑے، انہیں چکھ کر دیکھا تو

لطف ہی آگیا۔ بہت لذیذ اور شیریں تھے۔ رنگت اوپر سے پیٹھوں جیسی تھی۔ لیکن اندر سے خربوزے جیسے تھے۔ نرم اور لذیذ۔ پھر ایک اور بستی پہنچے اور رات گزارنے کے بعد دوسری صبح پھر آگے بڑھ گئے۔

میں بھی اب یہاں کے ماحول میں کافی دلچسپی لینے لگا تھا۔ افریقہ کی وہ انوکھی زندگی جو وحشت سے بھرپور ہے، میری نگاہوں کے سامنے تھی۔ زہریلی مکھیوں کے غول کبھی کبھی ہماری کشتی پر پرواز کرنے لگتے تھے۔ ایک دو بار ان مکھیوں نے کانٹے کی کوشش بھی کی۔ ہم نے اپنے لباس چوون میں باندھ لئے اور ان مکھیوں کو اڑانے کی کوششوں میں مصروف ہو گئے۔ بمشکل تمام ان کی زد سے بچ سکے تھے۔ دو دن کے بعد دریا کا بہاؤ پھر تیز ہو گیا۔ میں نے لیشی سے پوچھا۔

”اس میں کوئی شک نہیں کہ صحرائے اعظم کی زندگی انسانی تصورات سے کہیں آگے کی چیز ہے۔ اب تک میں نے جو کچھ دیکھا، وہ انتہائی باعث دلکشی ہے۔ لیکن کہیں ایسا نہ ہو کہ کسی ایسی نامعلوم سمتوں کی طرف جانکلیں جہاں سے واپسی ممکن نہ ہو سکے۔“

لیشی نے ہنس کر کہا۔ ”نہیں ڈیئر منصور! ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ ابھی تو ابتدائی حصہ ہے۔ یہاں سے آگے جانے کے بعد ہمیں ایک بڑی آبادی بونیکا ملے گی۔ وہاں باقاعدہ مہذب نظام قائم ہے۔ وہاں ہم قیام کریں گے۔ میرے پاس تمام نقشے موجود ہیں۔ ابھی تو ہم نے اس سفر کا آغاز کیا ہے۔ صحیح معنوں میں افریقہ کی ہیبت ناک زندگی تو آگے نظر آئے گی۔“

بونیکا کا فاصلہ ابھی جانے کتنا تھا؟ میں اُس ہیبت ناک زندگی کے بارے میں سوچ رہا تھا جس کی نشاندہی لیشی نے کی تھی۔ وہ تو مقامی تھی۔ مگر میں اس ہیبت ناک زندگی کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ لیکن پھر دل کو یہ کہہ کر سمجھا لیا کہ حرج ہی کیا ہے؟ کون سے میرے پیارے میری واپسی کا انتظار کر رہے ہوں گے۔ جدید دنیا کی رنگینیاں تو دیکھ ہی لی تھیں۔ اب انسانی نگاہوں سے دُور صحرائے اعظم کے یہ مناظر بھی دیکھ لئے جائیں۔ اور اگر موت ہی اس طرف لے آئی ہے تو پھر یہی سہی۔ ایسی کوئی جگہ بھی پسند نہیں تھی جہاں مرنے کا تصور بھی کیا جاسکے۔ چنانچہ میں نے اپنے آپ کو ان معاملات سے بے نیاز کر لیا۔

لیشی ابھی تک کسی ایسی کیفیت کی حامل ثابت نہیں ہوئی تھی جو باعث توجہ ہوتی۔ وہ ایک

بے تکلف دوست کی حیثیت سے میرے ساتھ سفر کر رہی تھی۔ بارہا ایسے دلکش مراحل سامنے آئے جو ہیجان کن ہوتے تھے۔ لیکن اس وقت میری گہری نگاہیں لیشی کا جائزہ دیتے لگتی تھیں۔ اور مجھے محسوس ہوتا کہ وہ اپنی اس کیفیت سے بالکل ہی بے نیاز ہے۔

ایک جگہ دریا کا پاٹ اتنا چوڑا تھا کہ سمندر کا گمان ہوتا تھا۔ نگاہوں کی آخری حد پر ایک کیر کے سوا کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ کہیں کہیں دریا میں چھوٹے چھوٹے ٹاپو بھی آ جاتے۔ ان ٹاپوؤں میں سے بعض پر آبادیاں بھی تھیں جن کے بارے میں لیشی نے مجھے بتایا کہ یہاں پھرے رہتے ہیں۔ اکثر غیر آباد ٹاپو جو سفید رنگ کی ریت اور سرسبز درختوں سے ڈھکے نظر آتے تھے، ہمارے بالکل قریب سے گزر جاتے۔ پھر ہم نے بہت دُور سے دُھوئیں کے بادل دیکھے اور میں نے لیشی کو اس طرف متوجہ کیا۔ درخت جل رہے تھے۔ راکھ اور دھواں کے بادل دریا پر چھانے لگے۔ لیشی بھی اُدھر دیکھنے لگی۔ پھر اُس نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔

”یہ خشک جنگل ہے۔ میں اس علاقے کے بارے میں جانتی ہوں۔ یہاں بارش نہیں ہوتی۔ اور یہاں کی زمینیں بارش نہ ہونے کی وجہ سے تپ تپ کر سیاہ ہو چکی ہیں۔ آؤ! ان کے قریب چلتے ہیں۔ ویسے یہ بونیکا کا عقبی علاقہ ہے۔ لیکن دریا کے راستے ہمیں کافی گھوم کر بونیکا کے سامنے والے حصے تک جانا ہو گا۔ آؤ! اس ماحول سے لطف اٹھائیں۔ میں نہیں اس کے بارے میں بتاؤں گی۔“

کشتی کنارے کی جانب چل پڑی۔ لیشی کا کہنا بالکل درست تھا۔ درختوں کے جلے ہوئے کالے ڈھانچے بے حد خوفناک نظر آ رہے تھے۔ ہم زمین پر اترے تو میرے پاؤں بجے لگے۔ زمین اتنی ہی گرم ہو رہی تھی۔

لیشی نے مجھے بتایا کہ ان جنگلوں کو بونیکا کے باشندوں نے جان بوجھ کر نذر آتش کر دیا ہے۔ یہ لوگ اناج بونے کے لئے زمینیں صاف کرتے ہیں۔ سیلاب کے دنوں میں جب یہ زمینیں زیر آب آ جاتی ہیں تو مچھلیاں جھاڑیوں اور درختوں کی جڑوں میں پناہ لے لیتی ہیں۔ انہیں ان میں نہیں پھنستیں۔ چنانچہ ان علاقوں کو اس مقصد کے لئے بھی صاف کیا جاتا ہے۔

ہم نے ایک دن موت کے اس جنگل میں گزارا۔ گرمی کی وجہ سے زبانیں خشک ہو رہی تھیں۔ لیکن مہم جو لیشی، ہر ماحول سے روشناس ہونا چاہتی تھی۔ افسوس! اُسے اپنے ساتھی کی

دلچسپیوں کا اندازہ نہیں تھا۔ دوسری صبح ہم جلد از جلد وہاں سے آگے بڑھ گئے اور پھر دریا کے راستے بونیکا پہنچ گئے۔

بونیکا کے اطراف دریا میں کشتیاں نظر آرہی تھیں۔ میں نے ایک موٹر بوٹ کے انجن کی آواز بھی سنی۔ اُس کے بارے میں لیشی سے استفسار کیا تو پتہ چلا کہ محافظ پولیس ہے۔ اس عجیب و غریب آبادی میں پولیس کا نام ہی مضحکہ خیز معلوم ہوتا تھا۔ لیکن اُس کی موجودگی کو نظر انداز بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔

”کیا پولیس ہم سے تعرض کرے گی؟“ میں نے لیشی سے سوال کیا۔

”نہیں۔ لیکن یہاں سے ہمیں دریائی سفر کا اجازت نامہ حاصل کرنا ہوگا۔ میں اس کے لئے انتظامات کر کے آئی ہوں۔“

”یوں لگتا ہے جیسے تم ان علاقوں میں پہلے بھی آ چکی ہو۔“

”نہیں۔ اس طرف نہیں آئی۔ میں نے دوسری سمت کافی سفر کیا ہوا ہے۔ لیکن یہاں کے بارے میں مجھے اتنی معلومات حاصل ہیں کہ مجھے ان میں سے کوئی بھی چیز اجنبی محسوس نہیں ہوتی۔ اور پھر میں نے پاپا سے اس سفر کے بارے میں تمام تفصیلات پوچھ لی تھیں۔ ہماری ایک آیا ہے جو ایسی ہی ایک اندرونی بستی سے تعلق رکھتی ہے اور کافی تعلیم یافتہ ہے۔ اُس نے لندن میں تعلیم حاصل کی ہے۔ کہنے کو وہ ہماری آیا ہے۔ لیکن اُس نے افریقہ کے اُن علاقوں کے بارے میں باقاعدہ مضامین لکھے ہیں اور ان مضامین میں اُس زندگی کا بڑی تفصیل سے تذکرہ کیا ہے۔ اس طرف سفر کرتے ہوئے میں نے اُس سے بہت سے مشورے لئے ہیں۔“

”میں تو سمجھ رہا تھا کہ یہ چند گھنٹوں کا یا زیادہ سے زیادہ سے زیادہ چند دنوں کا عام سا سفر ہوگا۔ لیکن یوں لگتا ہے جیسے تم کافی طویل پروگرام بنا کر نکلی ہو۔“

لیشی نے مسکراتے ہوئے کہا کہ وہ اپنے ڈیڈی سے دو ماہ کی اجازت لے کر نکلی ہے۔ میری آنکھیں یہ سن کر حیرت سے پھیل گئیں۔ ”دو ماہ..... اور دو ماہ ہم اسی طرح گزاریں گے؟“

”مہم جوئی کا لطف اُسی وقت آتا ہے ڈیر منصور! جبکہ ہمیں اپنے آئندہ قدم کے بارے میں کچھ بھی نہ معلوم ہو۔ کیا تم مجھ سے متفق نہیں ہو؟“

میں اپنے آپ ہی سے متفق نہیں تھا تو بھلا اُس سے کیا ہوتا؟ چنانچہ میں نے اپنے آپ کو پیدائشی متفق ظاہر کرنے کے لئے زور زور سے گردن ہلا دی۔

ہم لوگ ایک ایسے کیمپ میں پہنچ گئے جو بونیکا کا سرکاری کیمپ تھا۔ لکڑی کی بنی ہوئی برقی میزیں اور سٹول وہاں رکھے ہوئے تھے اور اُن پر بونیکا کے عہدے دار بیٹھے ہوئے تھے۔ ماحول کافی مہذب نظر آ رہا تھا۔ لیشی پاور نے اُن عہدیداروں سے گفتگو کی اور وہاں سے آگے جانے کا اجازت نامہ مل گیا۔

بونیکا سے ہم نے کھانے پینے کی اشیاء کا کافی ذخیرہ خریدا۔ لیشی اس خرید و فروخت کا نظام کر کے آئی تھی۔ اور اس کے بعد ہم لوگ وہاں سے آگے بڑھ گئے۔ اب دریا کا منظر ہوتا جا رہا تھا۔ کناروں کے ساتھ ساتھ اونچی نیچی بے ترتیب پہاڑیوں کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ بعض نشیبوں میں سرسبز گھاس نظر آرہی تھی۔ درختوں کے جھنڈ دریا کے کنارے کنارے تک پھیلے ہوئے تھے۔ ناریل کے درخت یہاں نمایاں تھے۔ البتہ دریا کا پاٹ پتھریلے کناروں کی وجہ سے تنگ ہو گیا تھا۔

ہماری کشتی اب دریا کے تیز دھاروں میں بہنے لگی تھی۔ ارد گرد دریا کا پانی جیسے اُبل رہا تھا۔ آگے بھنور بھی نظر آنے لگے اور چند لمحوں کے بعد ہم اُن کے قریب پہنچ گئے۔ یہاں کشتی نے اپنے آپ کو سنبھالے رکھنا انتہائی مشکل ثابت ہوا۔ کشتی بھنور کے اندر داخل ہوتے ہی بہر کھانے لگتی۔ ایک بھنور سے نکلتے تو دوسرے میں پھنس جاتے۔ بھنور سے نکلنے کے بعد اُس چوڑوں کو تیزی سے چلانا پڑتا اور درحقیقت یہاں پہنچنے کے بعد میری ہمت جواب دینا جا رہی تھی۔ لیکن خوش قسمتی تھی کہ جلد ہی آخری بھنور بھی پیچھے رہ گیا۔ چٹانوں کے میان ایک تنگ سی آبنائے نے ہمیں اپنی آغوش میں سکون بخشا اور اُس کے بعد ہم اُسے پر سکون سفر کرنے لگے۔

سفر ایک ایسی جگہ ختم ہوا جہاں دریا کے کنارے کنارے بے شمار جھونپڑیاں پھیلی ہوئی تھیں۔ جھونپڑیوں کے دوسری طرف گھنا اور سرسبز جنگل تھا۔ یہ جنگل جھونپڑیوں سے کافی اونچے پر جا کر شروع ہوتا تھا۔ درمیان میں انسانی قد سے اونچی گھاس پھیلی ہوئی تھی جو لوگوں سے دیکھنے پر ترش ہوئی اور ہموار محسوس ہوتی ہوگی۔ کہیں سے ڈھول بجنے کی آواز آ رہی تھی۔ جھونپڑیوں میں چربی سے جلنے والی مشعلیں روشن تھیں۔

ہم نے کشتی کنارے پر کھینچ لی اور اُسے ایک ابھری ہوئی چٹان میں اٹکا کر آگے بڑھ گئے۔ جھونپڑیوں کی قطار کے پاس پہنچے تو اندازہ ہوا کہ جھونپڑیاں خالی پڑی تھیں۔ لیکن ہوا کے دوش پر ڈھول کی تال اور انسانی آوازیں ہم تک پہنچ رہی تھیں۔ چنانچہ ہم نے بھی اسی جانب رخ کیا۔

زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ ہم اُس جگہ پہنچ گئے جہاں مشعلوں کا ایک بڑا سادہ نظر آ رہا تھا۔ اس دائرے میں رقص کیا جا رہا تھا۔ غالباً یہ کوئی چھوٹا سا گاؤں تھا۔ ہم ہمت کر کے آگے بڑھے۔ رقص کرنے والی افریقی نسل کی لڑکیاں تھیں۔ اُن کے چہروں پر نیل اور سفید چاک سے نقش و نگار بنے ہوئے تھے۔ کچھ لڑکیوں کے چہرے دو برابر حصوں میں تقسیم تھے۔ ایک حصہ نیلا اور دوسرا سفید تھا۔ رقص کرنے والی اُن لڑکیوں کے علاوہ مرد بھی اس رقص میں شامل تھے۔ ڈھول بجاتے رہے تھے اور نرسنگھے چنگھاڑ رہے تھے۔ رقص میں تیزی پیدا ہوتی جا رہی تھی۔ ڈھول بجانے والوں کے بدن پسینے سے چمک رہے تھے اور میجان خیز رقص تیز تر ہوتا جا رہا تھا۔ میں اور لیشی لوگوں کے درمیان جگہ بناتے ہوئے آگے بڑھ آئے۔ کوئی بھی ہماری جانب متوجہ نہیں ہوا تھا اور میرے لئے یہ بات ذرا باعث حیرت تھی کیونکہ ہم دونوں اُن سے مختلف تھے۔

لیشی نے آہستہ سے میرے کان میں کہا۔ ”ذرا ان رقص کرنے والوں کے بدن کی پھرتی ہوئی بوٹیاں تو دیکھو! یوں لگتا ہے کہ جسم کی بوٹی بوٹی الگ ہو جائے گی۔“

”مجھے تو کچھ اور بھی لگتا ہے۔“

”کیا؟“

”ہم جس طرح ان کے درمیان گھس آئے ہیں، اس رقص کے بعد کہیں ہمارے بدن کی بوٹی بوٹی بھی الگ نہ ہو جائے۔“

”اوہ..... نہیں! اب افریقہ اتنا غیر مہذب نہیں رہا جتنا قصے کہانیوں میں بیان کیا جا رہا ہے۔ ہاں! اس کے انتہائی اندرونی علاقے کی بات میں نہیں کرتی جہاں آدم خور وغیرہ بستے ہیں۔ باقی علاقے تہذیب کی روشنی سے کسی حد تک آشنا ہو چکے ہیں۔ اب تمہیں چھوٹے چھوٹے دیہاتوں میں بھی سکول نظر آئیں گے جہاں ملکی اور غیر ملکی مشنریاں ان لوگوں کو تعلیم دیتی ہیں۔ تم نے محسوس نہیں کیا کہ انہوں نے ہمیں اجنبی نگاہوں سے نہیں دیکھا۔ بہت سے

مشن یہاں آتے رہتے ہیں۔ بہت سے ممالک یہاں مختلف منصوبوں پر کام کر رہے ہیں۔ چینی باشندے چاک اور سیمنٹ کی فیکٹریاں چلا رہے ہیں۔ روسی ماہرین سونے کی کانیں دریافت کر رہے ہیں۔ پولینڈ والے کھاد کے کارخانے لگائے ہوئے ہیں۔ لہذا افریقہ کے علاقے اب اتنے پس ماندہ نہیں رہے۔“

ہم لوگ سرگوشیوں کے انداز میں باتیں کرتے رہے۔ رقص اپنی آخری کیفیت میں پہنچ گیا تھا۔ رقص لڑکیاں رقص کر رہی تھیں۔ اچانک میں نے ایک لڑکی کو اپنے قریب آ کر رکتے ہوئے دیکھا۔ اُس کا قد کسی بھی طرح چھ فٹ سے کم نہیں تھا۔ بدن انتہائی متناسب اور سڈول تھا۔ لمبے لمبے بال سیاہ کمر سے نیچے آ رہے تھے۔ اُس نے اپنے چہرے پر نقش و نگار بنائے ہوئے تھے۔ لیکن ایک بات ذرا حیرت ناک تھی۔ وہ یہ کہ اُس کے نقوش میں بھراپن نہیں تھا جو افریقی لڑکیوں کے چہروں میں پایا جاتا تھا۔ نہ موٹے ہونٹ نہ چوڑی ناک۔ چہرے کی بناوٹ بھی کتابی تھی۔ میں ایک لمحے کے لئے اُسے دیکھتا رہ گیا۔ لڑکی کی عجب نگاہیں مجھے اپنے دماغ میں چبھتی ہوئی محسوس ہوئی تھیں۔ وہ کوئی دس پندرہ سیکنڈ تک میرے سامنے کھڑی رہی۔ اور اُس کے بعد ڈھول کی تال پر تھرکتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔ میں نے لیشی کی طرف دیکھا۔ اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ وہ چند لمحے خاموش رہی۔ پھر بولی۔ ”آؤ..... یہاں سے چلیں منصور!“

”کیا بات ہے لیشی؟ تمہارا لہجہ کچھ عجیب سا ہو گیا ہے۔“

”نہیں۔ کوئی بات نہیں۔ بس! کچھ تھکن سی محسوس ہو رہی ہے۔ ویسے بھی اب یہ رقص ختم ہونے والا ہے۔ آخری مراحل میں ہے۔“ لیشی کے ان الفاظ کے ساتھ ہی ڈھول بند ہو گئے اور ایک دم سکوت چھا گیا۔

میں نے لیشی کا ہاتھ پکڑا اور ہم واپسی کے لئے مڑ گئے۔ وہ کچھ خاموش خاموش سی تھی۔ ہم دریا کے کنارے اُسی جگہ آ گئے جہاں ہماری کشتی موجود تھی۔ لیشی نے صاف اور ہموار بند دیکھ کر وہاں پر ڈیرہ ڈال دیا۔ کشتی سے کچھ چیزیں اتار کر زمین پر بچھا دی گئیں۔ میں نے لیشی سے پوچھا۔ ”کیا اُسے بھوک نہیں لگ رہی؟“

”اگر تم کہو تو تمہارے لئے بندوبست کر دوں؟“

”نہیں..... مجھے بھی بھوک نہیں لگ رہی۔ لیکن ایک سوال میں تم سے ضرور کروں گا۔“

”کیا؟“

”تم اچانک کچھ سنجیدہ سی ہو گئیں۔“

”ہاں..... جانے کیوں اُس لڑکی کا اچانک تمہارے سامنے اس طرح کھڑے ہو جانا، مجھے ناگوار گزرا ہے۔ عجیب سی نگاہوں سے دیکھ رہی تھی تمہیں۔ کیا تم نے محسوس نہیں کیا؟“

”ہاں! محسوس کیا تھا۔ تمہارا کیا خیال ہے، کیا بات ہو سکتی ہے؟“

”کچھ نہیں۔ یہ لوگ اب بھی کہیں کہیں پسماندہ ہیں۔ لڑکی کہیں تمہاری طرف متوجہ نہ ہو گئی ہو۔ اگر ایسا ہے تو وہ تمہارے لئے مشکل بن سکتی ہے۔“

”اوہ.....“ میں ہنس پڑا۔ ”اچھی بات ہے۔ افریقہ کی اس مہم میں کم از کم یہ تجربہ بھی ہو جائے گا۔“

لیشی نے پہلی بار ایسی نگاہوں سے مجھے دیکھا جیسے وہ کچھ کہنا چاہتی ہو۔ اُس کے ہونٹ کپکپائے اور پھر وہ ہنسنے لگی۔ ”ہاں..... ٹھیک ہے۔ اگر وہ تمہاری طرف راغب ہو جائے تو پھر تم یہیں رہ جانا۔“

”کیوں؟“

”ظاہر ہے وہ تمہارے ساتھ تو یہاں سے جائے گی نہیں۔“

”ارے باپ رے..... اس کا مطلب.....؟“

”ہاں، ہاں! کوئی حرج نہیں ہے۔ یہاں کی زندگی اتنی بری تو نہیں ہے۔“

”تم نے مجھے خوف زدہ کر دیا ہے لیشی! میں ایسا بھیاںک تجربہ بھی نہیں چاہتا۔ چلو! ابھی

اسی وقت یہاں سے نکل چلیں۔ میں خوف زدہ ہو گیا ہوں۔“

لیشی پھر ہنسنے لگی۔ ”بس! اتنی ہی دلچسپی ہے تمہیں ایڈونچر سے؟“

”ہاں! اگر صورت حال ایسی ہو تو پھر اتنی ہی دلچسپی لینا کافی ہے۔“ میں نے کہا اور وہ

ہنستی رہی۔ ہم کافی دیر تک باتیں کرتے رہے۔

پھر لیشی نے کروٹ بدلتے ہوئے کہا۔ ”مجھے نیند آرہی ہے۔“

”اوکے..... شب بخیر!“ میں نے جواب دیا اور لیشی کروٹ بدل کر گہری گہری سانسیں

لینے لگی۔

میں اُس کے انداز پر غور کر رہا تھا۔ یورپ میں لڑکیاں بہت بے باک ہوتی ہیں۔ میں

نے ایسی افریقی لڑکیوں کو بھی دیکھا تھا جو یورپ کی آبادیوں میں وہاں کے باشندوں کو بھی چھوڑ گئی تھیں۔ لیکن لیشی کے اندر ایک رکھ رکھاؤ تھا۔ بالکل مشرقیت کا حامل..... جانے کتنی دیر اُس کے بارے میں سوچتا رہا اور پھر نیند آ گئی۔

یہ اندازہ نہیں ہو سکا کہ میں کتنی دیر سویا ہوں۔ یکا یک ہی آنکھ کھل گئی تھی اور میں نے

ایک نسوانی ہاتھ کو اپنی گردن میں جھانک ہوتے محسوس کیا..... حواس جاگ گئے۔ میں نے

سوچا کہ یا تو لیشی نے سوتے میں کروٹ بدلی ہے یا پھر ماحول اُس پر اثر انداز ہو گیا ہے۔

میں نے آنکھیں کھول کر اُس کا چہرہ دیکھا۔ لیکن دوسرے لمحے میں بری طرح اُچھل پڑا۔

میرے سامنے چاند کی روشنی میں ایک چہرہ نمایاں تھا۔ آدھا سفید، آدھا نیلا..... یہ وہی لڑکی

تھی جو رقص کے دوران میرے سامنے آکھڑی ہوئی تھی۔ آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ ہو سکتا

ہے آنکھیں دھوکہ دے رہی ہوں۔ میں پھرتی سے اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس طرح اُٹھ جانے

سے اُس کا بازو میری گردن سے نکل گیا تھا۔ میں نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر لڑکی کی

طرف دیکھا۔ وہ عجیب سی نگاہوں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ اُس کی آنکھوں میں پراسرار سی

چمک تھی۔ پھر میں نے گردن گھما کر لیشی کو دیکھا جو نہایت بے ترتیبی سے سو رہی تھی۔

جنگلی لڑکی کچھ دیر اسی طرح بیٹھی مجھے دیکھتی رہی۔ پھر اُٹھ گئی۔ اور اس کے بعد اُسی

پراسرار انداز میں چلتی ہوئی وہاں سے چلی گئی..... میرے اوسان خطا تھے۔ اُس کی اس

طرح آمد، یہ بے تکلفی اور پھر خاموش واپسی بے حد پراسرار تھی۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا

تھا۔

☆.....☆.....☆

لشی پاور نے کراہ کر کروٹ بدلی تو میں ہوش و حواس کی دنیا میں واپس آ گیا۔ اُس
حسینہ کا تصور ذہن سے مٹ نہیں ہوا تھا۔ بیٹھے بیٹھے تھکن ہونے لگی تو لیٹ گیا۔ کیا فائدہ اب
ان احقانہ سوچوں میں پھنسے رہنے کا؟ وہ جو کچھ بھی چاہتی ہے اگر فطرت کے مطابق غور کیا
جائے تو کوئی عجیب بات نہیں تھی۔ لیکن میں نے کب کسی لڑکی سے آگے بڑھ کر عشق کیا تھا،
جواب کروں گا..... دیکھوں یہ لشی پاور کب تک اپنی قوتوں کو آزماتی ہے؟ اور اگر اس کی
زبان نہ کھلے تو جہنم میں جائے۔ میں بھی اُس کے لئے کون سا مرے جا رہا ہوں؟

ذہن میں سناٹے در آئے۔ نیند شاید حملہ آور تھی۔ کچی نیند جاگا تھا۔ بس اُس کی بانہوں
کا خیال آیا۔ دنیا کی کوئی بھی لڑکی ہو، اُس کے وجود کی نزاکتیں یکساں ہوتی ہیں اور ان میں
کوئی فرق نہیں ہوتا۔ بد قسمتی یہ تھی کہ ایش نے بری راہوں پر ڈال دیا تھا۔ ورنہ شاید ”ہم
بھی کام کے آدمی ہوتے“ ایش کا تصور ذہن میں آیا تو اور بھی بہت سے کردار ذہن میں
آنے لگے۔ اور پھر سب ایک دوسرے سے نبرد آزما ہو گئے۔ کوئی کسی کے بال گھسیٹ رہا
تھا اور کوئی کان۔ کسی نے کسی کی ٹانگ پکڑی ہوئی تھی تو کوئی کسی کی ناک مروڑ رہا تھا۔

میں اُلجھنوں میں گھرا کہاں سے کہاں پہنچ گیا۔ یہاں تک کہ سورج کی کرنوں نے
پپٹوں میں سرخ رنگ بکھیر دیا اور لشی پاور نے زور سے جھنجھوڑا تو میں اُٹھ گیا۔ لشی پاور کو
دیکھا اور پھر خوفزدہ نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ میں سمجھا تھا کہ وہ طلسمی حسینہ پھر سے
واپس آ گئی ہے۔ لیکن یہ بات نہیں تھی۔ طلسمی حسینہ تو نہیں آئی تھی لیکن سورج کی کرنیں
افریقہ کی روایتی گرمی جذب کر کے بدن میں چھنے لگی تھیں۔ میں بوکھلائے ہوئے انداز میں
اُٹھ کر بیٹھ گیا۔

لشی پاور نے مجھے مسکراتی نگاہوں سے دیکھا۔ ”کیا بات ہے؟ کوئی خواب دیکھ رہے
تھے؟“

”خواب.....؟“ میں نے اُلجھے ہوئے انداز میں کہا۔

”ایسا ہی لگ رہا تھا جیسے کسی بھیانک خواب سے چونک گئے ہو۔“

”آہ..... لشی پاور! بھیانک خواب تو میں جاگتی آنکھوں سے بھی دیکھتا رہتا ہوں۔“

”جاگتی آنکھوں سے تو تم صرف مجھے دیکھتے ہو۔ کیا میں کوئی بھیانک خواب ہوں؟“

”ارے نہیں..... مطلب یہ کہ صحرائے اعظم کی یہ زندگی، ہولناک واقعات، ہمارے

میرے روٹے کھڑے ہو گئے تھے۔ اُس چھٹی قیامت کو میں عقب سے دیکھتا رہا۔
پراسرار چاندنی میں وہ سست روی سے آگے بڑھ رہی تھی اور میرے وجود میں پھریریاں سی
دوڑ رہی تھیں۔ چلتے ہوئے وہ عقب سے اتنی حسین نظر آ رہی تھی کہ ذہن بھٹک جائے.....
لیکن مجھ جیسے آدمی کا ذہن کہاں بھٹکتا ہے جس کی زندگی ہی خوف و ہراس سے عبارت ہو گئی
ہو؟ میں تو اُس کے وجود کی دلکشی میں کھونے کی بجائے اپنے وجود کی سلامتی میں کھویا ہوا
تھا۔ یہ نئی مصیبت کہاں سے گلے پڑ رہی تھی؟

اب تک کی زندگی میں کبھی وہ نہیں ہوا جو میں نے چاہا تھا۔ بلکہ وقت مجھے اپنے ساتھ
لے کر سفر کر رہا تھا اور وہ جو بھی تبدیلی میرے اندر لانا چاہتا تھا، با آسانی لے آتا تھا۔ لشی
پاور کے ساتھ یہاں تک آنے کا پروگرام نہیں تھا۔ یہ سارا پروگرام اُس نے خود ہی بنایا تھا
ورنہ میں اتنا دلیر کہاں کہ صحرائے اعظم کی ان ہولناک روایات کو فراموش کر دوں جو اچھے
اچھوں کا پتا پانی کرتی ہیں۔

میں دیکھتا رہ گیا اور وہ پراسرار ساحرہ نگاہوں سے اوجھل ہو گئی۔ لشی پاور ایسے پیارے
انداز میں سو رہی تھی کہ دل خواہ دھڑکنے لگا۔ میں نے آنے والی بلا پر لعنت بھیجی۔ اس
سے بہتر تو لشی پاور کا نظارہ تھا جو چاندنی کی دُہن بنی زمین پر بے ترتیب پڑی ہوئی تھی۔
لیکن شاید دماغ میں شرافت کے کچھ ذرات اٹکے رہ گئے تھے۔ جی نہ چاہا کہ ایک سوئی ہوئی
لڑکی کو اس طرح بے جانی سے دیکھوں۔

میں اُس سے نظریں ہٹا کر پھر پراسرار ساحرہ کے بارے میں سوچنے لگا کہ یہ لڑکی تھی
کون؟ کیا چاہتی ہے یہ؟ صحرائے اعظم کی یہ حسینہ اگر لشی پاور کے بیان کے مطابق مہربان
ہو گئی تو میرا کیا بنے گا؟ کیا میری کیفیت اُن بے شمار مہم جوؤں کی سی نہ ہوگی جو کسی جنگلی
لڑکی کی قید میں زندگی کے دن تڑپ کر گزار دیتے ہیں.....

ساتھ پیش آنے والے یہ حادثات..... سب کچھ ایک بھیانک خواب ہی تو ہیں۔“ میں نے جلدی سے بات برابر کرنے کی کوشش کی۔

”خیر! اگر تم مجھے بھی ایک بھیانک خواب قرار دیتے ہو تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ جو تمہارا دل چاہے سمجھو۔“

”غلط فہمیوں کا شکار ہو کر میں تم سے جھگڑا نہیں کروں گا۔ درحقیقت یہاں کی زندگی سے کچھ الجھن سی ہونے لگی ہے۔“

”کمال ہے۔ مہم جو تو یہاں اپنی آدھی آدھی عمر گزار دیتے ہیں۔“

”میں صرف ”جو“ ہوں۔ مہم سے میرا کوئی واسطہ نہیں۔“

”فضول باتیں چھوڑو اور ناشتہ کرلو۔ مجھے بھی بھوک لگ رہی ہے۔“

لیشی نے کھانے پینے کی کچھ اشیاء سجادیں اور میں اُس کے ساتھ کھانے میں مصروف ہو گیا۔ بارہا دل میں خیال آیا کہ اُس عجیب و غریب لڑکی کے بارے میں اسے بتاؤں لیکن یہ میرا تجربہ تھا کہ لڑکیاں کہیں کی بھی ہوں۔ اُن کے سوچنے کا انداز ایک ہی ہوتا ہے۔ اگر بد قسمتی سے کبھی لیشی کے عالم ہوش میں وہ لڑکی دوبارہ میرے سامنے آگئی تو لیشی کی نگاہیں قابل دید ہوتیں اور میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ مجھے چھوڑ کر یہاں سے چلی جائے۔ کم از کم لیشی کی موجودگی میں اس بات کے امکانات تو تھے کہ ایک بار پھر مہذب زندگی میں لوٹ جاؤں گا۔ ہر چند کہ میں لیشی کو اس سلسلے میں مجبور نہیں کر سکتا تھا۔ لیکن یقین تھا کہ کسی نہ کسی دن وہ بھی اکتا کر ضرور مجھ سے کہے گی کہ چلو! یہاں سے واپس چلتے ہیں۔ اور مجھے اُس دن کا انتظار تھا۔

”کیا خیال ہے؟ اب یہاں سے چلا جائے؟“ ناشتے کے بعد لیشی نے کہا۔ ”میں نے آگے راستوں کا تعین کر لیا ہے۔“

”آگے کے لئے؟“ میں نے بوکھلائے انداز میں کہا۔

”پھر؟“

”مم..... میں سمجھا پیچھے کے لئے۔“

”نہیں ڈیئر! ابھی تو صحرائے اعظم کے حسین ترین علاقے باقی ہیں۔ جب یہاں تک آئے ہو تو کم از کم دل میں یہ حسرت لے کر تو نہ جاؤ کہ صحرائے اعظم کے ان علاقوں کو تم

نے نہیں دیکھا جو روایتی حیثیت کے حامل ہیں۔“

میں نے دل ہی دل میں کہا کہ محترمہ! میری حسرت تو کچھ اور ہی ہے۔ لیکن کیا کروں؟ میری حسرتیں بھی میری طرح بد نصیب ہیں۔ ورنہ جہاں تک روایتوں کا تعلق ہے میری اپنی روایات ایسی عجیب و غریب ہیں کہ اگر تفصیلات بتاؤں تو آپ کبھی یقین نہ کریں گی۔ یا اگر یقین کر لیا تو مجھے داغ مفارقت دے جائیں گی۔ چنانچہ میں نے ایک ٹھنڈی سانس بھر کر خاموشی سے گردن ہلا دی۔

”اب ہم یہاں سے نیا سا فال چلیں گے۔“ لیشی نے کچھ دیر بعد کہا۔ ”ہماری کشتی یہیں رہے گی اور ہم ان لوگوں سے گھوڑے حاصل کر لیں گے۔“

”یہ سب کچھ اتنی آسانی سے ممکن ہو سکتا ہے؟“ میں نے کہا۔

”اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ ”کیوں نہیں؟ اب تک ہمیں کون سی دقت ہوئی ہے؟“

میں نے گردن ہلا دی۔ یہ بھی نہیں پوچھا کہ یہ نیا سا فال ہے کیا چیز.....

لیشی پاور خاصی دیر تک وہاں رُکی اور اُس کے بعد بستی میں آگئی جو بلاشبہ قدیم و جدید کا امتزاج تھی۔ ایک طرف ننگ دھڑنگ وحشی ادھر سے ادھر آتے جاتے نظر آ رہے تھے تو دوسری طرف اس قسم کے انتظامات بھی تھے جن سے یہ احساس ہو کہ وہ بالکل ہی غیر مہذب نہیں ہیں۔

لیشی نے گھوڑوں کے سلسلے میں کسی سے گفتگو کی اور پتہ نہیں کس انداز میں معاملات طے کر لئے۔ وہ شخص ہمیں اپنے ساتھ لے گیا اور دو چاق و چوبند اور تو انا گھوڑے ہمارے حوالے کر دیئے۔ ضمانت کے طور پر کشتی اُس کے سپرد کر دی گئی تھی۔

دیگر ضروری تیاریوں کے بعد ہم نیا سا فال چل پڑے۔ تنگ درے، پر پیچ گھاٹیاں، درخت، جنگل..... تقریباً چار یا پانچ گھنٹے تک گھوڑوں کا یہ سفر مسلسل کرنا پڑا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ سفر کی رفتار تیز نہ تھی۔ لیکن گھوڑے کی پشت پر چار پانچ گھنٹے گزارنے کا مطلب یہ ہے کہ تمام ہڈیاں زبان حال سے چیخنے لگیں اور کم از کم میری ہڈیاں تو واقعی اب درد سے کراہ رہی تھیں۔ لیکن میں نے اس سلسلے میں لیشی پاور سے کوئی سوال نہیں کیا کہ یہ شہانِ مردانگی کے خلاف تھا۔

پانی نکالو گے، تب بھی تمہیں یہ کسی برتن میں صاف نظر آئے گا۔“
 ”گڈ..... کہیں یہ چشمہ حیات تو نہیں؟“

”وہ کیا ہوتا ہے؟“

”آب حیات کے بارے میں کچھ جانتی ہو؟“

”نہیں..... تم مجھے بتاؤ!“

”چشمہ حیا..... جس میں سے چند قطرے پینے کے بعد انسان ابد تک کے لئے جیتا ہے۔“

”توبہ..... ایسا جینا بھی کس کام کا.....“

”کیوں؟“

”بڑھاپا کتنی بدترین چیز ہوتی ہے۔ تم نے غور نہیں کیا؟“

”مگر آب حیات پینے کے بعد انسان بوڑھا بھی نہیں ہوتا۔“ میں نے بیزاری سے کہا۔

”مگر تم یہ بتاؤ کہ نیا سا فال جا کر ہم کریں گے کیا؟“

”اب تک کیا کرتے رہے ہیں؟“ لیشی نے اُلٹا مجھ سے سوال کر ڈالا۔

”میرے خیال میں کچھ نہیں۔“

”تو پھر وہاں جا کر بھی کچھ نہیں کریں گے۔ بس! خوبصورت جگہ ہے۔ اور میں تمہیں

اس علاقے سے پوری طرح روشناس کرا دینا چاہتی ہوں۔ ویسے تم سے ایک بات کہوں۔

تمہیں خوشی ہوگی۔“

”ہاں، ہاں..... کہو! بہت عرصے سے میں خوشیوں کو ترسا ہوا ہوں۔“ میں نے جواب

دیا۔

”وہاں بہت سے سیاح آتے ہیں۔ ہو سکتا ہے تمہیں وہاں مختلف ملکوں کے لوگ نظر آ

جائیں۔“

”کیا واقعی؟“ میں خوشی سے اُچھل پڑا۔ ایک لمحے کے لئے دل میں اُمید کی شمع روشن

ہوئی تھی۔ انہی میں سے کوئی ایسا سیاح نظر آ جائے جس نے واپسی کے لئے رخت سفر

باندھا ہو اور مجھے اُس کی خدمت کرنے کا موقع مل جائے۔ لیشی پاور کو اُگر دھوکہ دینا پڑے تو

کوئی حرج نہیں ہے۔ وہ ان علاقوں کی رہنے والی تھی۔ واپس چلی جائے گی۔ لیکن مجھے

پانچ چھ گھنٹے کے سفر کے بعد ہم نے ایک سرسبز اور ہرے بھرے میدان میں قیام

کیا..... ”کیا یہی نیا سا فال ہے؟“ میں نے سوال کیا۔

”نہیں..... ظاہر ہے چار پانچ گھنٹے کے اس سفر کے بعد اب گھوڑوں میں بھی سکت نہیں

رہی تھی کہ وہاں تک مزید دوڑ سکیں۔ اور اس کے علاوہ ہم لوگ بھی تھک گئے ہیں۔ کل صبح

تین گھنٹے کا سفر مزید کرنا پڑے گا۔ اور اس کے بعد ہم نیا سا فال پہنچ جائیں گے۔“

”گویا تقریباً آٹھ گھنٹے کا سفر؟ اُف میرے خدا! واپسی میں اگر یہ سفر مستقل کرنا پڑا تو

کیا ہوگا.....؟“

”یہ تو تم پر منحصر ہے ڈیز! کیا ضروری ہے کہ ہم مسلسل سفر کریں؟ میں تو دراصل اس

جگہ پہنچنا چاہتی تھی۔ اس لئے میں نے مسلسل چار پانچ گھنٹے سفر کر ڈالا۔ اور پھر ہمارے

پاس وقت بھی تھا۔ اس لئے میں نے سوچا کہ کیوں وقت ضائع کیا جائے...؟“

میں نے فوراً تائید میں گردن ہلا دی۔ لیشی پاور نے شاید میرے انداز کے طنز کو محسوس

نہیں کیا تھا۔ اس کے بعد وہی معمولات..... رات کو ہم دونوں کی قربت..... بے

اعتنائی..... خاموشی..... ایک دوسرے کی طرف سے تحریک کا انتظار اور اس کے بعد گہری

نیند..... سب کچھ معمول کے مطابق ہی ہوا تھا۔ دوسری صبح بھی معمول کے مطابق ہی آنکھ

کھلی۔

صبح کو لیشی پاور نے ناشتہ میرے سامنے رکھ دیا اور ہنس کر بولی۔ ”تم اپنی دُھن کے پکے

ہو ڈیز وان ڈارک!“

”تم نے مجھے منصور کہنے کا وعدہ کیا تھا۔“ میں نے کہا۔

”پتہ نہیں! یہ نام لیتے ہوئے مجھے دقت کیوں ہوتی ہے؟“ لیشی پاور نے کہا۔

”چلو ٹھیک ہے۔ ڈارک سے تمہیں دلچسپی ہے۔ اس لئے مجھے ڈارک ہی کہہ لیا کرو۔“

لیشی ہنسنے لگی۔ اور میں اُس سے پوچھے بغیر نہ رہ سکا۔ ”آخر یہ نیا سا فال کیا چیز ہے جس

کے لئے ہم اتنا لمبا سفر طے کر رہے ہیں؟“

”حسین ترین جگہ۔ علاقائی حیثیت سے بے مثال۔ نیا سا فال سے تقریباً چار میل کے

فاصلے پر گرین لیک ہے۔ تم اُسے دیکھو گے تو حیران رہ جاؤ گے۔ صاف و شفاف لیکن سبز

پانی..... جبکہ لیک کی گہرائی میں کاہی بھی نہیں ہے۔ سبزی بھی قدرتی ہے۔ اگر تم اُس جھیل

یہاں سے نکلنے کا موقع مل جائے گا۔

میں نے سافال جانے کے لئے خوش دلی سے تیار ہو گیا تھا۔ گھوڑوں کی نگلی پشت بلاشبہ پر گوشت تھی۔ اگر گھوڑے اس قدر جاندار نہ ہوتے اور اُن کی پشت پر سوکھی ہڈیاں ہوتیں تو میرا خدا ہی حافظ تھا۔ ہم بغیر زین کے سفر کرتے رہے۔ تین گھنٹے کا مسلسل سفر ہمارے لئے مصیبت ثابت ہوا تھا۔ لیشی میری نسبت زیادہ پرسکون نظر آ رہی تھی۔

پھر نیا سافال کا سلسلہ شروع ہو گیا..... آسمان کی بلندیوں سے پانی گر رہا تھا۔ بڑی بڑی سفید دھاریں حسین شکل میں بہت دور تک ایک پہاڑی دیوار سے نیچے لڑھک رہی تھیں۔ نیچے ایک پر شور ندی بہہ رہی تھی۔ اطراف کے علاقے اس قدر سرسبز اور حسین تھے کہ الفاظ میں بیان مشکل ہے۔ یہاں تک نگاہ جاتی، برف پوش چوٹیاں اور سبزہ زار نظر آتے۔

میں اس علاقے میں آکر کھو گیا۔ لیکن میری نگاہ اطراف میں بھی بھٹک رہی تھی۔ اکاؤکا خیمے نظر آ رہے تھے اور میں اُن خیموں کے نزدیک صرف اس نظریے سے پہنچا تھا کہ ممکن ہے کچھ غیر ملکی سیاحوں سے ملاقات ہو جائے۔ لیکن غیر ملکی سیاحوں کو بھی پتہ چل گیا تھا کہ میں اس وقت یہاں آنے والا ہوں اور میرا ساتھ جو بھی حاصل کرتا ہے، اُس کے لئے مصیبتیں کھڑی ہو جاتی ہیں۔ چنانچہ اتفاق سے غیر ملکی ایک بھی نہیں تھا۔ البتہ افریقہ کے مختلف حصوں سے لوگ آئے ہوئے تھے جو نیم مہذب تھے۔ چنانچہ اُن سے ملاقات کرنا بھی ضروری نہ سمجھا گیا۔

ہم لوگوں نے اپنے لئے بھی ایک جگہ ڈیرہ ڈال دیا۔ گو ہمارے پاس خیمہ نہیں تھا لیکن یہاں اس کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ آسمان ابر آلود تھا اور آبشار کی وجہ سے ماحول میں ایک حسین سی خنکی رچی ہوئی تھی۔

”کیو کیسی جگہ ہے؟“ لیشی نے مجھ سے پوچھا۔

”بے حد حسین..... تمہاری موجودگی نے اسے اور بھی حسین بنا دیا ہے۔“

”جب تم یہ الفاظ ادا کرتے ہو تو مجھے ہنسی آنے لگتی ہے۔“ لیشی پاور نے کہا۔

”کیوں؟“ میں نے متعجبانہ انداز میں منہ کھول دیا۔

”تم ان لوگوں میں سے نہیں ہو جو کسی کی موجودگی سے متاثر ہوتے ہیں۔“

”اوہ! نہیں..... ایسی بات نہیں ہے ڈیر! دراصل میں جن لوگوں میں سے ہوں، اُن

کے بارے میں ذرا کم ہی لوگوں کو معلومات حاصل ہوتی ہیں۔“

”ہاں..... مجھے اندازہ ہو رہا ہے کہ تم بے حد عجیب انسان ہو۔“

”ویسے مجھے تم پر بھی حیرت ہوتی ہے کہ صرف ایک چھوٹی سی بات پر مجھے کس قدر

ہمت دی ہے۔“

”چھوٹی سی بات؟“

”ہاں! تمہارے پاپا کے سلسلے میں، میں نے تھوڑا سا کام کر دیا تھا اور اُس کے نتیجے میں

تم نے اپنا اتنا قیمتی وقت میرے ساتھ ضائع کر دیا۔“

لیشی پاور مجھے عجیب سے انداز میں دیکھنے لگی۔ پھر اُس نے آہستہ سے کہا۔ ”نہیں.....

ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ پاپا کا مسئلہ اُسی وقت ختم ہو گیا تھا۔“

”پھر؟“

”اس بھر کے آگے ایک طویل دیوار ہے جسے عبور کرنے کے لئے ہم دونوں میں سے

کسی ایک کو جرات کرنا ہوگی۔“ اُس نے معنی خیز انداز میں کہا۔

میں خاموش ہی ہو گیا۔ بہتر یہی تھا کہ میں اس دیوار کو عبور کرنے کی جرات ہی نہ

کروں۔ پتہ نہیں اس دیوار کے اُس طرف کیا موجود ہو.....

نیا سافال پر ہم نے پورا دن گزارا۔ اور اس کے بعد لیشی پاور مجھے دوسری صبح ساتھ لے

کر گرین لیک چل پڑی۔ اس بات پر اُس نے بہت مایوسی کا اظہار کیا تھا کہ اتفاق سے ان

دنوں یہاں سیاح موجود نہیں۔

گرین لیک واقعی دنیا کا آٹھواں عجوبہ تھی۔ یا شاید میں غلط کہہ رہا ہوں، نواں عجوبہ ہو

سکتی ہے۔ کیونکہ آٹھواں عجوبہ تو میں خود تھا۔ پانی واقعی سبز تھا۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ اس

میں کوئی ایسی شے بھی شامل نہ تھی جو اُس کا رنگ سبز کر دے۔ لیکن اس کا فی وسیع و عریض

علاقے میں ٹھاٹھیں مارتی ہوئی سمندر نما جھیل بلاشبہ بالکل سبز ہی تھی۔ اُس کا پانی بھی ہاتھوں

میں لے کر دیکھا۔ اُس میں ہلکی سی سبزی کی آمیزش تھی۔

”کہو! اتنی عجیب چیز کو نہ دیکھتے تو کیا بعد میں اس کا افسوس نہ ہوتا؟“ لیشی نے

مکراتے ہوئے پوچھا۔

”ہاں..... یقیناً! حیرت انگیز بات ہے۔ کیا اس کا کبھی کیمیاوی تجزیہ کیا ہے؟“

نی۔ ابھی میں لیشی کے سلسلے میں کوئی فیصلہ بھی نہیں کر پایا تھا کہ میرا گھوڑا بھی اُسی طرح بن ہو گیا اور میں نے پھرتی سے اپنے بدن کو سادھ لیا تا کہ گھوڑا منہ کے بل بھی گرے تو آرام میں سر کے بل نیچے نہ آؤں۔ لیکن میرے گھوڑے کے دونوں پاؤں سلامت تھے۔
انے دونوں پاؤں زمین پر مارے اور ایسا جان توڑ کر بھاگا کہ مجھے اپنے آپ کو اُس کی
بنت پر قائم رکھنا مشکل ہو گیا۔

میرے منہ سے ارے ارے کی آوازیں نکل رہی تھیں۔ اور میں گھوڑے کی لگا میں
مضبوطی سے پکڑے ہوئے تھا۔ مجھے اُس کی گردن سے چمٹ جانا ہی پڑا۔ ورنہ یقینی طور پر
نیچے گرنے میں کوئی کسر نہیں رہ گئی تھی۔ گھوڑا یوں دوڑ رہا تھا جیسے اُس کی دُم میں آگ لگی
ہوئی ہو۔ میں اُسے سنبھالنے کی ہر کوشش میں ناکام ہو گیا تو اپنے آپ کو سنبھالنے کی
بششوں میں مصروف ہو گیا۔ اب میں اُس کی گردن سے اس طرح چمٹا ہوا تھا جیسے اُس کی
بنت پر بالوں کی جگہ ایک انسان اُگ آیا ہو۔ ذرا بھی جنبش کرتا تو یقینی طور پر گھوڑے کی
بنت سے نیچے گرنے سے بچا نہیں رہ سکتا تھا۔

گھوڑا دوڑتا رہا اور میں اُس کی پشت سے چمٹا رہا۔ ہر لمحے یہی احساس ہوتا تھا کہ اب
اُٹھ کر کھائے گا اور زمین پر آ رہے گا۔ لیشی کے لئے ایک لمحے بھی ذہن میں خیال نہیں آیا
تاکہ اُس کا کیا ہوا ہوگا؟ گھوڑے سے گرنے کے بعد زندہ بچی یا مر گئی؟ یہ حادثہ اتنا ہی
بُف ہو تھا کہ سوچنے سمجھنے کی تمام قوتیں سلب ہو گئی تھیں۔ آہستہ آہستہ گھوڑے کی رفتار
ت بونے لگی۔ میں ہوش و حواس سے عاری ہو چکا تھا۔ کان بند ہو گئے..... حواس نے
اُٹھ چھوڑ دیا.....

بالآخر گھوڑا رُک گیا۔ لیکن اب چاروں طرف اندھیرا پھیل چکا تھا اور مجھے یہ اندازہ
نہ تھا کہ میں گرین لیک سے کس طرف نکل آیا ہوں؟ یہ راستہ نیا سا فال کی طرف جاتا
نیا کی اور طرف؟ میں گھوڑے کی پشت پر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ گھوڑا اب بالکل نارمل
رہا تو میں نے اُس کا چاروں طرف سے جائزہ لیا اور اس کے بعد اطراف کا جائزہ
رہا۔

میرے اطراف درخت ہی درخت بکھرے ہوئے تھے۔ غالباً کوئی جنگل تھا۔ لیکن بہت
اندھنا نہیں تھا۔ چھدرے چھدرے درخت کافی فاصلے پر اُگے ہوئے تھے۔ لیکن میں یہ

”بے شمار بار۔ لیکن ابھی تک اس کے بارے میں کوئی حتمی رپورٹ شائع نہیں ہوئی کہ
اس پانی کا رنگ سبز کیوں ہے؟“
”پینے میں یہ پانی کیسا ہے؟“
”پی کر دیکھو!“

”کہیں میرے سر پر سبزہ تو نہیں اُگ آئے گا؟“
”نہیں..... تم بالکل ٹھیک رہو گے۔“

میں نے پانی چکھ کر دیکھا۔ واقعی شیریں تھا۔ افریقہ میں ایسے عجائبات کی کمی نہیں ہے۔
ویسے گرین لیک کے آس پاس کافی جانور کلیلیں کرتے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ شکاریوں
کے لئے تو یہ جگہ جنت سے کم نہیں تھی۔

ہم دیر تک گرین لیک کے آس پاس کے علاقوں کی سیر کرتے رہے۔

”کیا خیال ہے، یہیں رُکو گے یا واپسی کا سفر طے کریں؟“ لیشی نے مسکرا کر پوچھا۔
”کیوں..... کیا یہاں قیام نہیں کرو گی؟“

”بے مقصد ہی رہے گا۔“ اس سے زیادہ واضح الفاظ میں لیشی پاور اور کیا کہہ سکتی تھی؟
یہ الفاظ بھی نبجانے اُس نے کتنی مشکل سے ادا کئے تھے۔

شام کے جھپٹے فضاؤں میں اُتر آئے۔ زمین پر دُھند کا سا پھیلتا جا رہا تھا۔ گرین لیک
کے آس پاس ہمیں کوئی بھی نظر نہیں آیا تھا۔ ویسے بھی اب یہ بھیانک ویرانے ہماری عادت
بن گئے تھے۔

میں اور لیشی واپس چل پڑے۔ طے یہ کیا گیا تھا کہ جھیل کے ساتھ ہی کسی خوبصورت
جگہ کا انتخاب کر کے قیام کے انتظامات کئے جائیں گے۔ ہمارے گھوڑے ست رفتار سے
چل رہے تھے کہ اچانک ہی کچھ ہوا..... ایک ہلکی سی سرسراہٹ میں نے بھی سنی اور اس کے
ساتھ ہی لیشی کے گھوڑے کی ہنہانے کی آواز بھی ابھری اور وہ الف ہو گیا۔ لیکن اُس نے
دونوں پاؤں اُوپر اُٹھا کر نیچے رکھنے کی کوشش کی تو اوندھے منہ زمین پر آ رہا اور وہ نیچے گر
پڑی۔

میری سمجھ میں اس وقت کچھ نہیں آیا۔ لیکن میں نے ایک عجیب و غریب مڑی سی شے
ضرور دیکھی جو گھوڑے کے اگلے پیروں کو چھوتی ہوئی گزر گئی تھی۔ سنسناہٹ اسی کی وجہ سے

بالناک تھا۔

میں نے خوفزدہ ہو کر چاروں طرف دیکھا۔ اب تو درخت بھی دھندلانے لگے تھے۔
نہ یہ محسوس ہو رہا تھا جیسے کچھ انسانی سائے کھڑے ہوئے ہوں اور مجھے مضحکہ خیز لگا ہوں
دیکھ رہے ہوں۔ اس ویرانے میں جو کیفیت اس وقت مجھ پر بیت رہی تھی اُسے میں
ہانتا تھا یا میرا خدا۔

میں سہا سہٹا بیٹھا رہا۔ گھوڑے کو بار بار چمکا رہا تھا تا کہ میری اُس سے شناسائی ہو
جائے۔ اور وہ یہ سوچ کر کسی اور طرف نکل جانے کی کوشش نہ کرے کہ یہ بھی کوئی آدمی ہے
جس سے بات چیت نہیں ہو سکتی..... میں اپنی جگہ سے اٹھا اور گھوڑے کے قریب بیٹھ گیا۔
میں اُس کی خوشامد کرنا چاہتا تھا۔ اُس سے کہنا چاہتا تھا کہ میرے بھائی! مجھے چھوڑ کر فرار
ہونے کی کوشش مت کرنا۔ وہ شاید میرا مقصد سمجھ گیا تھا۔ چنانچہ اُس نے بھی مجھ سے دلچسپی
کا اظہار کیا اور مجھے یقین ہو گیا کہ اُس کے چہرے کے تاثرات مجھ سے مختلف نہیں ہیں۔

رات گزارنے کے لئے کوئی جگہ بھی تلاش نہیں کی جاسکتی تھی۔ جاتا تو کہاں جاتا؟ دیر
تک خوفزدہ رہا۔ اور اس کے بعد گھوڑے سے چند گز کے فاصلے پر ایک درخت کے تنے
سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ ذہن سائیں سائیں کر رہا تھا۔ خوف و دہشت سے بدن کے رونگٹے
کھڑے ہو گئے تھے۔ ہر لمحے یہی احساس ہوتا تھا کہ کسی درخت کے عقب سے شیر کی
غائب سنائی دے گی۔ دو خونخوار آنکھیں مجھے گھوریں گی۔ ایک جست لگائی جائے گی اور
میرے پیچھے اُس کے دانتوں میں دبے ہوں گے.....

میں دل ہی دل لیشی کو گالیاں دینے لگا۔ خدا غارت کرے ان عورتوں کو..... جہاں بھی
جاتی ہیں، مردوں کے لئے مصیبت کا سامان ہی فراہم کرتی ہیں۔ ارے بھائی! مجھے کیا پڑی
تھی صحرائے اعظم افریقہ میں بھٹکنے کی۔ زبردستی اپنی مہم جوئی کا ثبوت دینے کے لئے پکڑ لائی
میں سے اور یہاں لانے کے بعد ذلیل و خوار کر دیا۔ اب خود بھی پتہ نہیں کس عالم میں ہو
نہ۔ مر گئی ہو تو اچھا ہے۔ گھوڑے سے گر کر بھیجہ نکل گیا ہو خدا کرے..... میں اُسے کو ستا
ہے۔ خواہ مخواہ مجھے برباد کرنے کے لئے یہاں لے آئی اگر صبح گھوڑے پر بیٹھ کر سفر کا آغاز
کروں تو کون سی سمت اختیار کروں؟ مجھے کوئی پتہ ہے کہ کون سا راستہ کدھر جاتا ہے؟

دل میں طرح طرح کے دسوتے آرہے تھے جن سے نجات پانے کا طریقہ یہی تھا کہ

فیصلہ نہیں کر سکتا تھا کہ یہ کون سی جگہ ہے؟ لیشی پاور سے جدا ہونے کے بعد تو میں بالکل ہی
بے یار و مددگار رہ گیا تھا۔

مجھے اُن بے شمار افریقی مہم جوؤں کی کہانیاں یاد آ گئیں جنہوں نے صحرائے اعظم میں
بھوک اور پیاس سے دم توڑ دیا تھا۔ گھوڑے نے پلٹ کر مجھے اس انداز میں دیکھا جیسے کہہ
رہا ہو کہ کب تک یہ مروت جاری رکھی جائے؟ ابھی ایک لات گھما کر دوں گا اور نیچے جا پڑو
گے۔ بہتر ہے کہ تم خود ہی میری پشت سے نیچے اتر آؤ..... میں بوکھلائے ہوئے انداز میں
گھوڑے کی پشت سے نیچے اتر گیا۔ درحقیقت گھوڑے کا مقصد ہی یہی تھا۔ اُس نے گردن
ڈال دی اور گھاس کی تلاش میں آگے بڑھ گیا۔ میں اپنی جگہ احمقوں کی طرح کھڑا چاروں
طرف دیکھ رہا تھا۔

پھر مجھے خیال آیا کہ یہ سب ہوا کیا؟ کیا یہ سب کچھ اتفاق تھا یا اس میں کوئی راز پوشیدہ
تھا؟ لیشی کا گھوڑا اچھا خاصا تھا۔ اُس نے ٹھوکر کیسے کھائی؟ اور اس کے ساتھ یہ تمام واقعہ
کیسے بیٹا؟ اور پھر میرا گھوڑا بھی ایسے بھاگا تھا جیسے..... مجھے وہ مڑی مڑی چیز نظر آئی جو
سنسناتی ہوئی لیشی کے گھوڑے کے پیروں کے پاس سے گزر گئی تھی اور اس کے بعد اس کے
گھوڑے کی یہ حالت ہوئی تھی۔ گویا یہ کوئی اتفاقیہ واقعہ یا حادثہ نہیں تھا بلکہ اس میں یقینی طور
پر کوئی راز پوشیدہ تھا۔ لیکن کوئی فیصلہ کرنے سے ذہن قاصر تھا۔ اور جب کچھ سمجھ میں نہ آئے
تو انسان کو چاہئے کہ وہ جہاں بھی ہو، لمبا لیٹ جائے اور آسمان کی طرف دیکھنے لگے۔

میں نے ایسا ہی کیا۔ گھوڑے کے سموں کی آواز اور اُس کے منہ سے نکلنے والی ہنہناہٹ
مجھے اپنے ساتھ کسی جاندار کی موجودگی کا احساس دلا رہی تھی۔ لیکن اس جنگل میں میرے اور
گھوڑے کے علاوہ اور بھی بہت سے جاندار ہوں گے۔ اور اگر وہ جاندار میری طرف نہ
ہوئے تو کیا ہو گا؟ خونخوار اور وحشی درندے..... صحرائے اعظم افریقہ..... ویرانہ..... تنہا
انسان اور اجنبی گھوڑا..... واہ! کیا عمدہ صورت حال ہے۔ ایسے میں کسی جانور کو میری تلاش
میں کوئی دقت بھی نہیں ہوگی۔ ٹہلتا ہوا آئے گا اور مجھے اپنا نوالہ بنا جائے گا..... پورا بدن
سپینے سے تر ہو گیا۔ میں خوف سے اٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔ وہ مثال غلط ہو گئی تھی کہ تنہا انسان کو
ایسے حالات میں زمین پر لیٹ کر آسمان کی طرف دیکھنا چاہئے۔ خیالات خود بخود اُس کے
ذہن میں رینگ آتے ہیں۔ اس وقت تو جو خیال میرے ذہن میں رینگا تھا، وہ بہت ہی

ہے؟ کیا وہ میری گھات میں ہے.....؟
دل چاہا کہ گڑگڑا کر اُس سے کہوں کہ مجھے کوئی نقصان نہ پہنچائے۔ لیکن مردانہ غیرت
اڑے آئی اور میں یہ آوازیں نہ دے سکا۔ یا پھر مردانہ غیرت کا تصور صرف میرا اپنا ہو سکتا
ہے کہ آواز ہی خوف کے مارے میرے حلق سے آزاد نہ ہونا چاہتی ہو۔ مصیبتوں کے جو
پھاڑ بلکہ آسمان پے در پے نبھ پر ٹوٹتے رہتے تھے اب انہوں نے مجھے حالات سے سمجھوتہ
کرنا سکھا دیا تھا۔ وقتی طور پر کسی بھی بات سے خوف زدہ ہو جاتا تھا۔ لیکن بعد میں یہ خوف
خود بخود زائل ہو جاتا تھا۔

میں چند لمحے ادھر ادھر دیکھتا رہا۔ اور پھر آگ کے قریب بیٹھ گیا۔ اب جو کوئی بھی ہے
اور جو کچھ بھی کرنا چاہتا ہے کر لے۔ میں تو سر عام نیلام ہونے کے لئے ہی پیدا ہوا ہوں۔
دیر تک اسی طرح بیٹھا رہا۔ اور پھر واقعی حیرت ہونے لگی۔ آگ مدھم پڑتی جا رہی تھی۔ میں
نے سوچا کہ آگ جلانے والا آگ جلا کر آخر کہاں فرار ہو گیا؟ اور پھر میری نگاہ کچھ فاصلے
پر پڑی اور میں دہشت سے اُچھل پڑا.....

کوئی بیٹھا ہوا تھا۔ صاف نظر نہیں آ رہا تھا۔ لیکن تھا کوئی انسان ہی۔ اس سے پہلے بھی
میں یہ جگہ دیکھ چکا تھا، لیکن وہ یہاں موجود نہیں تھا۔ اور اب اطمینان سے بیٹھا ہوا تھا۔ میں
پھٹی پھٹی آنکھوں سے اُسے دیکھتا رہا۔ جب اُس کی طرف سے کوئی جنبش نہ ہوئی تو میں خود
ہی اپنی جگہ سے اُٹھا اور لرزتے قدموں سے اُس کے قریب پہنچ گیا۔ ایک بار پھر مجھے ایک
ذہنی جھٹکا برداشت کرنا پڑا.....

وہ ایک عورت تھی۔ بلند و بالا قد و قامت کی مالک اور شاید جوان بھی۔ قریب سے
دیکھنے پر یہ اندازہ بخوبی ہو جاتا تھا۔ گھٹنوں میں سر دیئے اور دونوں ہاتھ گھٹنوں کے گرد لپیٹے
بیٹھی تھی۔ قدموں کی چاپ پر اُس نے گردن اُٹھائی۔ عجیب پر اسرار سا انداز تھا..... لیکن
مجھے حیرت سے دو قدم پیچھے ہٹ جانا پڑا..... یہ صورت میرے لئے اجنبی نہیں تھی۔ تیسری
بار سامنے آئی تھی۔ پہلی بار اُس وقت جب رقص کے دوران وہ میرے نزدیک آکھڑی ہوئی
تھی۔ دوسری بار اُس وقت جب رات کو وہ میرے بالکل نزدیک تھی اور تیسری بار اب.....
ہاں! یہ وہی پر اسرار لڑکی تھی۔

چند لمحے وہ مجھے دیکھتی رہی۔ اور پھر اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ مجھے ایک

اپنے آپ کو خدا کے بھروسے پر چھوڑ کر گھٹنوں میں منہ دے کر سو جاؤں۔ کسی طرح نیند
جائے گی۔ نیند کے عالم میں مجھے کوئی جانور ہڑپ کر جائے تو کم از کم تکلیف تو نہیں ہوگی۔
یہ انتہائی بے بسی کا احساس تھا جس سے میری آنکھوں سے آنسو نکل آئے۔

راہمیس کی طرف سے میں اتنا بد دل ہو گیا تھا کہ میں نے اس وقت بھی اُسے مدد کے
لئے نہ پکارا۔ جو ہو گا دیکھا جائے گا۔ اگر اُس بد روح کو دوبارہ سر پر مسلط کیا تو پھر مصیبتوں
کے اس سفر میں کبھی کمی نہ ہوگی۔ اس سے تو بہتر ہے کہ زندگی کے سفر کا اختتام ہی ہو
جائے۔

رات کا جانے کون سا پہر تھا کہ ایک سرسراہٹ سنائی دی اور میں اُچھل کر کھڑا ہو گیا۔
اس وقت دیکھنے والے میرا چہرہ دیکھتے تو شاید ہفتوں ہنستے رہتے۔ میں کھڑا ہو کر چاروں
طرف دیکھنے لگا۔ سرسراہٹ کی وجہ تو سمجھ میں نہیں آئی۔ لیکن کافی فاصلے پر ایک روشنی سی
محسوس ہوئی..... کسی نے شاید آگ جلا رکھی تھی۔ میرے معبود! آخر موت آ ہی گئی
قریب..... یہ یقیناً غول بیابانی میں سے کوئی ایک ہے جو آگ روشن کئے ہوئے ہے۔ لیکن
آگ کی چھاؤں میں مجھے کوئی نظر نہیں آیا۔ کیا کروں؟ کیا اپنی موت کی جانب خود ہی قدم
بڑھاؤں؟ میں نے سوچا۔ آخر آگ کس نے روشن کی؟ لکڑیاں جمع کر کے آگ روشن
کرنے والا تو کوئی انسان ہی ہو سکتا ہے۔ کیا اس جگہ مجھ سے صرف دو سو گز کے فاصلے پر
کوئی انسان موجود ہے؟ اور موجود ہے تو کون ہو سکتا ہے؟

میں ہچکچاہٹ کے عالم میں اپنی جگہ کھڑا اُسے دیکھتا رہا۔ مجھے خیال آیا کہ آخر میں انسان
ہوں۔ وہ لوگ بھی تو انسان ہی تھے جنہوں نے بڑی بڑی مہمات سر کیں اور انتہائی خوفناک
حالات میں بھی اپنے ہوش و حواس برقرار رکھے۔ آگ میرے سامنے ہے تو اس کا راز
جاننے کی کوشش کیوں نہ کروں؟ بڑی ہمت کرنے کے بعد میں نے اس آگ کی جانب قدم
بڑھا دیئے.....

قدم گو، من من بھر کے ہو رہے تھے۔ لیکن میں آگ کے قریب پہنچ گیا۔ چھوٹی چھوٹی
لکڑیاں جمع کر کے آگ روشن کی گئی تھی۔ لیکن اطراف میں کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں
حیرت سے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ آگ روشن کرنے کے لئے لکڑیاں جس انداز میں جمع کی گئی
تھیں، اُن سے یہی اندازہ ہوتا تھا کہ یہ کسی انسان کا ہی کارنامہ ہے۔ لیکن وہ انسان کہاں

عجیب سا احساس ہوا۔ وہ بے حد دلکش تھی۔ جب میں نے اُسے پہلی بار دیکھا تھا تو اُس نے اپنا چہرہ رنگوں سے رنگا ہوا تھا۔ دوبارہ بھی میں نے اُسے رنگے ہوئے چہرے کے ساتھ ہی دیکھا تھا۔ لیکن اس وقت اُس کے چہرے پر کوئی رنگ نہیں تھا سوائے اُس کی صورت کے اصل رنگ کے۔ مسکراہٹ میں بڑی دلکشی تھی۔ خدوخال بھی بے حد حسین تھے۔ چہن رنگ۔ کسی قدر موٹے ہونٹ لیکن انتہائی پرکشش، ستواں ناک اور سب سے حسین چیز جو اُس کے چہرے پر تھی، وہ اُس کی آنکھیں تھیں۔ گہری سیاہ، دل میں اتر جانے والی حسین آنکھیں۔ میں ایک لمحے کے لئے اُس کے سحر میں کھو گیا۔ اس ایک لمحے میں مجھے یاد نہ رہا تھا کہ کیا صورت حال ہے؟ وہ مجھے دیکھ کر مسکراتی رہی۔ اس طرح بیٹھنے سے اُس کے لمبے اور سیاہ بال زمین پر بکھر گئے تھے۔ چند لمحات اسی طرح گزر گئے اور اس کے بعد میں نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔

”میں تم سے تیسری بار مل رہا ہوں۔“ اُس نے میری اس بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ تب میں بھی اُس کے سامنے بیٹھ گیا۔ ”اور میرا خیال ہے یہ محض اتفاق نہیں ہے۔“ وہ اسی خاموشی سے مجھے دیکھتی رہی۔ جواب بھی نہیں دے رہی تھی۔ میں نے کچھ دیر انتظار کیا اور بولا۔ ”اگر اس کی کوئی خاص وجہ ہے تو بہتر یہ ہے کہ مجھے بتا دیا جائے۔ اس وقت جب تم ناچ رہی تھیں اور اس وقت جب تم میرے قریب تھیں میں نے تمہیں ایک عجیب کیفیت میں دیکھا تھا اور اب تیسری بار تم مجھے یہاں مل رہی ہو۔ یقینی امر ہے کہ تم نے میرا تعاقب کیا ہے۔ تم جو کوئی بھی ہو، بہتر ہے کہ مجھے اپنے بارے میں بتا دو۔ اس طرح خاموش رہنے سے مسئلہ حل نہیں ہو سکتا۔“

اُس کے ہونٹوں کی مسکراہٹ ختم ہو گئی۔ اور وہ اب سادہ سی آنکھوں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ پھر اُس نے اپنے دونوں ہاتھ کھولے اور اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑی ہوئی۔ کیا قد و قامت تھا..... وہ ریڈ انڈین طرز کی کسی کھال کی پتلون پہنے ہوئے تھی جس کی چوڑی بلیٹ اُس کی پتلی کمر پر کسی ہوئی تھی۔ اوپری جسم پر بھی ریڈ انڈین سٹائل کا ہی لباس تھا جس میں لوہے کے کچھ کڑے لگے ہوئے تھے۔ لمبے لمبے ہاتھ پاؤں، بلند و بالا قد، انتہائی متناسب بدن..... وہ گھومی اور ایک دو شاخہ درخت کی جانب چل پڑی۔ مجھے اس طرف سے گھوڑے کی کھرکھری کی آواز سنائی دی اور میں نے ایک گہری سانس لی۔ ویسے بھی ظاہری امر تھا کہ

وہ گھوڑے پر ہی یہاں تک آئی ہوگی۔ لیکن بات کچھ سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ کیا اُس نے میرا تعاقب کیا تھا؟ مگر اس کی وجہ؟ کیا اس کے پس پردہ بھی کوئی خاص بات تھی اور ہمارے ساتھ پیش آنے والا حادثہ اُس خطرناک لڑکی کی کوششوں کا مرہون منت تھا؟ مجھے وہ مڑی مڑی سی چیز یاد آگئی جو لیشی پاور کے گھوڑے کی ٹانگوں کو توڑتی ہوئی نکل گئی تھی۔ یہ لڑکی واقعی بے حد پراسرار تھی۔ مگر اسے مجھ سے کیا دلچسپی ہوگی؟

میں انتظار کرتا رہا۔ اور چند لمحوں میں وہ واپس آگئی۔ کچھ چیزیں اُس کے ہاتھ میں دبی ہوئی تھیں۔ اُس نے نیچے بیٹھ کر کسی درخت کے چوڑے پتے زمین پر بچھائے اور پھر ایک کپڑے میں لپیٹی ہوئی کوئی چیز نکال کر اُن پتوں پر رکھ دی۔ میں نے غور سے دیکھا تو کسی جانور کی بھنی ہوئی ران تھی۔ میرے منہ میں پانی بھر آیا اور یہ احساس ہوا کہ آنتیں پیٹ میں قل ہوا اللہ پڑھ رہی ہیں۔ اُس نے پانی کا ایک برتن بھی میرے سامنے رکھ دیا جو ککڑی سے بنا ہوا تھا۔ گویا وہ میری ضیافت کرنا چاہتی تھی۔ لیکن اس قدر خاموش.....

میں نے اُس کی جانب دیکھا تو اُس نے آنکھیں بند کر کے گردن ہلائی اور ران کی جانب اس طرح اشارہ کیا جیسے مجھ سے کہہ رہی ہو کہ دیر نہ کروں..... میں نے اُسے بھی پیش کش کی۔ لیکن وہ پھر اپنی جگہ جا کر بیٹھ گئی اور میں دانتوں سے ران کا گوشت اُدھیڑنے لگا۔ انتہائی نرم اور خستہ گوشت تھا۔ بالکل پھیکا۔ نمک وغیرہ کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔ لیکن بھنا ہوا تھا۔ چنانچہ میں اُسے دانتوں سے اُدھیڑ کر معدے میں اتارتا رہا۔ وہ مطمئن انداز میں بیٹھی تھی۔ معدے میں کچھ وزن پیدا ہوا اور طبیعت پر بحالی سی آگئی۔ اب تک کی جو کیفیت تھی وہ رفتہ رفتہ ختم ہوتی جا رہی تھی۔

اُس نے ابھی تک میری کسی بات کا کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ اس سے میں نے یہی نتیجہ اخذ کیا کہ وہ انگریزی نہیں سمجھتی۔ وہ بظاہر افریقی نہیں محسوس ہوتی تھی۔ لیکن یہ بات بھی نظر انداز نہیں کی جاسکتی تھی کہ میں نے اُسے افریقیوں کے ایک قبیلے کے ساتھ رقص کرتے ہوئے دیکھا تھا۔

معدے کے وزن نے آنکھوں میں نیند لانی شروع کر دی تھی۔ چنانچہ میں وہیں لیٹ گیا اور خاموشی سے اُسے دیکھتا رہا۔ اُس نے بھی اسی طرح گھٹنوں میں منہ دے کر سر چھپا لیا تھا۔ وقت گزرتا رہا۔ میں نے جب بھی اُسے دیکھا، وہ مجھے اسی طرح بیٹھی ہوئی نظر

آئی۔ جانے کیوں ایک بے چینی کا احساس ہونے لگا۔ لیکن پھر نیند نے تمام احساسات چھین لئے اور میں گہری نیند سو گیا.....

دوسری صبح آنکھ کھلی تو چونک کر ادھر ادھر دیکھا۔ لڑکی کہیں نہیں تھی۔ لیکن ایک گھوڑا مجھے نظر آ گیا۔ وہ میرا ہی گھوڑا تھا۔ میں اپنی جگہ سے اٹھا اور درخت کے عقب میں پہنچ گیا۔ موٹے کینوس کا ایک تھیلا وہاں موجود تھا جو انتہائی جدید ساخت کا تھا۔ اُس میں زپ لگی ہوئی تھی اور زپ میں مخصوص قسم کے نمبروں سے کھلنے والا تالا۔ اُسے دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی تھی۔ اُس افریقی لڑکی کے پاس اس تھیلے کی موجودگی کیا معنی رکھتی ہے؟

میں نے ٹول کو تھیلے کو دیکھا۔ جانے کیا کیا الم علم، اُس میں بھرا ہوا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ اب کیا کروں؟ ایک لمحے کے لئے سوچا کہ تھیلا اٹھا کر کندھوں پر باندھوں، گھوڑے پر بیٹھوں اور یہاں سے فرار ہو جاؤں..... لیکن ابھی کوئی فیصلہ بھی نہیں کر پایا تھا کہ دوڑتے ہوئے گھوڑے کے ٹاپوں کی آوازیں سنائی دیں اور اس کے بعد میں نے اُسے دیکھ لیا۔ وہ گھوڑے پر واپس آرہی تھی۔ اُس کے شانوں پر کوئی چیز لٹکی ہوئی تھی۔ قریب آئی تو میں نے دیکھا کہ شانوں پر لٹکی ہوئی چیز ہرن ہے جسے اُس نے شکار کیا تھا۔ اُس نے گھوڑے کی پشت پر بیٹھے بیٹھے ہرن کو اتار کر نیچے پھینک دیا اور پھر خود بھی گھوڑے سے نیچے اتر آئی۔ اُس کے انداز میں اتنی پھرتی اور مستعدی تھی کہ مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ انتہائی طاقتور اور پھرتیلی لڑکی ہے۔ اُس نے تھیلے کے قریب پہنچ کر اُس کا تالا کھولا اور ایک لمبا سا چھرا نکال لیا۔ اُس نے چھرا ہرن کی گردن پر پھیر دیا اور ہرن کی گردن سے تازہ تازہ خون بہہ نکلا۔ پھر اس نے اُس کی دونوں ٹانگیں پکڑیں اور انہیں اٹھا کر درخت کی ایک شاخ پر لٹکا دیا۔ اوپر سے اُس نے دونوں ٹانگوں کو پکڑ کر مروڑا۔ ٹانگیں ٹوٹ گئیں۔ میں نے اپنے بدن میں ایک پھریری سی محسوس کی تھی۔ اتنی طاقتور لڑکی میں نے زندگی میں اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ کیمرہ بھی طاقتور تھی۔ لیکن اس کے مقابلے میں کچھ نہیں تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے اُس نے انگلیوں کی مدد سے ہرن کی پوری کھال اتار پھینکی۔ اُس نے پھر ایک کپڑا لیا اور ہرن کے اندرونی بدن کو صاف کر دیا۔

میں نے سوچا حرام خوری مناسب نہیں ہے۔ وہ صبح کے ناشتے کا ہی نہیں، غالباً دن بھر کے کھانے کا بندوبست کر رہی تھی۔ چنانچہ تھوڑی سی کارروائی میری بھی ضرور ہونی چاہئے۔

میں نے فوراً ہی خشک لکڑیوں کی ٹکٹیاں تلاش کیں اور اُن پر ایک ایسی لکڑی رکھی جو ہرن کو آگ پر گھما سکے۔ بے شمار چھوٹی چھوٹی لکڑیاں جمع کر کے میں نے نیچے رکھ دیں۔ وہ مسکراتی نگاہوں سے کئی بار مجھے دیکھ چکی تھی۔ پھر اُس نے اپنے تھیلے میں سے ماچس نکال کر میری طرف اُچھال دی اور میں نے دل ہی دل میں سوچا کہ محترمہ تمام انتظامات سے لیس ہیں۔ میں نے لکڑیاں سلگا دیں۔

اس دوران وہ ہرن کو بالکل صاف کر چکی تھی۔ پھر اُس نے ٹکٹکی پر رکھی ہوئی لکڑی اٹھائی اور ہرن کو اُس میں پرو دیا۔ ہرن کافی وزنی تھا۔ لیکن لڑکی نے اس طرح اُسے لکڑی میں پرو دیا تھا جیسے وہ بے وزن ہو۔ مجھے دل میں اپنے مستقبل کا خیال آ گیا۔ جس وقت بھی اُسے طیش آ گیا، اُسی وقت مجھے اس ہرن کی طرح کسی ٹکٹکی پر بھننا پڑے گا۔

وہ پانی سے ہاتھ دھو کر ایک سمت جا بیٹھی۔ گویا اب اُس نے باقی ذمہ داری میرے سپرد کر دی تھی۔ جب ہرن تیار ہو گیا تو وہ اُٹھی۔ چھرا اُس کے ہاتھ میں تھا۔ اُس نے اُسے اپنی پتلون سے صاف کیا اور اس کا دستہ زور سے ہرن کے بازو پر مارا۔ آپ لوگ اس بات پر شاید یقین نہ کریں لیکن ہرن کے بازو کی ہڈی تک کٹ گئی تھی۔ وہ اطمینان سے چھرے کو ہرن کی پسلیوں میں چبھو کر اور اُس کی ران ہاتھ میں لئے آگے بڑھ گئی اور اپنی جگہ بیٹھ کر اُسے دانتوں سے اُدھیڑنے لگی۔ گویا اب اپنے لئے گوشت حاصل کرنا میرا کام تھا۔ میں نے چھرا ہرن کی پسلیوں سے نکال کر اُس کی مانند اُس کے دوسرے ہاتھ پر نہیں مارا۔ خواخواہ اُس کے سامنے بے عزتی ہوتی۔ گوشت ہی کٹ جاتا تو دوسری بات تھی۔ ہڈی کیسے کاٹی جاسکتی تھی؟ میں نے ہرن کے گوشت کو ہڈی تک کاٹ لیا اور پھر چھرے کو اس جگہ سے گزارنے لگا جہاں جوڑ ہوتا ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ اس میں مجھے دقت نہیں ہوئی۔ اپنے حصے کا بازو لے کر میں اُس کے نزدیک ہی بیٹھ گیا اور ہم دونوں پیٹ بھرنے لگے۔ اُس کے انداز میں بڑی وحشت تھی۔ ایک ران کھانے کے بعد اُس نے دوسری ران اُسی انداز میں اٹھائی اور اُسے بھی چٹ کر گئی جبکہ میرے لئے ایک بازو کھانا بھی مشکل ہو گیا تھا۔

شکم سیر ہونے کے بعد وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ اُس کے انداز سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ اب وہ یہاں سے آگے کا سفر کرنا چاہتی ہے۔ میں نے ایک بار پھر اُس سے دست بستہ عرض کیا کہ میں ایک غریب انسان ہوں اور اُس کی ان عنایتوں کا صلہ نہیں دے سکتا۔ چنانچہ مجھے

واپس جانے دیا جائے۔ اُس کے منہ سے اب بھی کچھ نہیں نکلا تھا۔

میں نے دانت پیستے ہوئے کہا۔ ”محترمہ! اگر آپ میری زبان نہیں سمجھتیں تو اپنی ہی زبان میں کچھ بکواس فرمائیے.....“

اُس نے کینوس کا تھیلا اٹھا کر کندھوں پر باندھا اور سیدھی کھڑی ہو گئی۔ پھر اُس نے اُنکی سے مجھے گھوڑے کی طرف اشارہ کیا۔ مقصد یہ تھا کہ میں اپنا گھوڑا بھی لے آؤں۔ میں نے نہ چاہتے ہوئے بھی اپنا گھوڑا سنبھال لیا اور پھر ہمارا سفر شروع ہو گیا..... گھوڑے کی پشت پر وہ اس طرح جمی ہوئی تھی جیسے ساری زندگی، گھوڑے کی سواری میں ہی گزار دی ہو۔ دو پہر کو وہی گوشت کھایا گیا جو صبح کو بھونا گیا تھا۔ لیکن یہاں اُس نے باقی ماندہ گوشت محفوظ کرنے کی بجائے ایک طرف پھینک دیا۔ میں نے پر اضطراب نگاہوں سے اُس کی یہ حرکت دیکھی۔ لیکن اُس کے انداز میں اعتماد تھا جیسے اس کے بعد اُسے تازہ گوشت کے مل جانے کا یقین تھا۔

دو پہر کا سورج ڈھل گیا۔ گرمی نے پورا بدن پسینہ پسینہ کر دیا تھا۔ تیز ہوا چل رہی تھی۔ لیکن انتہائی گرم تھی۔ اور جسم کے کھلے ہوئے حصے بری طرح جھلس کر رہ گئے تھے۔ واقعی پورا بدن شدید تھکن کا شکار تھا۔ لیکن میری نگاہ جب بھی اپنے گھوڑے کے ساتھ ساتھ دوڑنے والے دوسرے گھوڑے کی سوار پر پڑتی، میں دل ہی دل میں اُس کی قوت برداشت کا معترف ہوئے بغیر نہ رہتا۔ اُس کے چہرے پر تھکن کی ایک شکن بھی نہیں تھی۔ وہ بڑے اطمینان سے چاروں طرف کے مناظر دیکھتی آگے بڑھ رہی تھی۔ ایک لمحے کے لئے تھوڑی سی جھلاہٹ بھی محسوس ہوئی۔ اس گونگی ہمسفر کا کیا، کیا جائے؟ کاش! وہ بولنا جانتی تو کم از کم زبان کو زنگ نہ لگتا۔ بہت سے عقدے حل ہو جاتے۔ میں نے دانت پیس کر دوسرے گھوڑے کی طرف دیکھا اور اس وقت وہ بھی میری جانب متوجہ ہو گئی۔ کمبخت کے چہرے پر نگاہ پڑتی تو ایک لمحے کے لئے ذہن بھٹک جاتا۔ بڑی ساحرانہ قوت تھی اُس کی نگاہوں اور مسکراہٹ میں۔ آدمی اس میں کھو کر رہ جاتا تھا۔ رائمیس کی صحبت اور جدید ترین ملکوں کی حسیناؤں نے میرا اخلاق بگاڑ دیا تھا۔ لیکن اس کے باوجود ذہن میں وہ تمام چیزیں پیدا نہ ہو سکی تھیں جو بے حیائی کی حدود میں داخل ہو جاتی ہیں۔ میں کسی کی پسندیدگی کے باوجود بے لگام نہیں ہو سکتا تھا۔ چنانچہ اس وقت بھی اُس کا چہرہ دیکھ کر غصے کے تاثرات تو ذہن

سے نکل گئے تھے۔ لیکن اس سے زیادہ کچھ نہ ہو سکا۔

شام گہری ہو گئی۔ ایک جگہ قیام کے لئے منتخب کر لی گئی۔ صحرائے اعظم کے بارے میں ظاہر ہے اس سے زیادہ معلومات کس کو ہو سکتی تھیں؟ جس جگہ اُس نے قیام کیا تھا وہاں جنگلات تو نہ تھے۔ لیکن نہ ہونے کے برابر البتہ جانور یہاں بھی بھٹک رہے تھے۔ میں نے گھاس کا ایک قطعہ منتخب کیا اور وہاں لمبا لمبا لیٹ گیا۔ بدن کے ساتھ ساتھ سر بھی چکرا رہا تھا۔ کافی دیر اسی طرح گزر گئی۔ ذہن کو کچھ سکون محسوس ہوا تو میں نے کہنیوں کے بل ٹک کر اُس کی تلاش میں نگاہیں دوڑائیں اور اُسے دبے قدموں ایک جانب بڑھتے ہوئے دیکھا۔ ایک اور منظر میری نگاہوں کے سامنے آ گیا۔ مڑی ہوئی ایک لکڑی جیسا ایک ٹکڑا اُس کے ہاتھ میں تھا جو سنسناتا ہوا اُس کے ہاتھ سے نکلا اور سامنے دوڑنے والے ہرن کے ایک بچے کی ٹانگوں میں لگا۔ وہ بری طرح اُچھل کر نیچے گرا جبکہ لکڑی کا وہ ٹکڑا واپس اُس کے ہاتھ میں آ گیا تھا۔ میرے ذہن نے فوراً ہی نعرہ لگایا ”بومرینگ“ آسٹریلیا کے قدیم باشندوں کا قدیم ترین ہتھیار جسے وہ ہر چیز میں استعمال کیا کرتے تھے۔ یقینی طور پر یہ بومرینگ ہی تھا۔ لیکن حیرت کی بات تھی کہ یہ لڑکی افریقی نژاد ہونے کے باوجود بومرینگ کے استعمال سے واقف تھی۔ اچانک ہی اُس کے خدوخال میں مجھے آسٹریلیا کے باشندوں کی جھلک نظر آنے لگی۔ لیکن ایک آسٹریلیوی حسینہ صحرائے اعظم میں..... میں سوچتا رہا۔ اب مجھے اس میں کوئی شک نہیں رہا تھا کہ لیشی کے گھوڑے کو جس چیز نے ناکارہ کیا تھا، وہ یہی بومرینگ تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ انہی خاتون نے لیشی کا پتا صاف کیا تھا۔ مگر کیوں؟ اگر مجھ پر مہربان ہو گئی تھیں تو ان مہربانیوں کے اظہار کا دوسرا طریقہ بھی ہو سکتا تھا۔ ہرن کے بچے کو اٹھا کر وہ مجھے اپنی طرف آتی ہوئی نظر آئی۔ اب ظاہر تھا کہ مجھے سگھڑ گریلو خواتین کی طرح اس شکار کو بھونسنے کا انتظام کرنا تھا۔ ذمہ داری ایک بار قبول کر لی تھی تو اب اُسے نبھانا ہی چاہئے تھا تاکہ تعاون کا اظہار ہوتا رہے اور یہ ہولناک حسینہ مجھ سے بدظن نہ ہونے پائے۔ چنانچہ میں نے اور اُس نے وہی کچھ کیا جو صبح کر چکے تھے۔ شکم سیر ہونے کے بعد بدن پر عجیب سی تھکن سوار ہو گئی اور میں دہیں لیٹ گیا۔ پھر جانے کب آنکھ لگ گئی.....

میرے پورے بدن میں چیونٹیاں تیرنے لگی تھیں اور یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے آسمان پر چاند کی بجائے سورج دوبارہ نکل آیا ہو۔

میری آنکھوں میں جلن پیدا ہونے لگی۔ میں نے اُس کے چہرے کو غور سے دیکھنے کی کوشش کی۔ لیکن اُس پر نگاہیں ہی نہ ٹک پا رہی تھیں۔ پھر اچانک یہ احساس ہوا کہ جس طرح میں اُسے دیکھ سکتا ہوں، اُسی طرح وہ بھی مجھے دیکھ سکتی ہے اور جانے کیوں مشرق میرے ذہن میں آرچا۔ میں نے فوراً کنارے کی جانب تیرنا شروع کر دیا۔ لیکن آفت کی وہ پرکالہ بار بار میرے سامنے آ جاتی جیسے میرا راستہ روکنا چاہتی ہو۔ مگر ساتھ یہ بھی چاہتی ہو کہ جانے والا خود رُکے۔ مگر ان تلوں میں تیل تھا ہی کب؟

کنارے پر آ کر میں ایک درخت کے تنے سے ٹیک لگا کر اُسے دیکھتا رہا۔ اور وہ چاندنی کا ہیولا بنی جھیل گردی کرتی رہی۔ بلاشبہ یہ میری زندگی کا اتنا حسین منظر تھا کہ میں نے کبھی اس کا تصور بھی نہیں کیا تھا۔ پھر مجھے احساس ہوا کہ جو کچھ میں کر رہا ہوں وہ ایک طرح سے جائز نہیں ہے۔ ذہن پر خواہ مخواہ اخلاقیات کے لبادے آپڑے۔ اور میں وہاں سے پلٹ آیا۔ یہ الگ بات تھی کہ دل کو قرار نہ تھا۔ آنکھیں بند کیں تو وہ پوری جھیل سمیت آنکھوں میں اُتر آئی۔ ایک لمحے کے لئے میں نے دل میں سوچا کہ شاید وہ میرے روئے سے بد دل ہو گئی ہو۔ وہ تو اپنے طور پر میرا ساتھ قبول کر چکی تھی۔ لیکن میں نے اُسے قبول نہیں کیا تھا۔

میں نے آنکھیں بند کر لیں اور زمین پر لیٹ گیا۔ تھوڑی دیر بعد مجھے قدموں کی چاپ محسوس ہوئی۔ وہ آگئی تھی..... میں نے آنکھوں میں درز پیدا کر کے اُسے دیکھا اور اُس دن مجھے پتہ چلا کہ بھیگا حسن کتنا دلفریب اور توبہ شکن ہوتا ہے۔ اُس نے میری طرف نہیں دیکھا اور کچھ فاصلے پر جا کر اپنے مخصوص انداز، یعنی گھٹنوں میں سر دے کر بیٹھ گئی۔ میں نے پوری آنکھیں کھول دیں۔ پتہ نہیں اُس کے ذہن میں کیا کیا خیالات گردش کر رہے تھے؟ لیکن میں اپنے خیالات کا اظہار اُس پر قطعی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ ہاں..... جانے کیوں ذہن میں راعمیس کی آواز ابھر رہی تھی۔ وہ مجھے گالیاں دے رہا تھا۔ ہونٹ سکڑ سکڑ کر کوس رہا تھا اور کہہ رہا تھا کہ اس حسین منظر میں، میں گم کیوں نہیں ہو جاتا؟ لیکن راعمیس کی خواہش پوری کرنا میرے لئے سب سے بدترین فعل تھا۔ چنانچہ میں نے کروٹ بدل لی تاکہ وہ

دوبارہ ہوش و حواس کی دنیا میں لوٹا تو رات کا ہی وقت تھا۔ لیکن پورے دنوں کی چاندنی نے پورے جنگل کو منور کر رکھا تھا۔ میں نے گردن موڑ کر دیکھا۔ وہ میرے قریب ہی بے سدھ لیٹی ہوئی تھی۔ کچھ دیر میں اُسے نظروں میں سموتا رہا، پھر اٹھ کر بیٹھ گیا۔ بدن میں عجیب سی چیچپاہٹ تھی۔ پسینے اور گرمی نے بیڑہ غرق کر دیا تھا۔ خیال آیا کہ کاش! پانی ہوتا تو نہا لیتا۔ دماغ میں جانے کیا سمائی کہ ایک طرف چل پڑا۔ درندوں کا خوف دامن گیر تھا۔ لیکن اس وقت معلوم نہیں، اتنی ساری بہادری کہاں سے آگئی اور پھر اُس بہادری کا صلہ بھی مجھے مل گیا۔ میں اچانک ہی ایک جھیل کے کنارے پہنچا تھا جو درختوں نے پوشیدہ کر رکھی تھی۔ کچھ دیر ادھر ادھر کا جائزہ لیتا رہا۔ اور پھر کچھ آزادیاں حاصل کر کے میں نے جھیل میں چھلانگ لگا دی۔

پانی اتنا شفاف تھا کہ چاندنی میں اُس کی تہ تک نظر آتی تھی۔ میں نے غور سے دیکھا۔ لیکن مجھے کوئی آبی جانور نظر نہ آیا۔ میں اطمینان سے نہاتا رہا اور قدرت کی صنایعوں کی داد دیتا رہا۔ پھر ان صنایعوں میں ایک صنای کا اضافہ ہو گیا..... میری نگاہیں اتفاقیہ طور پر ہی اُس طرف اٹھ گئی تھیں۔ ایک لمحے کے لئے تو دل دھک سے رہ گیا۔ یوں محسوس ہوا جیسے کوئی آبی جانور آ گیا ہو۔ لیکن چاندنی میں، میں نے اُسے دیکھا تو میرے پورے بدن میں سنسناہٹ دوڑ گئی۔ میں اُس کی آمد کو محسوس نہیں کر سکا اور نہ ہی مجھے یہ اندازہ ہوا تھا کہ کب وہ پانی میں داخل ہوئی؟ مجھے تو وہ کوئی جل پری ہی لگی تھی۔ میں ساکت ہو کر اُس جل پری کو دیکھنے لگا جو کسی پری کی مانند پانی میں کلیلیں کر رہی تھی۔ اُس کے لمبے سیاہ بال قیامت بنے ہوئے تھے۔ جب بھی وہ کروٹ بدل کر پانی کی تہ میں ترچھی تیرتی، مجھے محسوس ہوتا جیسے کسی نے کمان سے تیر چھوڑا ہو۔ تیرنے کا انداز بھی میرے لئے بالکل اجنبی اور انوکھا تھا۔ وہ میرے اطراف ہی میں چکرار ہی تھی اور میں شدت حیرت سے پاگل ہوا جا رہا تھا۔

سوراخ کر کے انہیں عجیب و غریب شکلیں دے دی تھیں۔ دروازے، غلام گردشیں، چھتیں، مائبان سب کے سب ہوا کی تراش کا کمال پیش کر رہے تھے۔ بہت عجیب اور پراسرار جگہ تھی۔ الگ الگ بنے ہوئے ان کھنڈرات کو دیکھ کر یہ احساس ہوتا تھا کہ غول بیابانی کیا چیز ہوتے ہیں۔

تھوڑی دیر بعد ہم اُن کھنڈرات کے قریب پہنچ گئے۔ آگے جانے کا راستہ اُنہی کھنڈرات کے درمیان سے گزرتا تھا۔ ہم کھنڈرات میں داخل ہو گئے۔ ایک درمیانی دراڑ میں پہنچے تو ایسی عمدہ ٹھنڈک محسوس ہوئی جیسے ایئر کنڈیشنڈ عمارت میں آگئے ہوں۔ اُس نے گھوڑا روک دیا اور میں بھی فوراً ہی گھوڑے کو روک کر نیچے کود پڑا۔ وہ بھی شاید یہاں قیام کرنے پر آمادہ نظر آ رہی تھی۔ چنانچہ دونوں گھوڑوں کو وہیں چھوڑ دیا گیا اور اُن کی لگا میں ایک پتھر سے اُلجھا دی گئیں۔ میں نے ایک صاف و ہموار جگہ دیکھی اور پھر وہیں دراز ہو گیا۔ اُس نے مسکراتی نگاہوں سے مجھے دیکھا۔ انداز ایسا ہی تھا جیسے خود بھی اس آرام سے متفق ہو۔ اور پھر وہ بھی بے سدھ ہو کر ایک طرف لیٹ گئی۔ تقریباً آدھا گھنٹہ ہمیں اسی طرح لیٹے لیٹے گزر گیا۔ پھر وہ اُٹھ کر بیٹھ گئی اور پتھر کے ایک نوک دار ٹکڑے سے پہاڑ کی سل سے کچھ لکیریں کاڑھنے لگی۔ میں نے محسوس کیا کہ ان لکیروں کا کاڑھنا بے مقصد نہیں ہے۔ اُس کے ہاتھ میں کاغذ کا ایک ٹکڑا بھی تھا جسے وہ بار بار دیکھتی جا رہی تھی۔ میں نے اُبتہ سے کھنکارا تو وہ میری جانب متوجہ ہو گئی۔ اُس کی حسین آنکھوں میں ایک لمحے کے لئے پھر چمک لہرائی۔ دوسرے لمحے اُس نے اپنا ہاتھ میری جانب اُٹھایا اور قریب آنے کا اشارہ کرنے لگی۔

”خیریت.....؟“ میں نے بیزاری سے پوچھا۔

اُس نے زور زور سے مجھے قریب آنے کا اشارہ کیا اور میں اُس کے قریب پہنچ گیا۔ پھر اُس نے کاغذ کا ایک نیلے رنگ کا ٹکڑا میرے سامنے کر دیا۔ اُس پر غالباً اوسٹر کلر سے کچھ تصویریں بنائی گئی تھیں۔ لکیریں، نشانات اور ایسی ہی دوسری چیزیں..... کاغذ کا یہ ٹکڑا غالباً اُن کی احتیاط سے رکھا گیا تھا۔

میں نے غور سے اُسے دیکھا۔ اُس کی غالباً مجھے کچھ سمجھانے کی کوشش کر رہی تھی۔ کاغذ کے ٹکڑے پر بنے ہوئے نشانات اور زمین کی لکیروں میں سو فیصد ہم آہنگی تھی۔ انہی میں مجھے

میری نگاہوں کے سامنے نہ رہے۔ کچھ دیر میں یوں ہی لیٹا رہا۔ پھر نیند کی دیوی آنکھوں میں پیوست ہو گئی اور میں گہری نیند سو گیا۔

دوسری صبح وہ پرسکون تھی۔ ناشتہ رات کے بھنے گوشت کا ہی تھا۔ پتہ نہیں کیوں اُس نے نیا شکار کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ میں نے اُسے دیکھا اور رات کا منظر میری نگاہوں کے سامنے آ گیا۔ لیکن میں نے فوراً نگاہیں پھیر لیں۔ وہ بھی اپنے چہرے سے کسی خاص کیفیت کا شکار نظر آ رہی تھی۔ اُس کے انداز میں بیزاری تھی نہ رُٹھا پن۔ جیسے جو کچھ ہوا ہو، وہ اُس کے لئے بالکل تعجب خیز نہ ہو۔ میں نے اگر اُس کی نسوانیت کو قبول نہیں کیا تھا تو اُس نے اس پر ناراضگی کا اظہار بھی نہیں کیا تھا۔

ناشتے سے فارغ ہونے کے بعد اُس نے اپنا تھیلا معمول کے مطابق کندھوں پر باندھا۔ میں جانتا تھا کہ اب گھوڑوں کے سفر کا آغاز ہو جائے گا۔ چنانچہ میں نے بھی تیاریاں کیں اور بالآخر اُس کے گھوڑے پر سوار ہونے کے بعد خود بھی سوار ہو گیا۔

میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اب میں کیا کروں؟ میں نے دل میں یہ فیصلہ ضرور کیا تھا کہ اگر مجھے کسی دوسرے انسان کا وجود نظر آ گیا تو یقینی طور پر ان خاتون کو بھی قسمت پر چھوڑنے کی کوشش کروں گا۔ ظاہر ہے زبان ہی نہیں ہے اس کے پاس جو مجھے یہ پتہ چل سکے کہ آخر وہ کون سے جہنم میں جا رہی ہے؟ اُس دن کا سفر بھی دوسرے دن کے سفر سے مختلف نہیں تھا۔ دوپہر کو ہم ایک پتھر یلے میدان سے گزرے جس میں پیلے رنگ کی باریک باریک ریت کچھی نظر آ رہی تھی۔ اُس کے انتہائی سرے پر ہمیں کچھ کھنڈرات نظر آئے۔

میں حیرت زدہ نگاہوں سے اُن کھنڈرات کو دیکھنے لگا۔ صحرائے اعظم کے اس دور دراز علاقے میں یہ کھنڈرات کیا حیثیت رکھتے تھے؟ یہاں تو اس جدید ترین دور میں بھی باقاعدہ عمارات یا مکانات بنانے کا رواج نہیں تھا۔ میں نے سوالیہ نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھا اور پھر خود ہی برا سامانہ بنا کر دوسری طرف دیکھنے لگا۔ وہ بھلا مجھے ان کھنڈرات کے بارے میں کیا بتا سکتی تھی؟

ہمارا رخ بھی انہی کھنڈرات کی جانب تھا۔ گھوڑوں کو سفر میں کوئی دقت پیش نہیں آ رہی تھی۔ لیکن وہ بھی پسینے میں تر تھے۔ جب کچھ اور آگے بڑھے تو یہ انکشاف ہوا کہ وہ کھنڈرات نہیں بلکہ پہاڑیاں ہیں۔ چھوٹے چھوٹے پہاڑی ٹیلے جن میں ہواؤں نے

وہ کھنڈرات بھی نظر آ رہے تھے جن میں اس وقت ہم موجود تھے۔

لڑکی نے پتھر کے نوکیلے ٹکڑے سے ان کھنڈرات کی طرف اشارہ کیا اور انہیں نوک سے کھٹکھٹانے لگی۔ مقصد یہ تھا کہ کیا کاغذ پر بنے ہوئے نقشے میں یہ کھنڈرات نمایاں نظر نہیں آئے؟ اُس کی نگاہیں سوالیہ انداز میں میری جانب اُٹھی ہوئی تھیں۔ طوعاً و کرہاً میں نے اُس کے اس مشغلے میں دلچسپی لینا شروع کر دی۔ میں نے اُس کی بنائی لکیروں کو دیکھا اور مجھے احساس ہوا کہ جن راستوں سے ہم گزرتے آئے ہیں، ان کی نشاندہی ان لکیروں میں کی گئی ہے۔ میرے دل میں ایک تجسس اور دلچسپی سی جاگ اُٹھی۔ میں نے کاغذ کے اُس ٹکڑے کو ہاتھ میں لیا اور اُسے بغور دیکھنے لگا۔ درمیان سے پھٹا ہوا تھا۔ اُس کی لمبائی بتاتی تھی کہ کم از کم اتنا ہی لمبا ٹکڑا اس میں اور شامل ہو گا۔ لیکن اب وہ آدھا تھا۔ وہ غالباً مجھ سے اپنے بنائے ہوئے نقشے کی تصدیق چاہتی تھی۔ چنانچہ میں نے گردن ہلا کر آہستہ سے کہا۔

”بالکل..... تم نے اس کی نقل بالکل ٹھیک کی ہے۔“ میں اُنکی سے کھنڈرات کے نشانات کو کھٹکھٹانے لگا۔ اُس کی آنکھوں میں اطمینان کے آثار نظر آئے۔ ”باقی آدھا ٹکڑا کہاں ہے؟“ میں نے پوچھا۔ لیکن وہ سپاٹ نگاہوں سے مجھے دیکھتی رہی۔ ”تم اپنے مطلب کی ساری باتیں سمجھ لیتی ہو۔ جو میں کہتا ہوں، وہ تمہاری سمجھ میں نہیں آتا۔“ میں نے جھلائے ہوئے لہجے میں کہا اور کاغذ کا ٹکڑا اُس کی طرف بڑھا دیا۔

اُس نے کاغذ کا ٹکڑا لے کر احتیاط سے تہ کیا اور اُسے اپنے لباس میں رکھ لیا۔ پھر وہ پتھر کا نوکیلا ٹکڑا لے کر کچھ اور لکیروں کا ڈھنسنے لگی جو ان کھنڈرات سے آگے کی تھیں۔ لیکن پھر میں نے اُسے چونکتے ہوئے دیکھا۔ وہ ناگن کی طرح پلٹی اور میری طرف دیکھنے لگی۔ اُس کی آنکھوں میں ایک سوالیہ نشان سا تھا۔ لیکن میں اُس کا سوال نہیں سمجھ سکا تھا۔ پھر اُس نے ہندھے لیٹ کر زمین سے کان لگا دیئے۔ غالباً کوئی نئی افتاد پڑی تھی اُس پر..... میں اُسے دیکھتا رہا۔ زمین پر کان لگانے کی وجہ سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ پھر وہ برق رفتاری سے پلٹی اور اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اُس نے پیروں سے جلدی جلدی وہ نقشہ مٹا دیا۔

میں اُس کی بوکھلاہٹ کی وجہ نہیں سمجھ پایا تھا۔ لیکن باہر سے گھوڑوں کے ہنہانے کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ تب صورت حال کافی حد تک میری سمجھ میں آ گئی۔ اُس نے پھر

سے اپنا تھیلا اٹھایا اور کندھے پر لادنے لگی۔ یوں لگتا تھا جیسے کسی کی آمد سے خوفزدہ ہو کر یہاں سے بھاگ جانا چاہتی ہو۔ پھر اُس نے میرا ہاتھ پکڑا اور تیزی سے اُس طرف بڑھنے لگی جدھر گھوڑے کھڑے تھے۔ ابھی ہم گھوڑوں کے قریب پہنچے ہی تھے کہ فار کی آواز سنائی دی اور گولی اُس جگہ سے صرف چند گز کے فاصلے پر پتھر کی ایک چٹان سے ٹکرائی جہاں ہم دونوں موجود تھے۔ میرے منہ سے ایک خوفزدہ سی آواز نکل گئی۔ اب دیر کرنا موت کو آواز دینا تھا۔ کوئی آگیا تھا۔ چنانچہ ہم نے گھوڑوں کو دوڑا کر دوسری طرف چھوڑ دیا.....

اب مسلسل گولیاں چلنے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ پہاڑی کھنڈرات کے دوسری جانب کافی دور تک وہی پیلے رنگ کا میدان چلا گیا تھا۔ اور اُس کے بعد نیچدرے نیچدرے درختوں کا سلسلہ نظر آ رہا تھا۔ غالباً لڑکی کی یہی کوشش تھی کہ وہ درختوں میں پہنچ جائے۔ لیکن یہ لوگ کون تھے؟ اور لڑکی اُن سے کیوں خوفزدہ تھی؟ یہ نیا سوال ذہن میں پیدا ہوتا تھا۔ اب تک تو صرف وہی منظر عام پر رہی تھی۔ لیکن اب کچھ اور لوگ بھی اس میں بوٹ ہو گئے تھے۔ اگر اتفاقاً طور پر ہم دونوں کو کسی نے یہاں دیکھ لیا تھا تو پھر گولیاں پلانے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ یہ سوالات صرف میرے ذہن ہی میں پیدا ہوئے تھے۔ اور یقیناً ذہن ہی میں مرجانے والے تھے۔ کیونکہ ان کا جواب مجھے کہاں سے ملتا؟ ویسے بھی یہ سوال و جواب کا وقت نہیں تھا کیونکہ عقب سے جس انداز سے گولیاں برسائی جا رہی تھیں، اُس سے یہ احساس ہوتا تھا کہ بمشکل تمام ان لوگوں نے ہمیں یا کم از کم اُس لڑکی کو پایا ہے۔ اور اب اُس کی جان لے لینا چاہتے ہیں۔ چنانچہ اُس کے ساتھ ساتھ میری زندگی کو بھی خطرہ لاحق تھا اور اس وقت صرف ایک ہی کوشش زیادہ سودمند تھی اور وہ یہ کہ یہاں سے نکل بھاگا جائے۔

کئی گولیاں سنسناتی ہوئی ہمارے آس پاس سے گزر گئیں۔ لڑکی کے گھوڑے نے پانک ہی ایک زوردار ٹھوکر کھائی۔ ایک گولی اُس کی ران میں لگی تھی۔ گھوڑا ہنہنا کر الف اور منہ کے بل زمین پر آ رہا۔ میں نے اپنے گھوڑے کی لگامیں کھینچیں۔ میرا خیال تھا کہ لڑکی گئی کام سے۔ لیکن میں نے حیرت انگیز طور پر اُسے زمین پر چھلانگ لگاتے ہوئے دیکھا۔ وہ ہاتھوں کے بل زمین پر گری اور اُلٹی قلابازیاں کھا کر کھڑی ہو گئی۔ لیکن دوسری قلابازی اُس نے پھر کھائی اور اس کے نتیجے میں، وہ میرے گھوڑے پر پہنچ گئی۔ اُس نے

گھوڑے کی لگا میں اپنے ہاتھوں میں پکڑ لی تھیں اور میرے بازوؤں کے نیچے سے ہاتھ نکال کر گھوڑے کو دوڑا رہی تھی۔ اتنی برق رفتاری کا مظاہرہ بلاشبہ ناقابل یقین تھا۔ لیکن صورت حال اس وقت یہی تھی کہ ایک لمحے کی تاخیر نہ کی جائے.....

ہم نے ایک بار بھی پلٹ کر اُن لوگوں کو نہ دیکھا جو ہم پر گولیاں برس رہے تھے۔ یہ نہیں معلوم تھا کہ وہ کتنے فاصلے پر اور کتنی تعداد میں ہیں..... بالآخر ہم چھدرے درختوں کی آڑ میں آ گئے۔ لیکن یہ درخت ہمارے لئے جائے پناہ نہیں تھے۔ ان میں ہمیں بہت زیادہ تحفظ نہیں مل سکتا تھا۔ گھوڑا بدستور دوڑتا جا رہا تھا۔ اب عقب سے گولیاں نہیں برسائی جا رہی تھیں۔ غالباً ہم اُن کی نگاہوں سے اوجھل ہو گئے تھے۔ لیکن لڑکی نے گھوڑے کی رفتار کم نہیں کی۔ کافی فاصلے پر پہنچنے کے بعد جنگل گھنا ہونا شروع ہو گیا۔ لیکن لڑکی پناہ لینے کے موڈ میں نہیں تھی۔ اُس نے بائیں سمت کا رخ کیا۔ حتیٰ کہ ہم ایک ایسے مقام پر جانکلے جو کسی قدر محفوظ محسوس ہوتا تھا۔ یہاں بھی جنگل ہی تھا۔ لیکن درخت ایک دوسرے سے تقریباً جڑے ہوئے تھے۔ جانے یہ صحرائے اعظم کا کون سا حصہ تھا؟ بہر طور! ہم اُن درختوں کے درمیان پہنچ گئے۔ میری حالت کافی خراب ہو گئی تھی۔ چہرہ بری طرح بگڑا ہوا تھا۔ ہم جنگل میں کافی دُور تک اندر آ گئے۔ اور پھر ایک جگہ نسبتاً صاف ستھری نظر آئی جہاں پہنچ کر اُس نے گھوڑا روک لیا اور پھرتی سے نیچے اتر گئی۔ میں نے ایک لمحے کے لئے سوچا کہ گھوڑے کو ایڑ لگا کر اُس لڑکی سے دُور چلا جاؤں۔ لیکن پھر وہی خوف دامن گیر ہو گیا کہ میں اس ہولناک جنگل میں جاؤں گا کہاں؟ چنانچہ میں بھی مجبوراً گھوڑے سے اتر آیا۔ وہ گہری گہری سانسیں لے رہی تھی اور اُس کے کان مسلسل گردش میں تھے، جیسے وہ دُور دُور کی آوازیں سننے کی کوشش کر رہی ہو۔ گھوڑے کو ایک طرف چھوڑ دیا گیا اور ہم لوگ ایک درخت سے ٹیک لگا کر کھڑے ہو گئے۔

”اے خاتون مصیبت جہاں! اب کیا ارادہ ہے؟ کیا ان جنگلوں ہی میں ہماری زندگی بسر ہو جائے گی؟“ میں نے اُس سے پوچھا۔

اُس نے کوئی جواب نہ دیا اور ادھر ادھر دیکھتی رہی۔ پھر اُس نے میرے بازو کو تھپتھپایا اور ایک سمت بڑھ گئی۔ پتہ نہیں کمبخت نے کیا دیکھ لیا تھا؟ وہ تقریباً پندرہ گز تک مجھے اسی طرح ساتھ لئے آئے بڑھتی رہی۔ اب میں نے بھی وہ چٹانیں دیکھ لیں جو عجیب و غریب

تھیں۔ گھاس سے ڈھکی ہوئی دو چٹانیں جن کے نیچے سوراخ نظر آ رہے تھے۔ غالباً یہ ناروں کا کوئی علاقہ تھا۔ ہم ایک غار کے سامنے رُک گئے۔ لڑکی نے ایک لمحے کے لئے ادھر ادھر دیکھا اور پھر اُس نے ایک غار کے دہانے کے قریب پہنچ کر اندر قدم رکھ لیا۔ لیکن دوسرے لمحے ایک وحشت ناک قہقہہ سنائی دیا اور لڑکی چونک کر پیچھے ہٹ گئی۔ میری چیخ نکل گئی تھی۔

اندر سے کوئی ہنستا ہوا نکلا اور میرے شانوں کو چھوتا ہوا ایک لمبی زقند لگا کر سامنے کی سمت بھاگ گیا۔ میں حیرت سے منہ کھولے دیکھتا ہی رہ گیا۔ بھاگتے ہوئے جانور کی پشت نہ دیکھ کر تو یہی احساس ہوتا کہ وہ کوئی انسان تھا۔ جس نے قہقہہ لگایا اور فرار ہو گیا۔ عجیب و غریب جانور تھا۔ کنگرو کی طرح اُچھلتا ہوا بھاگ رہا تھا۔ لیکن اُس کا قہقہہ انسانی قہقہے سے کتنا مشابہ تھا۔ لڑکی نے ایک گہری سانس لی اور اُس کے بعد اُس غار میں داخل ہو گئی۔

چند لمحوں بعد وہ مایوسی سے باہر نکل آئی۔ غار اتنا کشادہ نہیں تھا کہ ہم دونوں اُس میں پناہ لے سکتے۔ تاہم اتنا ضرور تھا کہ ہم اُس میں چھپ کر بیٹھ سکتے تھے۔ لڑکی نے باہر نکل کر چند لمبی لمبی جھاڑیاں کاٹیں اور انہیں غاروں کے دہانے پر اس طرح ڈال دیا کہ وہ اسی کا حصہ معلوم ہوں۔ جگہ کیسی بھی تھی لیکن تھی محفوظ، اور ہمیں اُس میں دشمنوں سے پوشیدہ رہنے میں مدد ملتی۔ گھوڑے کی موجودگی البتہ باعث تشویش تھی اور اس سے یہ خوف تھا کہ وہ لوگ گھوڑے کو دیکھنے کے بعد ہمیں آس پاس ہی تلاش کریں گے۔ میں نے اُس سے کچھ کہنا چاہا لیکن جھنجھلا کر خاموش ہو گیا۔ وہ سمجھتی تو اُس سے کچھ کہتا۔ جو کچھ کرنا تھا، خود ہی آگے بڑھ کر، کر لینا چاہئے تھا۔ لیکن اب اتنی ہمت نہیں ہو رہی تھی کہ باہر نکل کر گھوڑے کے قریب پہنچوں اور اُسے خدا حافظ کہہ دوں۔

کافی دیر گزر گئی۔ اور اس کے بعد غالباً شام جھکنے لگی۔ سورج اپنا سفر طے کر چکا تھا۔ جھلکتی ہوئی شام تیزی سے یہاں کے ماحول پر مسلط ہوتی جا رہی تھی۔ ویسے بھی گھنے جنگل تھے اور سورج یہاں بہت کم، اپنی حشر سامانیوں کا مظاہرہ کر سکتا تھا۔

کچھ دیر بعد چاروں طرف تاریکی پھیل گئی تھی۔ کوئی سرسراہٹ سی ابھری تو میں نے چونک کر گردن باہر نکالی۔ لڑکی نے فوراً ہی مجھے پیچھے کھینچ لیا۔ لیکن اتنی دیر میں، میں باہر کا جائزہ لے چکا تھا۔ کچھ فاصلے پر ایک سیاہ سی چیز نظر آئی جو آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہی تھی۔

ذرا دیر میں اندازہ ہو گیا کہ وہ کوئی انسان ہے۔ اس کا مطلب تھا کہ دشمنوں نے ہماری سمت کا صحیح اندازہ لگالیا تھا اور یہاں تک پہنچ گئے۔

میں دم سادھے بیٹھا رہا۔ قدموں کی آوازیں آہستہ آہستہ آگے بڑھتی ہوئی محسوس ہونیں۔ وہ کئی تھے۔ لیکن ہمیں نظر نہیں آ رہے تھے۔ ہم سانس روکے بیٹھے رہے۔ لڑکی کی طرف سے بھی کوئی آواز نہیں سنائی دے رہی تھی جس سے احساس ہوتا کہ وہ بھی پوری طرح محتاط ہے۔ آہٹیں کچھ دیر تک سرسراتی رہیں اور اس کے بعد خاموشی چھا گئی۔ لڑکی اپنی جگہ سے باہر نکل آئی اور اُس نے میرا کالر پکڑ کر گھسیٹنا شروع کر دیا۔

”اب کیا مصیبت نازل ہو گئی تم پر؟“ میں نے دانت کچکچا کر کہا۔ لیکن اُس نے اتنی زور سے مجھے کھینچا کہ میں گھسٹتا ہوا باہر نکل آیا۔ عجیب مصیبت گلے پڑ گئی تھی۔ میری سمجھ میں کوئی بات نہیں آئی۔ یہ جگہ تو میرے خیال میں کافی محفوظ تھی۔ اُس نے مجھے کھڑا کیا اور اس کے بعد ایک طرف گھسٹنے لگی۔ گویا وہ یہ جگہ چھوڑ دینا چاہتی تھی۔

ابتداء میں تو میری سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ لیکن بعد میں، میں نے جب غور کیا تو میری آنکھیں شدت حیرت سے پھیل گئیں۔ یہ ایک بہترین اقدام تھا۔ وہ لوگ جس راستے پر تلاش کر کے یہاں تک پہنچے تھے، لڑکی اُس راستے پر جا رہی تھی۔ اس سے یہ فائدہ ہو سکتا تھا کہ اب وہ لوگ ہمیں اُس سمت تلاش نہیں کریں گے۔ ممکن ہے وہ ان چٹانوں کو بھی تلاش کر لیں جن کے درمیان سوراخ بنے ہوئے تھے۔ مجھے احساس ہوا تھا کہ لڑکی اتنی بے وقوف نہیں ہے جتنا میں سمجھ رہا تھا۔

ہم دیر تک سفر کرتے رہے۔ پھر ہمیں کوئی آواز سنائی نہیں دی تھی۔ جس راستے پر ہم جا رہے تھے وہاں جنگل زیادہ گھنا اور خوفناک ہوتا چلا گیا تھا۔ بعض جگہ زمین پر دلدل بھی محسوس ہو رہی تھی جو گھاس میں چھپی ہوئی تھی۔ لہذا سفر میں سخت دشواری پیش آ رہی تھی۔ لڑکی ہمیشہ کی طرح اُس وقت بھی کافی پرسکون تھی۔ خاصا فاصلہ طے کرنے کے بعد ایک بار پھر ہم نے ایک جھنڈ میں پناہ لی۔ درختوں کے درمیان قد آدم گھاس اُگی ہوئی تھی۔ میرے کان آہٹوں پر لگے ہوئے تھے اور میں دُور دُور تک کی آوازیں سننے کی کوشش کر رہا تھا۔ لیکن اطراف میں کوئی آواز نہیں تھی۔ لڑکی یہاں کافی دیر رُکی۔ آہستہ آہستہ چاند نکل آیا تھا اور چاندنی درختوں سے چھن چھن کر پہنچ رہی تھی جس سے بعض حصے اچھے خاصے روشن ہو

گئے تھے۔ درخت یہاں بھی گھنے اور آپس میں جڑے ہوئے تھے اور زمین کی حالت بتا رہی تھی کہ وہ انسانی قدموں سے نا آشنا ہے۔

کچھ فاصلے پر ہمیں جانوروں کی خشک ہڈیاں بکھری نظر آ رہی تھیں۔ کئی منٹ یہاں گزارے اور اُس کے بعد پھر یہاں سے آگے بڑھ گئے۔ یہاں تک کہ درختوں کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ تھوڑے ہی فاصلے پر پتھریلا میدان نظر آ رہا تھا۔ لڑکی مقامی جغرافیے سے خوب اچھی طرح واقف تھی۔ اور ایسے راستوں پر جا رہی تھی جو مشکل نہیں تھے۔ یہاں تک کہ آہستہ آہستہ رات ختم ہو گئی.....

ہم تھوڑی دیر رُک جاتے اور اُس کے بعد پھر سفر کرنے لگتے۔ غالباً لڑکی راتوں رات، اُن لوگوں سے اتنی دُور نکل جانا چاہتی تھی کہ دن کی روشنی میں وہ ہمیں تلاش نہ کر سکیں۔ جب سورج نکلا تو ہم ایک ایسے علاقے میں تھے جہاں درخت بہت کم تھے۔ اور چھوٹے چھوٹے ٹیلے بکھرے ہوئے تھے۔ اُن کے درمیان جھاڑیاں بکثرت موجود تھیں۔ ٹیلے بالکل سناں اور خاموش تھے۔ اطراف میں جانور وغیرہ بھی نظر نہیں آ رہے تھے۔ میں نے سوچا کہ لڑکی یہاں دھوکہ کھا گئی۔ اگر غذا کا مسئلہ پیش آ گیا تو کیا ہوگا؟ یہاں تو اُس کے شکار کرنے کے لئے جانور بھی نہیں تھے۔ دوسرے ہی لمحے مجھے ایک دم احساس ہوا کہ بلاشبہ یہاں ہمارے شکار کرنے کے لئے جانور نہیں تھے لیکن ہمارے شکاری موجود تھے.....

ایک ٹیلے کے عقب سے پانچ چھ افراد نمودار ہوئے۔ اُن کے ہاتھوں میں رائفلیں دبی ہوئی تھیں۔ اُن کے چہروں پر ایسے تاثرات نظر آ رہے تھے جیسے وہ چھپے ہوئے ہمارا انتظار کر رہے ہوں۔ اُن کی آن میں وہ ہمارے چاروں طرف بکھر گئے۔ لڑکی پینترے بدل رہی تھی۔ اُس کی نگاہیں اُن لوگوں پر جمی ہوئی تھیں۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے اُس نے اُن سے بار نہ مانی ہو۔ وہ چیختے دھاڑتے ہوئے ہماری جانب لپکے۔ اور اُن کا انداز ایسا ہی تھا جیسے ہمیں دانتوں سے چیر کر رکھ دیں گے۔ میں تو آسانی سے اُن کی گرفت میں آ گیا۔ لیکن لڑکی اچانک ہی زمین پر ہاتھ رکھ کر اُچھلی اور اُس کی دونوں ٹانگیں دو افراد کے منہ پر پڑیں۔ اُن کے حلق سے بے اختیار چیخیں نکل گئیں۔ لڑکی نے چھلانگ لگائی اور اتنی برق رفتاری سے ایک ٹیلے پر چڑھی کہ یقین نہیں آتا تھا۔

میں دو آدمیوں کی گرفت میں تھا لیکن میری آنکھیں لڑکی کو دیکھ رہی تھیں۔ اُن کی آن

میں وہ ٹیلے کی بلندی پر نظر آئی اور اُس کے بعد دوسری طرف کود گئی۔

”لینا.....“ اُن میں سے ایک دھاڑا اور پھر سب اُس طرف دوڑ پڑے۔ جو مجھے پکڑے ہوئے تھے، وہ بھی مجھے گھسیٹتے ہوئے اُسی جانب جا رہے تھے۔ میں نے بلندی پر پہنچ کر دیکھا۔ لڑکی ٹیلوں کے دامن میں بھاگ رہی تھی۔ دو افراد پوری قوت سے اُس کے پیچھے دوڑ پڑے اور لڑکی سے اُن کا فاصلہ کم ہونے لگا۔ لیکن وہ چھلاوا بنی ہوئی تھی۔

تقریباً دو سو گز کے فاصلے پر جا کر وہ رُکی اور ہماری طرف ہاتھ ہلایا۔ انداز ایسا ہی تھا جیسے الوداع کہہ رہی ہو۔ ایک بار پھر اُس نے آگے چھلانگ لگا دی۔ اُس کے نزدیک ترین پہنچ جانے والے دونوں افراد دوبارہ اُس کے پیچھے دوڑ پڑے۔ لیکن وہ دس پندرہ گز ہی گئے ہوں گے کہ اُن کے قدم ٹھک گئے اور پھر میں نے اُن کے چہروں پر دہشت نمایاں دیکھی۔

وہ اچانک ہی دونوں ہاتھ بلند کر کے کھڑے ہو گئے اور پھر زور زور سے چیخنے لگے۔ میرے ساتھ موجود افراد حیران رہ گئے۔ اُن دونوں نے بے اختیار مجھے چھوڑ دیا جو مجھے پکڑے ہوئے تھے۔ میں بھی حیرت سے اُن چیخنے والوں کو دیکھ رہا تھا۔ جب کہ لڑکی دوڑتی ہوئی کافی دُور نکل گئی تھی۔ اگر پیچھے والے افراد چاہتے تو اُسے رائفلوں کا نشانہ بنا سکتے تھے۔ لیکن وہ ابھی ان چیخنے والوں کی طرف متوجہ تھے جو اپنی جگہ کھڑے چیخ رہے تھے۔

پھر میں نے ایک اور دہشت ناک منظر دیکھا۔ چیخنے والوں کے قد آہستہ آہستہ چھوٹے ہونے لگے..... فوراً ہی صورت حال سمجھ میں آ گئی۔ جس جگہ وہ کھڑے تھے، وہاں دلدل تھی۔ اور وہ دلدل میں بیس گز دُور نکل گئے تھے۔ اب اُن کے قدم دلدل میں دھنسے جا رہے تھے.....

خوف و دہشت سے میرے بدن میں چیونٹیاں ریگنے لگیں۔ میں اُن لوگوں کے چھوٹے ہوتے ہوئے قد دیکھ رہا تھا۔ وہ چیخ چیخ کر مدد کے لئے اپنے ساتھیوں کو پکار رہے تھے اور کنارے پر کھڑے آدمی بری طرح ناچ رہے تھے۔ اُن کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اپنے ساتھیوں کی کس طرح مدد کریں۔

دلدل میں ڈوبنے والوں سے بہت آگے، کافی آگے وہ چھلاوا لڑکی دوڑی چلی جا رہی تھی۔ یہ بات ناقابل یقین تھی کہ اُس کے پاؤں ایک لمحے کے لئے بھی دلدل پر نہیں ٹک

رہے تھے۔ بس! یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اُس کے پاؤں دلدل کو چھوتے ہیں اور اُس کے بعد وہ آگے چھلانگ لگا دیتی ہے۔ بالآخر دلدل علاقہ ختم ہو گیا۔

میں اگر چاہتا تو اُن کی غفلت سے فائدہ اُٹھا کر یہاں سے فرار ہو سکتا تھا۔ لیکن میں نے بھی مصلحت کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا۔ لڑکی تو نکل ہی گئی تھی۔ اب اگر میں یہاں سے بھاگ جاتا تو بلاوجہ اُن لوگوں کا مجرم قرار پاتا اور پھر بھاگ کر جاتا بھی کہاں؟ تھوڑے بہت فاصلے کے بعد وہ مجھے دوبارہ پکڑ لیتے۔

میں نے چیخ کر کہا۔ ”تمہارے پاس رسہ نہیں ہے؟ اگر ہو سکے تو رسے کا انتظام کرو۔ ابھی ان لوگوں کے دلدل میں غرق ہونے میں دیر ہے۔“

میری بات غالباً اُن کی سمجھ میں آ گئی۔ اُن میں سے ایک آدمی نے برق رفتاری سے چھلانگ لگا دی اور ایک جانب دوڑ گیا۔ ایک ڈیڑھ منٹ میں وہ واپس بھی آ گیا۔ اُس کے ہاتھ میں نائیلون کا ایک رسہ تھا جسے اُس نے راستے ہی میں کھول لیا تھا اور اب اُسے بکھراتا چلا آ رہا تھا۔

”مجھے دو.....“ میں نے کہا اور اُن کے ہاتھ سے رسہ لینے کی کوشش کی۔ لیکن جو شخص میری نگرانی کر رہا تھا اُس نے مجھے دھکا دے کر پیچھے ہٹایا اور رائفل کی نال میرے سینے سے لگا دی۔ باقی لوگ اپنے ساتھیوں کی مدد میں مصروف ہو گئے۔ رسہ گھما کر پھینکا جاتا لیکن ہوا کے باعث ہر بار وہ اُن سے کچھ فاصلے پر چلا جاتا۔

”کیا تم ان لوگوں کو موت کے حوالے کرنے پر تیار ہو بیوقوف لوگو! رسہ مجھے دو۔“

اس بار پتہ نہیں کیوں اُن میں کچھ نرمی پیدا ہو گئی۔ ایک نے رسہ میری جانب بڑھا دیا۔ میں نے اپنے سامنے کھڑے شخص سے رائفل چھین لی۔ باقی دونوں نے چونک کر مجھے دیکھا اور رائفلیں میری جانب سیدھی کر لیں۔ لیکن میں نے اُن پر توجہ دینے کی بجائے جلدی سے رسے کا سرا رائفل میں مضبوطی سے باندھا اور رائفل کی نالی پکڑ کر پوری قوت سے گھمانے لگا۔ جب میرا مقصد پورا ہو گیا تو میں نے رائفل پوری قوت سے ڈوبنے والوں کی جانب اُچھال دی۔ وہ اُن کے قریب جا گری۔ انہوں نے پھرتی سے رسہ پکڑ کر اپنے بدن کے گرد کس لیا۔ میری اس کوشش سے رائفل بردار غالباً مطمئن ہو گئے تھے۔

اب رسے کی مدد سے انہیں کھینچا جانے لگا۔ میں خود بھی اُن کے ساتھ مصروف ہو گیا۔

گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔
 ”کیا تم اُس کے ساتھ نہیں تھے؟“
 ”تھا.....“

”اور رات کو جب تمہیں تلاش کیا جا رہا تھا، اُس وقت کیا تم نے اُسے تحفظ نہیں دیا؟“
 ”دوستو! میرے بارے میں سنو گے تو حیران رہ جاؤ گے۔ اگر میں تم سے یہ کہوں کہ میں نے اُسے تحفظ نہیں دیا بلکہ وہ مسلسل مجھے اپنا قیدی بنائے ہوئے تھی تو کیا تم اس بات پر یقین کرو گے؟“

”ہاں..... اُس شیطان کی خالہ کی ہر بات پر یقین کیا جاسکتا ہے۔ خدا کی پناہ! انسان تو کہا ہی نہیں جاسکتا اُسے۔ کیا شے ہے..... کس کس طرح اُس نے ہم لوگوں کو ڈاج دیا ہے۔ کیا خیال ہے تمہارا پارکر؟ کیا چل برادرز اس سلسلے میں ہمیں معاف کر دیں گے؟“
 ”یہ سوچنا ہی چھوڑ دو۔ جو کچھ ہوگا، سامنے آ جائے گا۔“ دوسرے نے برا سامنہ بنا کر کہا۔

”میں تو اب بھی سوچتا ہوں تو ششدر رہ جاتا ہوں۔ دلدل پر دوڑنے کا یہ فن کیا بالکل اجنبی نہیں تھا؟“

”اُس کمبخت نے اُسے وہ چھلاوہ بنا دیا تھا اور یقینی طور پر اُس نے اُس کے ساتھ کچھ اس قسم کی کارروائیاں کی ہوں گی کہ وہ مافوق الفطرت بن گئی ہے۔“
 میں یہ باتیں سن رہا تھا۔ لیکن ابھی میں اُن سے کوئی سوال کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھا، تاوقتیکہ وہ مجھ پر مکمل طور پر اعتبار نہ کر لیں۔ دوسرے آدمی نے جس کا نام پارکر لیا گیا تھا، مجھ سے پوچھا۔ ”کیا تم اُس کے قبضے سے فرار کی فکر میں تھے؟“

”یہ بات بھی نہیں تھی۔ دراصل میری مجبوری مجھے اُس کے ساتھ لگائے پھر رہی تھی۔ میں صحرائے اعظم سے بالکل ناواقف ہوں۔ پھر اُس کے قبضے میں پہنچنے کے بعد سے اب تک اس کوشش میں مصروف رہا کہ یا تو کوئی بستی نظر آ جائے یا چند افراد تاکہ میں اُس سے جان چھڑا کر اُن کا سہارا لے سکوں۔ تنہا ان ویرانوں میں بھٹکنے کی ہمت نہیں تھی۔ میں ان علاقوں سے بالکل ناواقف ہوں۔“

اُسی وقت باقی چاروں میں سے ایک شخص ہمارے قریب آ گیا۔ ”پارکر! واپس چلو!

دلدل سے اُن دونوں کے بدن اکھڑنے لگے۔ یہاں تک کہ وہ دلدل میں ایک لمبی لکیر بناتے ہوئے دُور تک آ گئے۔ ہم لوگ بری طرح پسینہ پسینہ ہو گئے لیکن انہیں بچانے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ وہ دلدل سے نکلے تو میں بھاگ کر اُن تک پہنچا۔

”پانی ہے؟“ میں نے سوال کیا اور ایک شخص نے حیرت زدہ انداز میں پانی کی چھاگل میری طرف بڑھا دی۔ میں نے دونوں کو پانی پلایا اور اُن کے شانوں پر تھکلیاں دینے لگا۔ بدبودار دلدل سے اُن کے بدن لتھڑ گئے تھے۔ انہیں صاف کرنا اتنا آسان نہیں تھا۔ تاہم میں کوشش کرنے لگا کہ اُن کے لتھڑے ہوئے بدن صاف کر دوں۔ وہ سب متحیرانہ نگاہوں سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔ میں تو اُن کے دشمنوں میں سے تھا۔ وہ لوگ مجھے گرفتار کرنے کی کوششوں میں رات بھر مصروف رہے تھے اور میں اُن کے ساتھ یہ دوستانہ سلوک کر رہا تھا۔ لیکن میں نے اپنی دانست میں بہت بڑا تیر مار لیا تھا۔ کافی دیر تک میں اُن لوگوں پر مصروف رہا اور آخر کار انہیں اس گندگی سے نجات دلانے میں کامیاب ہو گیا۔

میں نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کہا۔ ”یہاں کوئی تالاب وغیرہ نہیں ہے؟“
 ”آؤ.....“ اُن میں سے ایک نے کہا اور اپنے دونوں ساتھیوں کو سہارا دے کر وہ اُس طرف چل پڑے جدھر سے میں نے انہیں برآمد ہوتے دیکھا تھا۔ میں خود بخود اُن کے ساتھ جا رہا تھا اور اُن سے زیادہ تیز رفتاری کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ تب میں نے کافی فاصلے پر ٹیلوں کی آڑ میں دو گاڑیاں کھڑی دیکھیں۔ یہ لینڈ روورز تھیں۔ گاڑیوں میں کافی سامان موجود تھا۔ آس پاس اور کوئی شخص نہیں تھا۔ غالباً یہی چھ افراد یہاں موجود تھے۔

میں گاڑیوں کے قریب پہنچ کر زمین پر بیٹھ گیا۔ وہ لوگ اپنے ساتھیوں کے لئے لباس کا بندوبست کرنے لگے۔ دو آدمی مسلسل مجھ پر نگاہ رکھے ہوئے تھے۔ لیکن مجھے اب کسی چیز کی پرواہ نہیں تھی۔ چند لمحوں بعد ایک شخص نے ایک پیالی میں مجھے کافی پیش کی۔ کافی کی سوندھی سوندھی خوشبو میری ناک سے ٹکرائی تو میں نے جلدی سے پیالی تھام کر چھوٹے چھوٹے گھونٹ لینے شروع کر دیئے۔ میرے نگران بھی ہاتھوں میں کافی کے مگ لئے میرے قریب بیٹھ گئے۔

”تم نے ہمیں پاگل کر کے رکھ دیا ہے۔“ ایک نے شکوے کے سے انداز میں کہا۔
 ”میں جانتا ہوں کہ تم یہ بات کیوں سوچ رہے ہو؟“ میں نے کافی کا ایک بڑا سا

اب یہاں رُکنا بے مقصد ہے۔ یہ دلدل دُور تک چلی گئی ہے اور اسے عبور کر کے دوسری جانب جانا بے سود ہے۔ ہمیں فوراً ہی چل برادرز کو اُس کے نکل جانے کی اطلاع دینی چاہئے۔“

دونوں کھڑے ہو گئے۔ کافی کنگ اٹھا کر لینڈ روور کے عقبی حصے میں رکھے گئے اور پھر اُن میں سے ایک نے کہا۔ ”دوست! معاف کرنا۔ تمہارے لئے یہ کارروائی یقیناً تکلیف دہ ہوگی۔ لیکن ہمارے لئے ضروری ہے۔ براہ کرم! اپنے ہاتھ بلند کر لو تا کہ تمہاری تلاشی لے لی جائے۔“

میں نے پورے خلوص سے دونوں ہاتھ اوپر اٹھا دیئے۔ ”میرے پاس کچھ نہیں ہے جو تمہارے لئے تکلیف دہ ہو۔“

تاہم انہوں نے میری تلاشی لی اور مجھے بڑے دوستانہ انداز میں لینڈ روور میں بٹھا دیا گیا۔ دلدل سے بچنے والے بھی ساتھ ہی تھے۔ ہم آگے روانہ ہوئے تو اُن میں سے ایک نے کہا۔ ”ہم تمہارا یہ احسان کبھی نہیں بھولیں گے۔ کیا نام ہے تمہارا؟“

”منصور۔“ میں نے جواب دیا اور وہ میرے نام کا تلفظ ادا کرنے لگے۔ جانے کون سے ملک کے باشندے تھے؟ بہت کم لوگ ہی ایسے نظر آئے تھے جو میرا نام صحیح طور پر لے سکے تھے۔ وہ میرا بہت بہت شکریہ ادا کر رہے تھے۔ میں نے اُن سے آہستہ سے کہا۔ ”حالانکہ پچھلی رات اگر آپ لوگ مجھے پالیتے تو یقیناً میرا حشر اُس لڑکی جیسا ہی کیا جاتا۔ لیکن حقیقت یہ تھی کہ میں دل سے اُس کے ساتھ نہیں تھا۔“

پھر راستے میں ہمارے درمیان کوئی گفتگو نہ ہوئی۔ سفر تقریباً ڈیڑھ گھنٹے تک جاری رہا۔ پتھریلی زمین پر اُن کی رفتار کچھ ہلکی ہی تھی۔ ہم ایک ایسے خطے میں پہنچ گئے جہاں درختوں کی بہتات تھی اور زمین پر مخمل جیسے سبزے کا فرش بچھا ہوا تھا۔ تھوڑے فاصلے پر ایک آبشار پہاڑوں کی بلندیوں سے گر رہا تھا اور نیچے ایک ندی بناتا ہوا دُور تک نکل جاتا تھا۔

اسی سبزہ زار پر میں نے سفید خیموں کا ایک گاؤں آباد دیکھا۔ خیموں کی تعداد پچیس یا تیس کے درمیان ہوگی، جنہیں ایک دائرے کی شکل میں لگایا گیا تھا۔ درمیان میں خالی جگہ چھوڑ دی گئی تھی جس کے ایک گوشے میں بڑی نفاست سے فولڈنگ میزیں اور کرسیاں جمائی گئی تھیں۔

مجھے لانے والے خیموں کے درمیان آگئے اور پھر ایک طرف بنے ہوئے خیمے کے ایک دروازے میں مجھے داخل کر دیا گیا۔

”مسٹر منصور!“ میرے ساتھ آنے والوں میں سے ایک نے کہا۔ ”آپ سے درخواست ہے کہ آپ اس وقت تک اس خیمے میں رہیں جب تک آپ سے دوبارہ رابطہ قائم نہ کیا جائے۔ خیمے سے باہر نکلنے کا مطلب یہ ہوگا کہ آپ نے بدعہدی کی۔ اس طرح آپ کو نقصان بھی پہنچ سکتا ہے۔“

میں نے کوئی جواب نہ دیا تو وہ چلے گئے۔ میں اطمینان سے خیمے کا جائزہ لینے لگا۔ وہاں ہر شے موجود تھی، جس کی ضرورت اہم تھی۔ میں نے جوتے اتارے اور منہ ہاتھ دھو کر پلنگ پر دراز ہو گیا اور اُس چھلاوے کے بارے میں سوچنے لگا جو واقعی میری زندگی میں سب سے زیادہ عجیب کردار ثابت ہوا تھا۔ اُس سے جدا ہونے کے بعد احساس ہوا کہ میں دنیا کی حسین ترین شے سے جدا ہو گیا ہوں۔ اُس کا سراپا میری نگاہوں میں تھا۔ خاص طور سے وہ منظر جب وہ چاندنی میں جھیل کے اندر مچھلی کی مانند تیر رہی تھی۔ اُس کے چہرے پر پھیلے ہوئے تاثرات اس بات کے مظہر تھے کہ وہ میری طرف سے کسی پہل کی منتظر ہے۔ لیکن اب اپنی اس کمزوری کو کیا کرتا جو ہمیشہ ہی میرے ساتھ رہی تھی جس کے باعث میں اس بات کا عادی ہو گیا تھا کہ دوسرے ہی میرے سلسلے میں قدم اٹھائیں تو میں آگے بڑھوں، ورنہ اپنی ذات سے میں واقعی کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ لیکن یہ طے تھا کہ اُسے بھولا نہیں جاسکتا تھا۔

رات کو میرے کانوں میں موسیقی کی مدھم آوازیں ابھریں۔ غالباً وائلن بجایا جا رہا تھا۔ اُس کے بعد بنجوبھی سنائی دیا۔ میں حیرانی سے منہ کھول کر رہ گیا۔ اُن لوگوں نے جنگل میں منگل منا ڈالا تھا۔ زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ ایک شخص اندر داخل ہوا۔ اُس نے دو مومی شمعیں خیمے میں رکھ دیں۔

”آپ اگر باہر آنا چاہیں تو آسکتے ہیں۔“ یہ کہہ کر وہ باہر نکل گیا۔ انداز بڑا مہذب اور شریفانہ تھا۔ مجھے بھلا خیمے میں پڑے رہنے کی کیا ضرورت تھی؟ اجازت مل گئی تھی۔ چنانچہ میں باہر نکل آیا۔

باہر کا منظر دیکھ کر میری آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ وہ میزیں جو پہلے ایک گوشے

میں سمٹی ہوئی تھیں اب جگہ جگہ بچھا دی گئی تھیں۔ اُن پر موم بتیاں ایک خاص انداز میں روشن تھیں۔ بہت سی میزوں پر لوگ شراب کے برتن سجائے بیٹھے تھے۔ تھوڑے فاصلے پر ایک کاؤنٹر بنا ہوا تھا جس کے پیچھے چند افراد کام کر رہے تھے۔ بوتلیں ایک طرف نفاست سے ایک ٹرالی میں بچی ہوئی تھیں اس طلسمی منظر میں کھو کر میں اتنا حیران ہوا کہ بیان نہیں کر سکتا۔ میں کچھ دیر تو احمقوں کی طرح ایک طرف کھڑا رہا۔ پھر آہستہ آہستہ چلتا ہوا سب سے قریبی میز پر جا بیٹھا۔ میرے سامنے کسی نے کوئی چیز لا کر نہیں رکھی تھی۔ البتہ میں نے یہ دیکھا کہ جس شخص کو چیز شے کی ضرورت ہوتی وہ اپنے طور پر ہی اٹھا لیتا۔ گویا یہاں سیلف سروس تھی۔ لیکن ظاہر ہے شراب سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں تھی اور فی الحال شراب ہی پی جا رہی تھی۔ چنانچہ میں خاموشی سے بیٹھا اُن لوگوں کو دیکھتا رہا۔

پھر ایک شخص میرے قریب آیا اور کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گیا۔ میں نے چونک کر اُسے دیکھا اور پہچاننے کی کوشش کرنے لگا۔

”میرا نام گروجر ہے۔ اور میں اُن دونوں میں سے ایک ہوں جن کی جان بچانے میں آپ نے انتہائی ذہانت کا ثبوت دیا تھا۔“ اُس نے مسکراتے ہوئے بتایا۔

”اوہ..... مسٹر گروجر! میں آپ کو زندگی کی مبارکباد دیتا ہوں۔“

”شکریہ..... کیا آپ ڈرنک نہیں کرتے؟“

”نہیں.....“ میں نے جواب دیا۔

”آپ کے لئے کچھ اور لاؤں؟“

”کافی مل جائے تو.....“

”ہاں..... کیوں نہیں؟ ہر چیز مل سکتی ہے۔ ایک منٹ۔ میں ابھی حاضر ہوا۔“ گروجر ممنونیت کے جذبات کا شکار تھا۔ تھوڑی دیر بعد وہ اپنے لئے شراب کی بوتل، گلاس اور آئس باکس اور میرے لئے کافی کا ایک کاغذی کپ لے آیا۔

”یہ ماحول آپ کو کیسا لگا؟“ اُس نے نگ مجھے تھماتے ہوئے پوچھا۔

”نا قابل یقین۔“

”جل برادرز دراصل شاہی خاندان کے افراد ہیں اور شہنشاہیت کی خوب کبھی نہیں جاتی۔ خواہ وہ کسی بھی جگہ ہوں۔ میں آپ کو اُن کے بارے میں تفصیلات بتاؤں گا۔ یوں

سمجھ لیجئے! کہ انہوں نے اپنے لئے اس زمین پر ہی جنت بنا ڈالی ہے۔“

”افسوس! میں جل برادرز ہی سے ناواقف ہوں۔“

”آپ ابھی انہیں دیکھ سکیں گے۔ ویسے آپ کے بارے میں انہیں تفصیلات فراہم کر دی گئی ہیں۔“

”گڈ..... لیکن کیا میں یہ معلوم کر سکتا ہوں کہ آپ لوگ صحرائے اعظم میں کیا کر رہے ہیں؟“

”میں آپ کو تھوڑی بہت تفصیلات تو بتا سکتا ہوں۔ لیکن بہتر یہ ہوگا کہ پہلے جل برادرز سے آپ کا تعارف ہو جائے۔ پھر ہمارے درمیان دوستانہ تعلقات میں آسانی ہوگی۔“

میں گہری سانس لے کر خاموش ہو گیا۔ جل برادرز کے سلسلے میں میرے ذہن میں تجسس ضرور جاگ اٹھا تھا۔ لیکن میں خاموشی سے سب کچھ دیکھتا رہا۔ پھر میں نے ایک خیمے سے دو افراد کو برآمد ہوتے دیکھا۔ میزوں کے درمیان پھیلی ہوئی مکھیوں میں بھنبھناہٹ کی آوازیں یک لخت معدوم ہو گئیں۔ میں گہری نگاہوں سے آنے والوں کا جائزہ لے رہا تھا۔ عمر اٹھائیس یا انتیس سال ہوگی۔ دونوں کی شکلیں حیرت انگیز طور پر یکساں تھیں۔ بالوں کا سٹائل، آنکھیں، ناک، چہرہ، حتیٰ کہ لباس بھی بالکل ایک جیسا تھا۔ اُن کے آنے سے ایک تیز خوشبو فضا میں پھیل گئی جو یقیناً کسی اعلیٰ درجے کے سینٹ کی تھی۔ یہ سوال کسی سے کرنا مناسب نہ تھا کہ کیا وہ دونوں جل برادرز ہیں؟ انہیں ایک ہی نگاہ میں دیکھ کر یہ بات کہی جا سکتی تھی۔

دونوں ایک میز پر آ کر بیٹھ گئے اور اُن کے سامنے شراب کے برتن سجادیئے گئے۔ بھنبھناہٹیں پھر جاری ہو گئیں۔ غالباً ان لوگوں کو اجازت تھی کہ تفریح کے اوقات میں، اُن کی موجودگی کی پرواہ نہ کی جائے۔ وہ اپنے طور پر شراب نوشی میں مصروف ہو گئے۔

گروجر میری میز سے اٹھ کر چلا گیا تھا۔ میں خاموش بیٹھا اس ماحول کو دیکھتا رہا۔ دلچسپ بات یہ تھی کہ یہاں اڑکیاں بھی کافی تعداد میں تھیں۔ تقریباً آٹھ یا نو تو میں گن چکا تھا۔ جبکہ مردوں کی تعداد تقریباً پچیس تیس کے درمیان ہوگی۔ واقعی اتنا بڑا گروہ لے کر صحرائے اعظم کے ان ہولناک علاقوں میں داخل ہونا، معمولی بات نہیں تھی۔ اور پھر ظاہر ہے، ساز و سامان کی منتقلی بھی ایک مسئلہ تھی۔ پتہ نہیں اس کے لئے ان لوگوں نے کیا

انتظامات کئے تھے..... کیونکہ بیشتر علاقے ایسے تھے جدھر گاڑیوں کا گزرنا ممکن نہ تھا۔ تاہم اس مسئلے میں سرکھپانے کی مجھے کیا ضرورت تھی؟ مجھ سے زیادہ حیرت انگیز تو ان تمام لوگوں میں سے کوئی نہیں تھا۔ اور یہ بات میں اپنی زبان سے کہہ کر شرمندہ بھی نہیں ہوتا تھا۔

موسیقی کی دھنیں تبدیل ہونے لگیں۔ میزوں کو ایک خاص ترتیب سے سمیٹ لیا گیا اور درمیان میں دائرہ سا بن گیا۔ میں نے موسیقی کی ان بدلتی ہوئی دھنوں کا مطلب بھی سمجھ لیا۔ غالباً رقص کا پروگرام تھا۔ اور ایسا ہی ہوا۔ جوڑے ایک دوسرے کی بانہوں میں بانہیں ڈال کر رقص کرنے لگے۔ بڑی مفاہمت کا ماحول تھا۔ خواتین ہر شخص کی پذیرائی کر رہی تھیں۔ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد پارٹنر بدل جاتے تھے۔ گویا کوئی کسی کی ملکیت نہیں تھا۔ جل برادرز نے واقعی ایک بہترین گروہ آرگنائز کیا تھا اور اس کے لئے جو تیاریاں کی گئی تھیں وہ بھی قابل داد تھیں۔

میری جانب کسی نے توجہ نہیں دی تھی۔ ہاں! اتنا میں جانتا تھا کہ اگر میں اُٹھ کر کسی سے رقص کی درخواست کروں تو اُسے مسترد نہیں کیا جائے گا۔

میری نگاہ ایک بوڑھے شخص پر پڑی۔ وہ بھی کچھ ایسی ہی شخصیت کا مالک تھا کہ ایک نگاہ دیکھ کر اُسے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا تھا۔ چوڑے چکلے بدن کا مالک، براق کی طرح سفید بال، چہرہ جاندار اور جھریوں سے پاک تھا۔ بدن کی ترتیب بتاتی تھی کہ جوانی کے زمانے میں بہت پر مشقت رہا ہے۔ اُس کی چوڑی کلائیوں بھی سفید بالوں سے بھری ہوئی تھیں۔ بوڑھے کے سامنے ایک دُبل پتلی سی لڑکی بیٹھی تھی جس کی آنکھوں میں ہلکے سے حلقے پڑے ہوئے تھے۔ ہونٹ بھی خشک تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے یا تو وہ بیمار ہو یا بہت کمزور۔ اُس نے اپنے سامنے سبز رنگ کے کسی سیال کا گلاس رکھا ہوا تھا جو یقینی طور پر شراب نہیں تھی۔ جبکہ بوڑھے کے سامنے شراب کے برتن سجے ہوئے تھے۔

کافی دیر اسی طرح گزر گئی۔ رقص کے کئی راؤنڈ ہوئے اور اس کے بعد موسیقی کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ پھر کاؤنٹر پر کھانے پینے کی اشیاء سجائی جانے لگیں۔ یہ اشیاء اُڑے میں رکھی جا رہی تھیں۔ اس کا مطلب تھا کہ یہاں بھی سیلف سروس ہوگی۔ بہت سی نفیس چیزیں مجھے کاؤنٹر پر نظر آئیں۔ کھانے پینے کا سلسلہ شروع ہوا۔ ایک ہلکی سی گھنٹی کی آواز اُبھری تھی۔ گویا یہ کھانے کے لئے اجازت کا وقت تھا۔

جل برادرز بھی اپنی جگہ سے اُٹھے اور ایک ایک ٹرے ہاتھوں میں سنبھالے ہوئے اپنی جگہ واپس آ گئے۔ اب میرا بھی خاموش بیٹھے رہنا حماقت ہی تھی۔ چنانچہ میں بھی اپنی جگہ سے اُٹھا اور میں نے ایک ٹرے لا کر اپنے سامنے رکھ لی۔

مجھے اب یہ ماحول پسند آنے لگا تھا۔ جل برادرز کے ساتھ اگر کوئی لمبی شمولیت ہو جائے تو کیا حرج ہے؟ ویسے بھی میں نے اپنا رویہ جس طرح کارکھا ہوا تھا، اس سے امکانات تھے کہ یہاں میری پذیرائی ہوگی۔ اُن کے انداز سے بھی پتہ چلتا تھا کہ جتنے گھنٹے مجھے خیمے میں قید رہنے کی ہدایت کی گئی تھی، اُتنے گھنٹے گزارنے کے بعد اُن لوگوں نے میرے لئے مکمل آزادی فراہم کر دی تھی۔

کھانے پینے سے فراغت حاصل کرنے میں تقریباً ایک گھنٹہ ہی صرف ہو گیا۔ اپنی اپنی ٹرے خود ہی واپس کاؤنٹر پر رکھ دی گئی۔ چند افراد کاموں میں مصروف تھے۔ یہاں ذمہ داریاں شاید تقسیم کر دی گئی تھیں۔ میزوں کی صفائی ہو گئی اور اس کے بعد پھر موسیقی کا سلسلہ جاری ہو گیا۔ ایک شخص میرے پاس پہنچا۔

”مسٹر منصور! جل برادرز سے ملاقات کرنا پسند کریں گے؟“

”کیوں..... کیا وہ مجھ سے ملاقات کے خواہش مند ہیں؟“ میں نے سوال کیا۔

”ہاں!“ اُس نے جواب دیا اور میں اپنی جگہ سے اُٹھ گیا۔ چند لمحوں بعد میں اُن دونوں کے قریب پہنچ گیا۔ دونوں نے انتہائی مہذب انداز میں کھڑے ہو کر مجھ سے مصافحہ کیا اور احترام سے مجھے بیٹھنے کی پیش کش کی۔

”آپ کیا پینا پسند کریں گے مسٹر منصور؟“ اُن میں سے ایک نے کہا۔

”نہیں شکریہ۔ میرا خیال ہے میں اس کی ضرورت محسوس نہیں کر رہا۔“

”گڈ..... آپ کی ہمارے درمیان شمولیت بڑے عجیب و غریب حالات میں ہوئی ہے اور ہم ان حالات کے بارے میں آپ سے گفتگو کرنا چاہیں گے۔ پہلا سوال تو یہ ہے کہ ہمارے پاس پہنچنے کے بعد آپ کو کسی قسم کی کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی؟“

”نہیں۔ بلکہ میں حیرت انگیز طور پر اس ماحول سے لطف اندوز ہو رہا ہوں۔ واقعی! آپ لوگوں نے کمال کر دکھایا ہے۔“

”شکریہ مسٹر منصور! ویسے یہ سوال کیا جاسکتا ہے کہ آپ کا تعلق کہاں سے ہے؟“

”میں ایشیائی باشندہ ہوں۔“

”ہمارا بھی یہی خیال تھا۔ ویسے آپ کا مشغلہ کیا ہے؟“

”سیاحت۔“ میں نے جواب دیا۔

”کہاں کہاں کی سیاحت کر چکے ہیں آپ؟“ اُس نے پوچھا اور میں اُسے تفصیلات بتانے لگا۔ لیکن اپنی کہانی کو میں نے اُن سے پوشیدہ رکھا تھا۔ بس! اتنی ہی تفصیل بتائی تھی کہ میں ایک آوارہ گرد انسان ہوں اور مختلف ممالک کی سیر کرتا رہا ہوں۔ میرے پاس کوئی خاص وسائل نہیں ہیں اور اپنے طور پر مختلف علاقوں میں مختلف طریقوں سے گھومتا پھر رہا ہوں۔ اسی طرح میں صحرائے اعظم افریقہ آگیا تھا۔ لیشی پاور کی دوستی کے بارے میں، میں نے بس اتنا ہی بتایا کہ وہ لڑکی مجھے کہیں ملی تھی اور اس کے بعد جب میں یہاں آیا تو اُس نے میری پذیرائی کی اور مجھے اندرونی علاقے گھمانے کے لئے لے گئی۔ اس کے بعد خود بخود ہی اُس پر اسرار لڑکی کا تذکرہ نکل آیا۔ اُس کے بارے میں، میں نے ایک بات بھی اُن لوگوں سے نہ چھپائی۔ بھلا مجھے کیا ضرورت تھی کہ میں اُن سے یہ تفصیلات چھپاتا۔ جب میں خاموش ہوا تو وہ ساکت نگاہوں سے مجھے دیکھتے رہے۔ پھر اُن میں سے ایک بولا۔

”آپ کافی نفیس انسان معلوم ہوتے ہیں۔ آپ نے ہماری مشکل خود بخود حل کر دی۔ اور لازمی ہے کہ یہ تصور آپ کے ذہن میں ہو گا کہ ہم اُس کے بارے میں آپ سے سوالات کریں گے۔“

”ہاں..... میں جانتا ہوں۔“

”اس کی وجہ؟“ اُن میں سے ایک نے سوال کیا۔

”وجہ صاف ظاہر ہے۔ آپ کے ساتھی اس لڑکی کو قتل کرنا چاہتے تھے۔ انہوں نے اُسے گھیرا لیکن وہ اُن کے قبضے سے صاف نکل گئی۔ ظاہر ہے اگر آپ کو اس سے دلچسپی نہ ہوتی تو آپ میری جانب بھی متوجہ نہ ہوتے۔ مجھ سے یقینی طور پر آپ اُس کے بارے میں سوال کرتے۔ چنانچہ آپ کے سوالات کرنے سے قبل ہی میں نے اپنے اور اُس کے درمیان کی تمام تفصیلات آپ کو بتا دیں۔“

”ہم آپ کے شکر گزار ہیں۔ بلاشبہ انسانوں پر اعتبار کرنا چاہئے اور اُس وقت تک کسی

کے سلسلے میں بے اعتمادی کا شبہ نہیں کرنا چاہئے جب تک کہ اس سے بے اعتمادی کا مظاہرہ نہ ہو جائے۔“

”میں آپ کے اس نظریے سے متفق ہوں۔ ویسے کیا میں انفرادی طور پر آپ لوگوں کا تعارف نہیں حاصل کر سکتا؟“

”ہم ہمیشہ چل برادرز کے نام سے منسوب ہیں۔ آپ ہمارے درمیان نمبروں کی ترتیب بھی نہیں کر سکتے۔ آپ نے محسوس کر لیا ہو گا کہ ہم میں سرموفرک نہیں ہے۔ چنانچہ ہم لوگ اپنے نمبروں کا تعین بھی نہیں کر سکتے۔ آپ ہمیں چل برادرز کہہ سکتے ہیں۔ جب چاہیں ہم میں سے کسی کو دن یا ٹو کہہ لیا جائے۔ حالانکہ یہ یقین کرنا مشکل ہو گا کہ ہم میں دن کون ہے اور ٹو کون؟“

”مجھے اس بات کا اندازہ ہو رہا ہے۔ بہر طور چل برادرز! میں لڑکی کے بارے میں آپ لوگوں سے معلومات حاصل کرنا چاہتا ہوں۔“ میں نے کہا۔

”ضرور! ہمیں اُس کے بارے میں جو کچھ معلوم ہے ہم آپ کو یقینی طور پر بتا دیں گے۔ لیکن اس سے قبل کچھ سوالات ہمارے ذہن میں ابھرتے ہیں۔ ممکن ہے اگر درمیان میں گفتگو کا سلسلہ، رُخ تبدیل کر جائے تو وہ سوالات ہی ذہن سے نکل جائیں۔ اس لئے آپ ہمیں اجازت دیں کہ ہم پہلے وہ سوالات آپ سے کر لیں۔“

”ٹھیک ہے۔ آپ لوگوں کے بہترین رویے کا میں دل سے قائل ہوں۔“

”دراصل ہم آپ کو سو فیصد لڑکی کا ساتھی سمجھتے۔ لیکن ہمارے ساتھیوں نے ہمیں تمام مکمل رپورٹ دے دی ہے اور درحقیقت آپ کا یہ احسان بھی ہے کہ آپ نے ہمارے دو ساتھیوں کی زندگی بچائی اور ہم سے مکمل تعاون کیا۔ اس وقت اگر آپ کسی طرح کے عدم تعاون پر آمادہ ہوتے تو اُن دو افراد کی زندگی بچانا ناممکن تھی۔ آپ یہ بات جانتے ہیں کہ زندگی کتنی قیمتی شے ہوتی ہے۔ زندگی ایک بار ملتی ہے، بار بار نہیں ملتی۔“

”وہ میرا فرض تھا۔ اور ظاہر ہے اُن لوگوں سے میری براہ راست کوئی دشمنی نہیں تھی۔ لڑکی کا مسئلہ بھی چونکہ میرے ذہن میں واضح نہیں تھا۔ اگر مجھے اس کا علم ہو جاتا کہ لڑکی مظلوم ہے اور آپ لوگوں کی وجہ سے اسے نقصان پہنچ سکتا ہے تو پھر شاید میرا رویہ آپ کے ساتھ یہ نہ ہوتا۔ تاہم وہ انفرادی طور پر بھی بہت کچھ تھی۔ اور اُس کے اندر خود اعتمادی کے

سوا کچھ بھی نہیں پایا جاتا تھا۔ بلکہ میں تو اُس کے ساتھ کچھ لمحات گزارنے کے بعد یہ محسوس کر رہا تھا کہ میں تو اُس کا محکوم ہوں اور وہ صرف ازراہ کرم مجھے اپنے ساتھ لئے پھر رہی ہے۔“

جل برادرز نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ خاموشی سے ایک دوسرے کی صورت دیکھتے رہے۔ پھر اُن میں سے ایک نے کہا۔ ”ہمیں براہ کرم! اُس کی شخصیت کے بارے میں مکمل تفصیلات بتائیے۔ پہلی بار جب وہ رقص کے دوران آپ کے سامنے آئی تو اُس کی کیا کیفیت تھی؟“

”وہ قبیلے کی عام لڑکیوں کی طرح ایک رقصہ لگ رہی تھی اور اُس نے اپنا چہرہ رنگا ہوا تھا۔ دوسری بار وہ رات کی تاریکی میں مجھے نظر آئی اور میں حیران رہ گیا۔ اُس وقت اُس کے جذبات برگشتہ تھے۔“

”تیسری بار اُس سے آپ کی ملاقات، اُس وقت ہوئی جب آپ جنگل میں جا پھنسے تھے۔“

”ہاں..... میں اُس کی تفصیلات آپ کو بتا چکا ہوں۔“

”اس کے بعد کیا کیفیت رہی؟“

”کس سلسلے میں؟“

”اس کی ذہنی و جسمانی حرکات کے سلسلے میں۔“

”میں سمجھتا ہوں وہ مجھے خود سے متاثر کرنا چاہتی تھی۔“ میں نے جواب دیا۔

”چلے ٹھیک ہے۔ میرا خیال ہے یہ الفاظ کافی ہیں۔ اچھا! کوئی ایسی خاص بات آپ نے اُس کے ساتھ رہ کر محسوس کی جس پر آپ کو تعجب ہوا ہو؟“

”جن کھنڈرات میں آپ کے آدمی اُس کی تلاش میں پہنچے تھے وہاں میں اور وہ الگ الگ لیٹ گئے تھے۔ تھوڑی دیر تک وہ لیٹی رہی۔ پھر وہ اُٹھی اور پتھر کے ایک نوکیلے ٹکڑے سے زمین پر ایک نقش بنانے لگی۔ اس میں اُن کھنڈرات کی نشاندہی بھی کی گئی تھی جن میں ہم اُس وقت موجود تھے۔ لڑکی کے ہاتھ میں کاغذ کا ایک پھٹا ہوا ٹکڑا تھا جس پر ویسے ہی نفوش بنے ہوئے تھے۔ یعنی جن راستوں سے گزر کر ہم لوگ وہاں تک پہنچے تھے وہی راستے اُس کاغذ کے ٹکڑوں پر بنے ہوئے تھے۔“

اُن کے چہرے پر ایک لمحے کے لئے عجیب سے تاثرات نظر آئے۔ وہ گہری اور جلد دار نگاہوں سے مجھے دیکھ رہے تھے۔ ”پھر کیا ہوا؟“

”بس! جب اُس نے گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز سنی تو جلدی سے نقشہ زمین پر سے مٹا دیا۔“

”کیا آپ کے خیال میں اُس نقشے کے تھوڑے بہت نقش اُس جگہ باقی ہوں گے؟“

”میں نہیں کہہ سکتا۔ ہو سکتا ہے پتھر پر نوکیلے پتھر سے بنائے ہوئے نقش تازہ ہوں۔“

”اوہ..... کاغذ کا وہ ٹکڑا آپ نے دیکھا؟“

”جی ہاں!“

”کیا کیفیت تھی اُس کی؟“ جل برادرز نے پوچھا اور میں انہیں کاغذ کے اُس ٹکڑے

کے بارے میں تفصیلات بتانے لگا۔ جل برادرز مجھے خاموشی سے دیکھتے رہے۔ کافی دیر بعد دونوں نے ہی بیک وقت کہا۔ ”بلاشبہ مسٹر منصور! ہم نے آپ کے ایک ایک لفظ پر یقین کیا ہے۔ ہم سو فیصد اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ آپ نے جو کچھ کہا اس میں ایک لفظ بھی غلط نہ ہوگا۔ ہم آپ کو اور بھی پیش کش کرتے ہیں۔ آپ اگر چاہیں تو افریقہ کی سیاحت میں کچھ عرصہ ہمارے ساتھ رہ سکتے ہیں۔ ہو سکتا ہے آپ کی دلچسپی کے اور بھی سامان پیدا ہو جائیں۔ لیکن اگر آپ یہاں نہ رہنا چاہیں تو ہم آپ کو وہ تمام لوازمات مہیا کر سکتے ہیں جن کے ذریعے آپ واپسی کا سفر طے کریں۔ مثلاً واپسی کے راستوں کے نقشے، گھوڑا اور ایسا سامان جو راستے میں آپ کے کام آسکے۔ لیکن بہتر یہ ہے کہ اس سلسلے میں آپ جلدی نہ کریں۔ چند روز تو ہمارے ساتھ گزاریں۔ اس کے بعد یہ فیصلہ کر لیں کہ آپ کو کہیں جانا ہے یا مزید کچھ عرصہ ہمارے ساتھ گزارنا ہے۔“

میں نے خاموشی سے گردن ہلائی اور اُس کے بعد وہ دونوں اُٹھ گئے۔ اور اُن میں سے ایک نے کہا۔ ”افسوس! آپ نے جو اُس نقشے کے بارے میں بتایا ہے نا، ممکن ہے ہمیں اُس کے کچھ نشانات مل جائیں۔ وہ ہمارے لئے از حد ضروری ہیں۔ نقشہ کیا ہے اور کیسا ہے؟ اس کے بارے میں آپ کو دوسری ملاقات میں تفصیل بتادی جائے گی۔ آپ ان لوگوں کے درمیان پر امن رہیں۔ کسی شخص کو آپ سے کوئی تعرض نہیں ہوگا۔ میں ہدایات دے دوں گا کہ آپ کو ایک معزز ساتھی کی حیثیت سے رکھا جائے۔ یہاں کے تمام اصولوں

سے بھی آگاہ کر دیا جائے گا۔“ انہوں نے مجھ سے ہاتھ ملائے اور ایک جیسی چال چلتے ہوئے وہاں سے ہٹ کر ایک خیمے میں داخل ہو گئے۔

مشاغل جاری تھے۔ قہقہے اُبھر رہے تھے۔ شراب کے دور پھر سے چلنے لگے تھے۔ میں یہ اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا تھا کہ چل برادرز نے اپنے اُن ساتھیوں کے لئے کچھ اصول متعین کئے ہیں اور مجھے اس کا بخوبی اندازہ ہو گیا کہ کھل کھیلنے اور تفریحات کی حد تک تمام چیزیں جائز تھیں۔ غالباً اس سے زیادہ کی اجازت کسی کو نہیں تھی۔ کیونکہ اس طرح رقابتوں کا خدشہ پیدا ہوتا ہے اور رقابتیں حادثے جنم دیتی ہیں۔ یہ شور و غوغا رات کو بارہ بجے تک جاری رہا۔ پھر گھنٹی بجی اور لوگوں نے اپنی اپنی جگہیں چھوڑ دیں۔ میں بھی اُس خیمے کی جانب چلا آیا جس میں اب تک مجھے رکھا گیا تھا۔ اپنے ذہن کو تمام تفکرات سے آزاد کیا اور بے فکری سے سو گیا.....

دوسری صبح میں انسانی آوازیں سن کر ہی جاگا تھا۔ لوگ اپنے اپنے مشاغل میں مصروف تھے۔ مجھے بتایا گیا کہ پانی کا ذخیرہ کہاں ہے۔ چنانچہ میں آبشار سے بہنے والی ندی کے کنارے پہنچ گیا۔ لیکن پانی برف کی طرح سرد تھا۔ غالباً برف پگھل پگھل کر نیچے آرہی تھی۔ ماحول بھی اسی وجہ سے سرد تھا۔ یہ پانی قطعی اس قابل نہیں تھا کہ نہایا جائے۔ فوراً ہی نمونیہ ہو جانے کا خدشہ تھا۔ چنانچہ میں نے صرف پاؤں بھگوئے، چہرہ اور پاؤں دھوئے اور واپس آ گیا۔ کاؤنٹر پر معمول کے مطابق ناشتے کی ٹرے لگا دی گئی تھیں۔ میں نے اپنی ٹرے اٹھائی اور اپنے خیمے میں چلا آیا تھا۔ ناشتہ کرنے کے بعد میں نے سوچا کہ کم از کم کیمپ کے بارے میں مکمل معلومات تو حاصل کروں۔ چنانچہ میں خیموں کی اس چھوٹی سی آبادی سے باہر نکل آیا۔ مجھ پر کوئی پابندی نہیں تھی۔ تمام لوگ اپنے اپنے مشاغل میں مصروف تھے۔ عقبی حصے میں، میں نے درختوں کے ایک جھنڈ کے پیچھے کچھ گاڑیاں کھڑی دیکھیں۔ اُن میں دو بڑے بڑے ٹرک، تین لینڈ روورز اور باقی دوسری چھوٹی گاڑیاں تھیں۔ سب کی سب نئی تھیں۔ ٹرکوں پر کینوس سے ہر قسم کی پردہ داری کر دی گئی تھی۔ ان میں کیا تھا؟ یہ کسی کو معلوم نہیں تھا۔

☆.....☆.....☆

بقیہ واقعات کے لئے جلد چہارم

”ریڈ بون“ کا مطالعہ کریں